فَانْظُرْ اِلٰی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰہِ الآیہ

پس رحمتِ الٰہی کے آثار دیکھو

آثارِ رحمت

جسمیں

حضرت العلّامہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کی کتب ردِّ نصاریٰ کی تالیف، تاریخی مناظرہ اکبرآباد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شرکت، مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ کا قیام اور دیگر علمی، سماجی اور انقلابی کارنامے درج ہیں۔

امداد صابری

ناشر: مولانا عبدالباری صاحب معرفت تاج بکڈپو - پریمیٹ مسجد - مدراس
سولِ ایجنٹ برائے ہندوستان: شمع بکڈپو - آصف علی روڈ - نیو دہلی
سول ایجنٹ برائے پاکستان: زبیر کنجاہی صاحب افقر اکاڈمی چوہڑ ہڑپال راولپنڈی

قیمت :- دس روپے

مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس - دہلی

مسودہ آثار رحمت کی بارگاہِ رسالت میں پیش کش

آثار رحمت وہ بابرکت کتاب ہے جس کے مسودہ پر مسجد نبوی مدینہ منورہ میں بیٹھ کر میں نے نظر ثانی کی اور ۲۹ رشوال المکرم ۱۳۸۵ھ مطابق ۸ رجنوری ۱۹۶۶ء کو بعد نماز ظہر مدینہ منورہ کے وقت کے مطابق دن کے سوا آٹھ بجے آثار رحمت کا مسودہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جالیوں کے سامنے کھڑے ہو کر پیش کیا اور عرض کی کہ اس کتاب کو قبول فرمائیں۔ اس کتاب میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب مغفور کے جو انقلابی و تعلیمی کارنامے درج ہیں۔ ان پر ہر پڑھنے والے کو عمل کرنے کی توفیق نصیب ہو اور میری یہ دعا ہے کہ ان بزرگوں کے یہ حالات ہم سب کے لیۓ سرمایۂ ایمانی ثابت ہوں اور میری مخلصانہ محنت عند اللہ قبول ہو۔ آمین

امداد صابری

میں "آثارِ رحمت" کو

حضرت مولانا آل حسن صاحب موہانی

کے نام معنون کرتا ہوں۔ حضرت مولانا کی جامع شخصیت تھی آپ نے ردِّ نصاریٰ میں ایک مدلل، مبسوط، جامع اور ضخیم کتاب "استفسار" لکھ کر افضلیت کا درجہ حاصل کیا۔ یہ وہ کتاب تھی جس کا آج تک عیسائی دنیا جواب نہیں دے سکی۔ اس کتاب کی وجہ سے انگریزی حکومت نے انتقامی طور پر ان کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ چلایا جو بُری طرح ناکام ہوا۔

اللہ رب العزت ہم کو ان جیسی ہمت و جرأت دے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

امداد صابری
چوڑیوالان، دہلی

حالاتِ زندگی مولانا آل حسن موہانی صاحب

مولانا آل حسن کے والد ماجد مولوی سید غلام سعید خاں تھے جو قصبہ موہان ضلع اناؤ کے رہنے والے تھے۔ آپ منصبدار ہونے کے علاوہ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں تمام عدالتوں کے افسر اعلیٰ بھی رہے تھے جس کی وجہ سے آپ کا قیام لکھنؤ میں ہو گیا تھا۔ آپ کا نواب سعادت علی خاں کے عہد میں عالم جوانی میں انتقال ہوا۔

مولوی غلام سعید خاں کے والد ماجد سید شاہ وجیہہ الدین صاحب تھے۔ آپ کا تمام خاندان شیعہ تھا۔ لیکن شاہ صاحب کا رجحان صوفیہ کی طرف تھا۔ وہ دہلی کے مشہور و معروف ولی سید حسن رسول نما کے مرید ہو گئے تھے اور سنی مسلک اختیار کر لیا تھا۔ محنتی جفاکش اور عبادت گذار ہونے کی وجہ سے حضرت رسول نما نے حضرت شاہ وجیہہ الدین صاحب کو اپنی خلافت کی سند عطا فرمائی۔ آپ تفضیلی عقائد کے حامی تھے۔ چنانچہ آپ نے رسالہ ردِ تبرّیٰ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت پر بھی ایک رسالہ لکھا تھا۔

حضرت مولانا آل حسن کا سلسلۂ نسب حضرت امام علی موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے۔

شجرہ خاندانی یہ ہے :- ؎

مولوی سید آلِ حسن[1] بن مولوی سید غلام سعید خاں بن[2] مولوی سید شاہ وجیہہ الدین محمد بن[3] سید محمد حنیف بن[4] سید غلام علی بن[5] سید عبد الرؤف بن[6] سید جمال بن[7] سید حافظ بن[8] سید سعد اللہ بن[9] سید گدن بن[10] سید الہ داد عرف سید اوہن بن[11] سید منتجب ولایت نژاد بن[12] سید محمود نیشاپوری بن[13] سید محمد بن[14] سید احمد بن[15] سید حسین بن[16] سید ابابکر سید یحییٰ بن[17] سید عبد العزیز بن[18] سید ابراہیم بن[19] سید محمود بن[20] سید زید بن[21] سید عبد اللہ بن[22] سید یعقوب بن[23] سید احمد بن[24] سید محمد بن[25] سید احمد۔ سید محمد نقی بن[26] سید ابوالفضل موسی الرفع بن[27] سید ابوالفضائل امام علی نقی بن[28] حضرت سید ابوجعفر امام محمد تقی سید واسط بن[29] حضرا امام علی موسیٰ رضا بن[30] حضرت امام موسیٰ کاظم بن[31] امام جعفر صادق بن[32] حضرت امام محمد باقر بن[33] حضرت امام زین العابدین علی اوسط بن[34] حضرت سید الشہدا امام حسین رضی اللہ عنہ بن حضرت سیدنا فاطمہ و سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما۔

مولانا آل حسن صاحب کی صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں ہوسکی۔ قیاساً آپ کا سنہ ولادت ۱۲۰۲ھ مطابق ۱۷۸۸ء ہے۔ اپنے والد کے وفات کے وقت آپ کی عمر صرف دس سال کی تھی اور آپ کے چھوٹے بھائی مولوی اوصاف حسن چار سال کی عمر کے تھے۔ آپ کا ایک پروردہ عبد اللہ تھا جس کے پاس گھر کا کل مال واسباب رہتا تھا۔ وہ تمام مال واسباب لے کر چلا گیا۔ اس وقت ایک عالی شان مکان تعمیر ہو رہا تھا عبد اللہ کے مال واسباب لے جانے کی وجہ سے اس مکان کی تعمیر بند ہوگئی تھی۔

لکھنو میں آپ کی تعلیم کا سلسلہ کس طرح شروع ہوا اور کیا تھا اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں لگتا۔ سترہ سال کی عمر میں آپ کی شادی قصبہ کسمنڈی ضلع لکھنو میں ہوئی شادی کے

؎ فرنگیوں کا جال ص ۲۳۹

بعد آپ کا قیام زیادہ گرینڈری میں رہنے لگا تھا۔ اسی زمانے میں آپ نے پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا لڑکپن میں آپ کے سر میں چوٹ لگ گئی تھی جس کی وجہ سے ذہن کند ہوگیا تھا۔ ایک روز عالم رویا میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چوٹ کی جگہ پر اپنا لعاب دہن لگایا جس کے بعد آپ کا ذہن تیز مانند برق ہوگیا۔ کوئی طالب علم آپ سے سبق میں مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نوکری کی تلاش میں الہ آباد پہنچے۔ کسی دفتر میں محرری کی جگہ ملی اس وقت تنخواہ بہت قلیل تھی۔ جب تنخواہ میں اضافہ ہوا تو آپ نے اپنی اہلیہ اور والدہ کو وطن سے الہ آباد بلالیا۔ چھوٹے بھائی کو موہان ہی میں چھوڑا۔ یہاں سے ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔ الہ آباد میں چھوٹی صاحبزادی اور دو صاحبزادے مولوی انوار الحسن صاحب اور مولوی لطف حسن صاحب پیدا ہوئے۔ والدہ کا یہیں انتقال ہوا۔

مولانا صاحب جب سو روپے ماہوار پر عہدہ منصفی پر مامور ہوئے تو آپ کا جہاں آباد نواح فتحپور ہسوہ میں تبادلہ ہوا جہاں آپ کے چھوٹے صاحبزادے مولوی احمد صاحب پیدا ہوئے کئی سال کے بعد جہاں آباد سے قصبہ بندکی میں تبدیل ہوئے تین چار سال تک وہیں منصفی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی زمانہ میں الہ آباد کی صدر عدالت آگرہ میں چلی گئی۔ اس کی وجہ سے مولانا بھی آگرہ پہنچے۔ وہاں بعض احباب جو ہائی کورٹ کے وکیل تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے۔ ان پر رشوت ستانی کے مقدمات دائر ہوئے۔ پولیس یہ سمجھتی تھی کہ مولانا سے ان کی رشوت خوری کا پتہ لگ جائے گا چنانچہ پولیس نے ان سے پوچھ تاچھ کی مولانا کو ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا کیا بتلاتے، انکار کیا۔ اسی کے ساتھ آگرہ کا ایک انگریز حاکم مولانا کے پادریوں سے تحریری مناظرہ کرنے اور پادریوں کے سوالوں اور کتابوں کے جوابات دینے سے جلتا تھا۔ اس نے پولیس کو ورغلایا۔ چنانچہ مولانا بھی اسی الزام میں گرفتار کر لئے گئے۔ دس ماہ بعد مولانا باعزت بری ہوئے۔

اور جہاں آباد پہنچے۔

اس مقدمہ کی مختصر روئیداد اسعد الاخبار آگرہ کے مختلف شماروں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آل حسن صاحب اور ان کے ساتھیوں کی لوگوں کے دلوں میں کتنی عزت تھی۔

۲۶ راگست ۱۸۴۹ء کے اسعد الاخبار میں ان حضرات کی گرفتاری کی خبر شائع ہوئی اس میں ان کے نام درج نہیں کئے گئے تھے

"۱۸ راگست کو محکمہ صدر دیوانی میں ایک واقعہ ملال افزا وقوع میں آیا۔ چھ اشخاص بڑے ذی عزت کہ بعض ان میں سے اپنے عہدہ کی رو سے سررشتہ کے ایک رکن رکین تھے مراد آباد کے کسی مقدمہ میں باشتباہ شہوت ستانی حوالات میں گئے اور کہتے ہیں حکم یہ ہوا کہ تحقیقات کے لئے مراد آباد بھیجے جائیں۔ امید ہے کہ بعد تحقیقات بہ ثبوت بے جرمی کے رہائی پاویں۔"

۹ راپریل ۱۸۵۰ء کے پرچے میں مولانا آل حسن اور ان کے ساتھیوں کی سزایابی کا ذکر ہے

"عمال صدر کا مقدمہ جو مراد آباد میں دائر تھا صاحب سشن جج کے محکمہ میں اس نہج سے فیصل ہوا۔ مولوی غلام جیلانی صاحب وکیل صدر و مولوی غلام امام صاحب پیشکار و منشی سراج الدین صاحب پیشکار کے حق میں چار چار سال کی قید کا حکم ہوا اور منشی محمد قاسم صاحب مسل خواں تین سال، اور مولوی بدر الحسن صاحب مسل خواں اور مولوی آل حسن صاحب منصف دو دو سال۔ اب ان صاحبان کا اپیل صدر میں دائر ہوا اور مسل مقدمہ مراد آباد سے صدر میں طلب ہوئی۔ اللہ اپنے فضل و کرم سے سب صاحبوں کو بری کرے۔"

۷ رمئی ۱۸۵۰ء کے اخبار میں مولانا آل حسن صاحب اور ان کے ساتھیوں کی

رہائی کی خبر درج ہے۔

"عملہ صدر ماخوذہ مراد آباد کا مقدمہ جو صدر نظامت آگرہ میں اپیل ہوا تھا اس میں تین اشخاص کی باتفاق رائے دو حاکم کے رہائی ہوئی۔ وہ تینوں اشخاص یہ ہیں۔ مولوی سید آل حسن صاحب منصف، مولوی غلام امام صاحب شہید پیشکار صدر، منشی محمد قاسم صاحب مسل خواں صدر، اب تین اشخاص مولوی غلام جیلانی صاحب وکیل صدر و منشی سراج الدین صاحب پیشکار و مولوی بدرالحسن صاحب مسل خواں جو باقی رہے بفضلہ تعالیٰ حاکم سوم کی رائے سے یہ بھی رہائی پاویں گے۔"

بقایا تین حضرات مولانا غلام جیلانی وغیرہ کی رہائی کی خبر ۹ رجون ۱۸۵۱ء کے شمارے میں چھپی ہے۔

" الحمد للہ کہ ۲۷ رمئی کو مولوی غلام جیلانی صاحب وکیل، و منشی سراج الدین صاحب پیشکار، و مولوی بدرالحسن صاحب مسل خواں عدالت صدر دیوانی کی رہائی کا حکم عدالت موصوفہ سے جاری ہو کر مراد آباد کو روانہ ہوا۔ اس مژدہ سے شہر کے جمیع خواص و عوام ازبس محظوظ ہوئے۔"

مولانا آل حسن صاحب مقدمہ سے بری ہونے کے بعد جہاں آباد آئے اور منصفی سے مستعفی ہو کر انہوں نے اپنی تینوں لڑکیوں کی شادیاں کیں۔ اس کے بعد بیکاری کے چودہ سال موہان اور کسمنڈی میں گذارے اور سسرال کی کچھ جائداد باغ اور آراضی کی آمدنی سے شکم پُری کی۔ ان دنوں بمبئی کے ایک تاجر شیخ چاند آپ کی مالی مدد کرتے تھے اور چند روز سر سید کے اصرار پر ان کے پاس رہ کر دہلی اور مراد آباد میں بھی آپ نے وکالت کی۔

مولانا آل حسن عیسائی مشنریوں کے غلط پروپیگنڈوں کا بغور مطالعہ کر رہے تھے اور اُن کی لن ترانیاں بھی سن رہے تھے اور ان کے بار بار اس مطالبہ کو کہ " ہمارے اعتراضوں کا جو ہم اسلام پر کر رہے ہیں جواب دو" کو سامنے رکھ کر ۱۲۵۹ھ میں انہوں نے ایک کتاب "ردّ نصاریٰ" میں " استفسار" کے نام سے طبع کرائی۔ یہ کتاب تحقیق و معلومات

دلائل وبرہان کے اعتبار سے کتب ردّ نصاریٰ میں افضلیت کا درجہ رکھتی ہے جو پادری فانڈر کی کتاب میزان الحق مطبوعہ ۱۸۳۳ء اور پادری اسمت کی کتاب 'دین حق' مطبوعہ ۱۸۴۳ء کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مولانا آل حسن صاحب نے عیسائیوں پر جو اعتراضات بشکل استفسار کیے تھے اُن کی تعداد اٹھارہ مادّے ہو حسب ذیل ہیں :۔

(۱) تثلیث کا مسئلہ برہان عقلی سے باطل ثابت ہوتا ہے۔

(۲) تثلیث کے دلائل لایعنی ہیں۔

(۳) حضرت عیسیٰؑ کے ارشادات سے تثلیث غلط اور صرف توحید ثابت ہوتی ہے۔

(۴) حضرت عیسیٰؑ کا بندوں کی نجات کے لئے ملعون ہوکر تین دن دوزخ میں رہنا جیسا کہ عیسائیوں کا ایمان ہے عقلاً باطل ہے۔

(۵) حضرت عیسیٰؑ سے ان کی کتاب میں جو باتیں منسوب کی گئی ہیں وہ خلاف واقع ہیں۔

(۶) توریت میں بعض روایتیں ایسی ملی ہیں کہ اس سے ساری شریعت اسرائیلیہ کا اعتبار ختم ہوجاتا ہے۔

(۷) توریت میں بعض ظاہری احکام کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ہمیشہ کے لئے ہیں۔ حالانکہ حضرت عیسیٰؑ کی شریعت نے وہ حکم بدل دیا۔

(۸) خدا کے کلام میں دوسرے کلام کے ملنے سے کتاب اللہ کا اعتبار ختم ہوجاتا ہے۔

(۹) انبیائے بنی اسرائیل اور حواریوں کی گمراہی اور ایک جماعت علماء مسیحی کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ بائبل میں تبدیلی اور تحریف ہوئی ہے۔

(۱۰) اناجیل کی روایتوں کے اسناد کا پتہ نہیں لگتا اور روایتوں میں اختلافات بھی ہیں۔

(۱۱) اناجیل کی تالیف ایسی ہے جیسے ہمارے ہاں شواہد النبوۃ ہے جو قرآن

کی طرح جمع نہیں ہوئے نہ اس کی روایتوں کی اسناد کا پتہ لگتا ہے۔ روایتوں میں اختلاف بھی ہے۔

(۱۲) توریت کی عزرا نبی کے عہد سے بطلیموس کے عہد تک اور عہد جدید کے حواریوں کے عہد سے قسطنطین کے زمانہ تک کی سندیں کسی عیسائی عالم کے پاس نہیں ہے۔

(۱۳) بائیبل کی پیشین گوئیاں مضحکہ خیز ہیں۔

(۱۴) مسیح اور جھوٹے مسیح اور بڑے معجزے دکھلانے والے میں کیا فرق ہے۔

(۱۵) جس ضابطہ عقلیہ کی رو سے سمعیات کا ثبوت ہوا کرتا ہے اس کے موافق صرف حضرت خاتم النبیین کے معجزات اترتے ہیں اور کسی پیغمبر کے نہیں اترتے۔

(۱۶) باوجود بائیبل کی خرابیوں کے حسب قوت کے ساتھ حضرت خاتم النبیین کی خبر توریت اور انجیل سے ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی خبر توریت سے نہیں ثابت ہوئی۔

(۱۷) جو اعتراضات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لوگ کرتے ہیں وہی اعتراضات حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر بھی عائد ہوتے ہیں۔

(۱۸) جو عزت نبوت کے ساتھ ملت اسلامیہ کے لئے ہے وہ کسی اور ملت کے لئے نہیں[۱]

اس کتاب کے شائع ہونے سے ہندوستان کے پادریوں میں ایک ہلچل مچ گئی تھی جو بڑے سائز کے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ۔ ۔ آج تک عیسائیوں کی طرف سے اس ضخیم و مدلل کتاب کا جواب تو کجا صرف ایک مبحث کا بھی پورے طور پر جواب نہیں دیا جا سکا۔ پادری فانڈر کی حل الاشکال جو ۱۸۴۷ء میں چھوٹے سائز پر ڈیڑھ سو صفحات پر چھپی ہے اس میں استفسار کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے

---

[۱] استفسار ص۸

جو چھدّا اتارنے کے مترادف ہے۔

مولانا آل حسن صاحب کو مناظرہ میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ لیکن آپ کو غصہ بہت جلد آجاتا تھا۔ اس لئے آپ زبانی مناظرہ سے احتراز کرتے تھے۔ اسی بنا پر آپ کا تحریری مناظرہ ۱۸۴۴ء میں پادری فانڈر سے ہوا جو سات ماہ ۲۲ر جولائی ۱۸۴۴ء سے ۴ر فروری ۱۸۴۵ء تک جاری رہا۔ ان مراسلوں کی تعداد گیارہ ہے جو ہر دو جانب سے سوال وجواب میں لکھے گئے تھے۔ اس مناظرہ کی ابتدا پادری فانڈر نے کی اس نے لیدلے کی معرفت مولانا آل حسن صاحب کو حسب ذیل مراسلہ تحریر کیا تھا۔

"بندہ نے سنا ہے کہ جناب مباحثہ دینی کے شائق ہیں اور عقلا کے نزدیک حق جوئی بہترین امور ہے۔ چنانچہ کمترین نے بھی دو ایک رسالہ اظہار حق کے لئے تصنیف کئے ہیں۔ اس میں سے جناب کی خدمت میں میزان الحق اور طریق الحیات کتب روانہ کررہا ہوں۔ آپ ان دونوں کتابوں کے اعتراضات کے جواب دیں۔ بندہ امیدوار ہے کہ جناب میری عرض قبول فرماکر مباحثہ فرمائیں۔ ۲۲ر جولائی ۱۸۴۴ء

مولانا نے اس مراسلہ کا حسب ذیل جواب دیا۔

صاحب والامناقب عالی مناصب زاد عنایتکم

گرامی نامہ آپ کا مع میزان الحق اور مفتاح الاسرار اور طریق الحیات معرفت لیدلے صاحب کے مجھے ملا۔ میں سرفراز ہوا۔ ایک کتاب اردو زبان میں چھپنی شروع ہوئی ہے۔ اس میں میزان الحق کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں جب وہ تیار ہوگی۔ تو غالباً آپ کی نظر سے گذرے گی۔ مجھ سے مباحثہ کرنے کی جو شرطیں ہیں وہ پہلے طے کیجئے۔ میری شرطیں یہ ہیں:

(۱) ہمارے پیغمبر خدا کا نام یا لقب تعظیم سے لینا اگر منظور نہ ہو تو اس طرح لکھئے تمہارے نبی یا مسلمانوں کے نبی اور صیغہ افعال کے باضمائر جو انکے متعلق آویں تو بصیغہ جمع میں

لکھئے جیسا اہل زبان بولتے ہیں۔ ورنہ ہم سے بات چیت نہ کی جائے گی اور نہایت رنج ہوگا۔

(۲) جب پیغمبر یا قرآن یا اسلام کی کوئی بات آپ کے نزدیک غلط ہو تو یوں لکھا کیجئے کہ یہ بات غیرواقعی ہے . . . . . . یا ثابت نہیں ہوتی یا محال نہ یہ کہ جھوٹ اور بیہودہ اور لغو ہے۔ اس لئے ہمارے اہلِ تہذیب اسی طرح گفتگو کیا کرتے ہیں۔

(۳) جب کوئی بات پوچھی جائے تو اس کے جواب کے لئے میعاد مقرر کردی جائے کوئی میعاد ہفتہ سے کم نہ ہو۔

ہمارے پیغمبر خدا کی نسبت تعظیم کے صیغے اردو کے بامحاورہ اگر آپ کہیں گے تو اس سے یہ نہیں سمجھا جاتا ہے یا جائے گا کہ آپ نے اُن کو مان لیا۔

پادری فنڈر نے تھوڑی سی حیل وحجت کے ساتھ ان شرائط کو حسب ذیل الفاظ میں منظور کیا۔

"ہم ازروئے عقل اور ازروئے کلام ربانی یہ جائز سمجھتے ہیں جو اشخاص شریر نہیں۔ ان کو تعظیم سے خطاب کریں لیکن کوئی اپنے آپ کو نبی کہے اور ثابت ہو کہ وہ نبی برحق نہیں تو اس کی تعظیم جائز نہ ہوگی۔ اس لئے محمدؐ کا نام افعال وضمائر جمع کے ساتھ ذکر کرنا ہم سے محال ہے مگر جناب کی خاطرداری کے لئے اور مباحثہ میں کوئی خلل نہ پڑے لحاظاً یہ بات قبول ہے کہ محمدؐ کے تمہارا نبی یا تمہارا پیغمبر اور محمد نبی برحق نہیں کے محل پر تمہارا پیغمبر برحق نہیں محمد نے کہا۔ کے مقام پر تمہارے نبی نے کہا اور جھوٹے نبی کے عوض نبی صادق یا نبی غیر صادق اور قرآن کی بات جھوٹ ہے اسکی جگہ یہ الفاظ خلاف یا خلاف عقل یا خلاف واقعہ یا خلاف توریت وانجیل ہے لکھیں گے کیونکہ ان الفاظ سے آپ کے نبی کی تعظیم لازم نہیں آتی۔ ۳۱ جولائی ۱۸۵۴ء"

مولانا نے اس خط کا جواب ان الفاظ میں لکھا۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ فیصلہ ہر نزع کا اسی طریقہ پر ہوتا ہے۔ جس پر فریقین کا اتفاق ہو۔ لہذا مباحثہ کرنے سے پہلے مجھے آپ سے حسب ذیل چند باتیں دریافت کرنا ضروری ہیں:۔

"محال عقلی یہ کہ نفس الامر پا سکے ہو سکنے کو کبھی کسی طرح عقل تجویز نہ کرے مثلاً وجود لا وجود کہ دونوں کے معًا واقع ہونے کو عقل بلا فکر محال جانتی ہے۔

محال عادی یہ کہ قطعی اسباب کی وجہ اس کا ہونا ممکن و محال ہو۔ مثلاً گھڑی بھر میں لاکھ کوس تک آدمی چلا جاتے یہ محال ہے۔

محال عقلی اور محال عادی بمعانی مذکورہ آپ کے نزدیک بھی کوئی چیز ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو ولیسا لکھئے اگر ہے ایک محال عادی کے نہ ماننے سے محال عقلی کو ماننا پڑے تو عقلاً اس محال عادی کو ماننے کو باطل کہیں گے یا اس محال عقلی کے ماننے کو" ۲ / اگست آل حسن

دو تین خطوں میں توجہ دلانے کے بعد پادری صاحب نے اس سوال کا جواب یہ دیا تھا:

"عقل کو مباحثہ دینی میں صرف یہ دو کام ہیں۔ پہلا یہ کہ عقل اس کتاب کو جسے کلام ربانی کہتے ہیں بدلائل معلوم اور یقین کرے کہ فی الحقیقت خدا کا کلام ہے یا نہیں۔ دوسرا یہ کہ کلام کا مطلب اور مضمون دریافت کرے نہ یہ کہ مضمون کا حاکم بنے اور مضمون کو محال اور باطل کہے بلکہ جو مضمون آیت سے ثابت ہوتا ہے اس کو ماننا چاہیئے خواہ عقل کو محال دکھائی دے خواہ ممکن۔ مباحثہ دینی میں عقل کو اتنا ہی دخل ہے اور عقل حاکم نہیں ہے بلکہ عقل محکوم کتاب ہے۔ ۱۴ / اگست ۱۸۴۲ء کرشیش پادری صاحب کے اس خط کا جواب مولانا صاحب نے یہ ارسال کیا۔

یہاں میرا سوال یہ ہے کہ دلائل مذکورہ سے عقلی دلائل مراد ہیں یا دوسرا کوئی کلام ربانی اگر دلائل عقلیہ مراد ہیں تو دلیل عقلی کا تقدم لازم آیا اور محال کا قاعدہ عام ٹھہرانا پڑا اس لئے کہ جس چیز کا کسی صفت پر ہونا عقل کی رو سے دریافت کرنا ہوتا ہے تو پہلا مرحلہ اس کا یہی ہے کہ آیا اس چیز کا اس صفت پر ہونا عقلاً ممکن ہے یا محال اگر دلائل مذکورہ سے کوئی دوسرا کلام ربانی مراد ہے تو اس کلام کو ربانی جاننے کے لئے بھی کوئی دلیل چاہیئے۔ ۱۷ اراگست آل حسن

کافی بحث و تمحیص کے بعد جب پادری فنڈر نے یہ مان لیا کہ محال عقلی عام نہیں ہے تو مولانا نے ۴ر فروری ۱۸۴۵ء کے خط میں خط و کتابت بند کرنے کے لئے پادری فنڈر کو لکھا:۔

اگر آپ اب بھی میری بات کو سمجھ نہیں سکے یا سمجھ سکتے ہیں مگر ویسے ہی جواب دینے والے ہیں جیسے کہ اپنے سابقہ خط میں دے چکے ہیں کہ قاعدہ محال عقلی عام نہیں ہے تو میں آپ سے جواب نہیں مانگتا بلکہ صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ مجھے آپ سے کچھ گنجائش مناظرہ کی نہیں ہے اور نہ آپ کو مجھ سے اور اس بات کا امیدوار ہوں کہ جہاں اگلی تحریریں چھپی ہیں اُن کے آخر میں یہ خط بھی چھپے تاکہ ہر سمجھدار آدمی جان جائے کہ یہ بات کس کی درست ہے۔ آل حسن[1]

اس زمانہ میں ڈاک و تار کا انتظام نہیں تھا اس کے باوجود مولانا آل حسن صاحب کی علمی قابلیت اور مذہبی خدمات کا شہرہ تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔ سرکار نظام حیدرآباد دکن میں نواب افضل الدولہ کے عہد میں نواب محمد یار خاں محی الدولہ کا خاص اقتدار تھا اور نظام الملک خامس کے بھی وہ قابل اعتماد لوگوں میں تھے۔ یہاں تک کہ

---

[1] حل الاشکال معہ مراسلات پادری و مولوی سید آل حسن ص ۱۵

مہر سالار جنگ اول وزیر اعظم تک کو ان کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ محی الدولہ ایک مذہبی
اور دیندار آدمی تھے اور علماء کے بڑے قدرداں تھے۔ مولانا آل حسن صاحب کی قابلیت
و علمیت کی شہرت سن کر انہوں نے کوشش کی کسی طرح مولانا حیدرآباد آجائیں انہوں
نے سفر خرچ کی ایک معقول رقم مولانا کو موہان بھیجی اور بہت اشتیاق کے ساتھ مولانا کو
حیدرآباد آنے کے لئے لکھا۔ لیکن مولانا حیدرآباد جانے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ انکار
کر دیا۔ دوبارہ نواب صاحب نے اصرار کے ساتھ لکھا اور سفر خرچ بھی دوبارہ روانہ
کیا۔ اس زمانہ میں مولانا دہلی میں وکالت فرما رہے تھے۔ دوستوں نے بھی ان کو حیدرآباد
جانے کا مشورہ دیا۔ اس لئے آپ دہلی سے کسمنڈی آئے اور وہاں سے حیدرآباد گئے
نواب محی الدولہ کے ہاں مقیم ہوئے اور بہت جلد ڈیڑھ سو روپے کے ملازم ہو گئے
ایک سال کا عرصہ گذرا تھا کہ موہان میں آپ کی ایک صاحبزادی اور ایک صاحبزادے مولوی انوار الحسن
صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مولانا اس پریشانی کی وجہ سے حیدرآباد سے موہان چلے آئے
چند دن موہان میں رہے ہوں گے کہ نواب صاحب نے پھر سفر خرچ بھیج کر مولانا صاحب
کو حیدرآباد بلایا اس بار آپ ناظم صدارت العالیہ حیدرآباد مقرر ہوئے اور چھ سو روپے ماہانہ
تنخواہ مقرر ہوئی۔ آپ کو جاگیر ملنے والی ہی تھی کہ دفعۃً نواب محی الدولہ کا انتقال ہو گیا
جس کی وجہ سے آپ آخر تک اسی عہدہ پر فائز رہے اور جاگیر نہیں ملی اور حیدرآباد میں
ہی آپ کا ۱۷ ربیع الاوّل ۱۲۸۷ھ میں تقریباً ۸۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

مولانا آل حسن کی پیشانی کشادہ، گورا رنگ، بہت کھلا ہوا۔ بہت بڑی بڑی خوبصورت
آنکھیں بھنویں گھنی . . . لیکن بیچ میں فاصلہ تھا۔ بینی بلند اور دراز کسی قدر آگے کو
جھکی ہوئی۔ داڑھی، قد متوسط، ہاتھ پیر چھوٹے چھوٹے گداز بہت ہی خوبصورت و نرم
آنکھوں کا خاص ایک وصف تھا کہ عاشق رسول و آل رسول تھیں۔ رسول خدا صلی اللہ
علیہ وسلم یا اہلبیت کے نام لینے پر فوراً اشکبار ہوتیں۔ دل ہمیشہ اس محبت میں سوزاں رہتا تھا۔

مولانا بہت بھولے بھالے تھے۔ خانگی امور میں بالکل توجہ نہیں دیتے تھے۔ خیالات اعلیٰ تھے اور مذہبی امور کی طرف زیادہ متوجہ رہتے تھے۔ گھی اور تیل میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اُن کا ایک اسی قسم کا واقعہ مشہور ہے۔

ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے مولوی احمد سعید کے پیدا ہونے کے بعد دودھ پلانے کے لئے ایک انا رکھی گئی جو قوم کی ہندو اور راجپوت تھی۔ قد و قامت میں بلند تھی۔ اس کا قد عام عورتوں سے زیادہ تھا۔ مولانا صاحب ایک دن گھر میں آکر دریافت کرنے لگے۔ یہ کون ہے۔ گھر والوں نے کہا۔ یہ دودھ پلانے کے لئے ملازم رکھی گئی مولانا صاحب نے لڑکیوں کو تنبیہ کی کہ اس عورت پر مجھے شبہ ہے کہ کہیں یہ مرد نہ ہو۔ اور یہاں دودھ پلانے کے بہانے عورت کے بھیس میں آئی ہو۔ اس لئے لڑکیوں کو احتیاطاً اس سے پردہ کرنا چاہیے۔ گھر کے لوگوں نے کہا حضرت وہ تو دودھ پلاتی ہے۔ اس پر مرد ہونے کا شبہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ لاحول پڑھ کر آپ ہنسنے لگے۔ دودھ پلانے کا آپ نے خیال ہی نہیں کیا تھا۔

مولانا آل حسن صاحب کی طبیعت انتہائی نازک اور نفاست پسند تھی۔ بدصورت اور سیاہ فام لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے صاحبزادے مولوی احمد سعید صاحب کا رنگ سانولا تھا۔ ان کو دیکھ برسوں افسوس کیا کہ میرا لڑکا کالا پیدا ہوا ہے۔

مولانا آخر عمر میں محبت اہل بیت میں گم ہو گئے تھے۔ کوئی شخص کسی بھی اہل بیت کا نام لیتا۔ آپ کی بڑی بڑی خوبصورت نرگس شہلا آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری ہو جاتا تھا۔ انتہائی زہد و تقویٰ کے پابند ہونے کے باوجود عشرہ محرم میں شرع کی حد سے نکل جاتے تھے۔ تعزیہ بنانے اور رکھنے کو بدعت اور گناہ سمجھتے تھے لیکن تعزیہ کو دیکھ کر بے قابو و بے اختیار ہو جاتے تھے۔ قصبہ کسمنڈی میں عوام الناس نویں محرم کو تعزیوں پر ماتم کرتے ہوئے نکلتے تھے۔ پابند شرع لوگ ان کے پاس کھڑا ہونا بھی پسند نہیں کرتے تھے

لیکن مولانا صاحب تمام شب اس گروہ کے پیچھے زار و قطار روتے ہوئے چلتے تھے۔
مولانا کی ایک کتاب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پر ہے جس کی ابتدا
اس شعر سے ہوتی ہے ؎

امروز شاہ شاہان مہماں شدا ست مارا
جبریل با ملائک درباں شدا ست مارا

مولانا آل حسن صاحب اکثر میلاد کی مجلسوں میں مذکورہ شعر پڑھا کرتے تھے۔ آخر
میں تو اُن کا دستور بن گیا تھا کہ سال میں ایک مرتبہ اپنے ہی گھر میں مجلس میلاد نبوی
منعقد فرماتے اور اس شعر کے پہلے مصرعہ کو پڑھنے کے بعد حال سے بدحال ہو جاتے
ہچکیاں لگ جاتیں جو گھنٹوں جاری رہتیں حتیٰ کہ پڑھنے سے مجبور ہو جاتے اور بالآخر
کسی دوسرے شخص کو پڑھنا پڑتا۔ مولانا انوار الحق صاحب لکھنوی فرنگی محلی سے
آپ بیعت تھے جن کو آپ میاں کہا کرتے تھے۔

مولانا آل حسن صاحب کی حسب ذیل تصانیف ہیں۔

(۱) کتاب مرغوب در باخذ جوابات بہ نصاریٰ (۲) رسالہ اردو وحدتِ وجود
(۳) تقریر در بحث لا متناہی (۴) مولد نامہ مصطفوی (۵)، دامغہ علویہ (۶)
انتخاب ترجمہ ارشادات عیسوی (۷) تنقیح العبادت (۸) مجمع النورین در بیان
الوہیت و رسالت (۹) رسالہ نجات اخروی (۱۰) استفسار (۱۱) استبشار (۱۲)
تذکرہ شہادت سید الشہدا (۱۳) تذکرہ الموالی (۱۴) فوائد مثنوی مولانا روم (۱۵) ترجمہ بعض
آیات قرآنی در بار اعتقادات [1] تقاریر در بحث لا متناہی ابحاث مختلفہ

---

[1] مولانا آل حسن صاحب کی کتاب تنقیح العبادت کے ابتدا میں ان کے پوتے سید محمد حیات الحسن صاحب موہانی نے مولانا آل حسن صاحب کے مختصر حالات آٹھ صفحہ پر لکھے ہیں جس میں سے یہ حالات اخذ کئے ہیں۔

مولانا آل حسن صاحب کے چھ صاحبزادے مولوی اولاد حسن صاحب، مولوی عارف حسن صاحب، مولوی انوار الحسن صاحب، مولوی لطف حسن صاحب، مولوی شریف الحسن صاحب، مولوی احمد سعید صاحب اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ آپ مولانا حسرت موہانی مرحوم و مغفور کے پرنانا تھے

امداد صابری

۲۰ر جنوری ۱۹۶۶ء

۲۹ر رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ

مدینہ منورہ

سبب تالیف

ہندوستان میں اسلام پر دو مرتبہ زبردست اور خطرناک حملے ہوئے ۔ ایک تو اکبر بادشاہ نے اپنے عہد حکومت میں حملہ کیا تھا ۔ اس نے حکومت کے زعم اور طاقت کے نشے میں دین الٰہی قائم کیا ۔ وہ یہ کہتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعثت کے زمانے سے اب تک ہزار سال ہو چکے ہیں ۔ اس لئے دین اسلام کی بقا بھی تمام ہوئی ۔ وہ اسلام کے تمام احکام و عقائد کو نامعقول جانتا ۔ فقہا کو مفسد سمجھتا اور اہل اسلام کو مطعون کرتا تھا ۔ اس نے اپنے نام پر خطبہ جاری کیا تھا ۔ لاالہ الااللہ اکبر خلیفۃ اللہ ۔ اس کی اس حرکت کی تاریخ کسی نے فتنہ ہاست کہی تھی ۔ اس کے دربار میں جو پانچ وقت نماز باجماعت ہوتی تھی ۔ اس نے اس کو موقوف کیا ۔ حج اور روزہ بھی بند کیا معجزہ شق القمر اور معراج کا منکر تھا ۔ اس کا ذکر اس طرح کرتا تھا جس کو منشی ذکاءاللہ صاحب نے نقل کیا ہے

"ایک رات بادشاہ نے میر فتح اللہ کی موجودگی میں بیربر سے کہا کہ یہ بات کیونکر عقل قبول کرتی ہے کہ ایک شخص ایک لحظہ میں باوجود گرانی جسم کے خوابگاہ سے آسمان پر جائے اور نوے ہزار باتیں خدا سے کرے اور ہنوز اس کا بستر گرم ہو اور وہ اُلٹا چلا آئے

لہ تاریخ ہند پنجم ص۴۸۸

اور ایسے ہی شق القمر اور اسکے مثل اور باتیں ہیں۔ پھر ایک پاؤں اپنا اٹھا کر سب کو دکھایا اور یہ فرمایا کہ جب تک دوسرا پاؤں اپنی جگہ پر نہ ہو ناممکن ہے کہ کھڑا رہوں۔ ان احمقانہ حکایتوں پر لوگ یقین کرتے ہیں۔ بدبخت بیربر اور گمنام بدبخت آمنا وصدقنا کہتے تھے اور اس کی تائید میں باتیں بناتے تھے۔ بادشاہ فتح اللہ کی طرف بار بار دیکھتا تھا مگر وہ گردن نیچے ڈالے ہوئے کچھ نہ کہتا تھا۔ سراسر گوش بنا ہوا تھا۔"

اکبر نے آتش پرستی کو رواج دیا جس کا مہتمم ابوالفضل کو بنایا اور اس کو حکم دیا کہ شاہان عجم کی طرح آتش کدہ میں رات دن آگ روشن رہے جو کبھی نہ بجھنے پائے۔ اکبر علی الاعلان آفتاب اور آگ کو سجدے کرتا تھا۔ دن میں چار دفعہ صبح وشام دوپہر اور آدھی رات کو سورج کو پوجتا تھا اور سورج کے ایک ہزار نام دوپہر کے وقت سورج کی طرف متوجہ ہو کر پڑھتا۔ دونوں کانوں کو پکڑ کر چکر لگا کر اور دونوں کانوں کے اوپر مکے مار کر جھروکہ سے باہر آتا۔ درشن کرنے والے اس کو سجدے کرتے تھے۔

آتش پرستوں میں سال بھر میں چودہ عیدیں منائی جاتی تھیں۔ اکبر نے انہی عیدوں کو منانا شروع کر دیا جس کی وجہ سے اسلامی عیدوں میں رونق نہیں رہی اور بالآخر بند ہو گئیں۔ سور اور کتے حرم میں پلنے لگے۔ صبح کے وقت اکبر ان کی زیارت کو عبادت سمجھتا تھا۔ سور اور شیر کے گوشت کو اس نے مباح قرار دیا تھا اور اس کی دلیل یہ دی کہ ان میں شجاعت اور بہادری پائی جاتی ہے۔

اکبر لوگوں کو اپنا مرید بناتا تھا اور اس کا جو مرید مر جاتا اس کے لئے یہ حکم تھا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو کچا اناج اور پکی اینٹ اس کی گردن میں باندھ کر پانی میں ڈبو دیں اور اگر پانی نہ ملے تو جلا دیں۔

شراب کے استعمال کے بارے میں یہ حکم دیا گیا تھا۔ بدن کی آسودگی کے لئے حکمت کے طور پر استعمال کی جائے۔ اور اگر باعث فتنہ وفساد نہ ہو تو مباح ہے۔ ایک شراب کی

دکان دربار کے دروازے پر کھولی گئی۔ کہتے ہیں کہ اس شراب کی ترکیب کے اجزا میں سور کا بھی گوشت ہوتا تھا۔

اکبر کے عہد میں خمار اور سور کو حلال قرار دیا گیا۔ محرمات اور دربار میں قمار خانہ بنایا گیا۔ جواریوں کو خزانہ سے سود پر روپیہ دیا جاتا تھا اور قمار خانہ کے مہتمم کو مال دیجاتی تھی[1]۔ تفسیر و حدیث اور فقہ کا پڑھنے والا امر دود قرار دیا گیا علوم نجوم، حکمت، طب اور حساب کو رائج کیا گیا۔ اکبر نے سلام کا طریقہ بھی بدل دیا تھا۔ السلام علیکم کے بجائے اللہ اکبر، وعلیکم السلام کی جگہ جل جلالہ کر دیا تھا۔ جلال الدین اس کا نام تھا۔ اس کی مناسبت سے اس نے یہ طریقہ رائج کیا تھا[2]۔

کتب تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ابوالفضل اور فیضی کی وجہ سے اکبر کے یہ ملحدانہ اور مشرکانہ خیالات ہو گئے تھے۔ چنانچہ صاحب مفتاح التاریخ لکھتے ہیں۔

"شہزادہ سلیم اپنی سوانح عمری تزک جہانگیری میں لکھتا ہے کہ ابوالفضل نے میرے باپ کو قرآن کے کتاب الٰہی ہونے اور محمد رسول خدا کی رسالت میں شک ڈالوا دیا تھا۔ اس لئے میں نے اس کافر بیدین کو مروا ڈالا اور اسی وجہ سے میں نے اپنے باپ سے بغاوت کی تھی۔ نرسنگھ دیو نے ابوالفضل کا سر کاٹ کر شہزادہ کی خدمت میں کھبیجدیا تھا جب سلیم تخت پر بیٹھا تو اس نے پہلے نرسنگھ دیو کو ایک بڑے رتبہ پر پہنچایا اور اس پر ہمیشہ مہربانی و عنایات کرتا رہا۔

جہانگیر کی عہد حکومت میں کچھ اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ پہلے جلوس میں جو مباحثہ اس کا پنڈتوں سے ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ توحید پر ایمان رکھتا تھا اور بت پرستی کو

---

[1] تاریخ ہند ذکا اللہ پنجم ص ۸۴۶

[2] آئینہ تاریخ نما جلد اول ص ۲۷۵

گناہ سمجھتا تھا[1] اس نے علماء دین کو حکم دیا تھا کہ وہ مفردات اسماء الٰہی جو آسانی سے اس کو یاد ہو جائیں جمع کریں تاکہ وہ اس کا ورد کرے۔ علماء نے جہانگیر کو پانچ سو بائیس نام حروف ابجد کے حساب سے بالترتیب لکھ کر دیئے جن کو وہ پڑھا کرتا تھا اور جمعہ کی شب کو علماء اور درویشوں کی مجلس قائم کرتا تھا۔ روزہ بھی رکھتا تھا۔ چنانچہ جہانگیر نے تیرھویں جلوس میں حکم دیا کہ تمام مشائخ جو شہر (آگرہ) میں رہتے ہیں حاضر ہوں اور روزہ افطار کریں تین راتیں اسی طرح گذاریں اور ہر رات کو مجلس کے خاتمہ پر جہانگیر کھڑے ہو کر یہ اشعار پڑھتا تھا ؎

خداوند را تو نگر تو ئی — توانا و درویش پرور توئی
نہ کشور کشایم نہ فرماں دہم — یکے از گدایان این درگہم
تو بر خیر و نیکی دہم دسترس — وگرنہ چہ خیر آید از من بکس
منم بندگاں را خداوندگار — خداوند را بندۂ حق گذار[2]

---

[1] روزے از پنڈتان کہ عبارت از دانایان ہنود است پرسیدم کہ اگر منتہائے دین شما فرود آمدن ذات مقدس حق تعالیٰ است در دہ پیکر مختلف بطریق حلول آں خود نزد ارباب عقل مردود است ایں مفسدہ لازم وارد کہ واجب تعالیٰ کہ مجرد از جمیع تعینات است صاحب طول و عرض و عمق بودہ باشد و اگر مراد ظہور نور الٰہی است دریں اجسام آں خود در ہمہ موجودات مساوی است و بایں دہ پیکر مختص نیست و اگر مراد اثبات صفتے از صفات الٰہی است دریں صورت ہم تخصیص درست نہ زیرا کہ در ہر دین و آئین صاحبان معجزات و کرامات ہستند کہ از دیگر مردمان زماں خود بدانش و فراست ممتاز بودہ اند، بعد از گفت و شنو و لبیار و دو بدل بیشمار بخدائی خدائے منزہ از جسم و چوں و چگوں معترف گشتند" (تزک جہانگیری (سال اول جلوس صـ ۱۴)

[2] تزک جہانگیری صـ ۲۴۱

جہانگیر نے میر عدل اور قاضی مقرر کئے تاکہ شریعت کے مطابق مقدمات کے فیصلے ہوں اس نے شراب خانوں کو ختم کرایا۔ گرچہ خود شراب پیتا تھا۔ بازاروں میں بنگ و بوزہ کی فروخت بند کرائی[1] اور قلعہ میں ایک عظیم الشان مسجد بنوائی۔

جب اس نے یہ سنا کہ ایک سنیاسی کی صحبت میں بعض مسلمان امیرزادے کفر و زندقہ کی حرکتیں کرتے ہیں تو اس نے ان میں سے بعض کو محبوس و مقید کیا اور بعض کے سو سو دُرّے لگوائے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو[2]

لیکن بعض غیر اسلامی اور مشرکانہ طریقے اس کے دور میں بھی جاری تھے۔ جہانگیر شورانزی کو اپنے باپ کی طرح بڑے بڑے پنڈتوں اور جوگیوں کو اپنے محل میں بلاتا اور ان کو کھلاتا اور ان کے ساتھ کھانا پیتا بھی تھا۔ سنکرات کے وقت جب آفتاب برج عقرب میں داخل ہوتا تھا۔ ہزار تولہ سونا چاندی اور ہزار روپے خیرات کراتا تھا

اکبر جس طرح سورج کی پوجا کیا کرتا۔ اس طریقہ کو تو جہانگیر نے ختم کر دیا تھا۔ لیکن سورج کی تقدیس اس کے دل سے نہیں نکلی تھی۔ جب سورج نکلتا تو وہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا تھا۔ جب جہانگیر نے ناصر الدین بادشاہ مالوہ کی قبر کو کھدوا کر اس کی ہڈیوں کو آگ میں جلانے کا حکم دیا تو اس نے کہا آتش جیسی پاک چیز میں یہ ناپاک ہڈیاں نہیں ڈالنی چاہیئے اس لئے ان کو پانی میں ڈلوایا۔ پارسی جشنوں کی جو رسمیں پہلے سے چلی آئی تھیں وہ بدستور اسکے عہد میں قائم رہیں۔

نورجہاں کی شادی کے بعد سے جہانگیر کے عقیدہ میں اور بھی فرق آگیا تھا اور مزید

---

[1] روز جمعہ بیست دوم حکم فرمود کہ بنگ و بوزہ منشار فساد کلی است در بازارہا نفروشند و قمار خانہا را برطرف سازند دریں باب تاکید تمام نمودم (تزک جہانگیری جشن چہارم

[2] تاریخ ہند ذکاء اللہ جلد پنجم صفحہ ۲۸۱

بدعتیں جاری ہوگئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گرامی علماء اور فضلا اس دور میں بھی تھے لیکن اکبر اور جہانگیر کی غیر شرعی مشرکانہ حرکتوں کو دیکھتے تھے اور لب ہلانے کی جرأت نہیں کرتے تھے اور سوائے حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے کوئی عالم ان کی مخالفت میں نہ کچھ بولتا اور نہ ان کے خلاف کسی سے کوئی شکایت کرنے کی ہمت کرتا تھا۔

شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اکبر اور جہانگیر کے غیر شرعی حرکات و اعمال کے خلاف اس زمانے کے علمی طبقے میں اپنے مکاتیب بھیجتے اور رسائل بھی تحریر فرماتے تھے جس کی وجہ سے علماء سُو کا شاہی طبقہ ان کی مخالفت پر آمادہ ہوگیا تھا اور ان کو جہانگیر کے سامنے ذلیل کرنے کے منصوبے بنانے لگا تھا چنانچہ آپ نے حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں ایک خط تحریر فرمایا تھا جو ان خود غرض علماء کے ہاتھ لگ گیا انہوں نے اُس کو جہانگیر کے سامنے پیش کیا اور ان کے خلاف دل کھول کر جہانگیر کو بھرا اور برگشتہ کیا۔ اور ان پر یہ الزام لگایا۔ کہ یہ اپنے آپ کو حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل سمجھتے ہیں۔

جہانگیر اس خط کو پڑھ کر بہت برافروختہ ہوا اور حضرت شیخ احمد سرہندی کو دربار میں بلانے کا حکم دیا۔ آپ دربار میں تشریف لائے۔ جہانگیر نے سوال کیا کیا تم اپنے آپ کو حضرت صدیق اکبر سے افضل سمجھتے ہو۔ آپ نے جواب دیا۔ جس طرح طبقہ اہل سنت میں حضرت علی مرتضیٰ کو حضرت صدیق اکبر پر فوقیت دینے والا اہل تسنن سے نکل جاتا ہے۔ اسی طرح صوفیہ فرقہ میں سے اگر کوئی شخص اپنے آپ کو کتے سے جو مخلوقات میں سب سے زیادہ پلید اور ناپاک ہے بہتر سمجھے وہ بھی اس فرقہ سے خارج ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ اپنے آپ کو حضرت صدیق اکبرؓ سے زیادہ افضل سمجھے۔ بقول صاحب "مقامات امام ربانی" آپ کے جواب سے جہانگیر مطمئن ہوگیا اور آپ کو نہایت عزت و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔[۱]

---

[۱] مقامات امام ربانی ص۵۳

جب ان علمارسُو نے دیکھا کہ ہمارا یہ وار خالی گیا۔ تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے موقع محل دیکھ کر ایک دن جہانگیر کو دوسرے پیرایہ میں حضرت شیخ احمد سرہندی کے خلاف بھڑکایا کہ شیخ احمد صاحب کے ہزار ہا مرید ہیں اور سلاطین امرار توران وغیرہ ان کے حلقہ میں داخل ہیں اور ہر مقام پر ان کے خلفار بھی موجود ہیں اور خلیفوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے۔ ان کے صدہا اور ہزار ہا مرید ہیں اور یہ آپ کے عقائد وطریقوں کے خلاف اور خاص طور پر شاہی سجدے کے خلاف بھی لکھتے رہتے ہیں اور رعایا کو بھڑکاتے ہیں ۔ آپ ان کو بلوائیے اگر آپ کو سجدہ کر لیں تو معلوم ہو جائے گا یہ آپ کے حامی ہیں۔ اگر سجدے سے انکار کریں تو یقین ہو جائے گا یہ آپ کے مخالف ہیں [1]

چنانچہ جہانگیر نے حضرت شیخ احمد صاحب کو دوبارہ دربار میں بلوایا۔ شاہی مقربین نے ان کو بادشاہ کو سجدہ کرنے کے لئے کہا آپ نے انکار فرما دیا۔ انکار کرنا تھا کہ مخالفوں کی بن آئی اور تمام علمار دربار نے جہانگیر کو خوش کرنے کے لئے حضرت شیخ احمد پر قتل کا فتوے صادر فرما دیا۔ جس کے بعد جہانگیر نے آپ کو جیل بھیجدیا۔ چنانچہ تزک جہانگیری میں جہانگیر نے آپ کو دربار میں بلانے اور جیل بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہانگیر ان کی باا ثر شخصیت سے متاثر تھا اور ان کی طاقت ومکتوبات کو اپنی حکومت کے لئے خطرناک سمجھتا تھا۔

شیخ احمد نام شیادی در سرہند دام زرق	شیخ احمد نامی ایک شخص نے سرہند میں
وسالوس فروچیدہ بسیارے از ظاہر پرستان	فریب ومکر کا جال بچھا کر بہت سے ظاہر پرستوں
بے معنی را صید خود کردہ و بہر شہرے ودیارے یکے	اور سادہ لوحوں کو اپنا صید بنا کر رکھا ہے۔ ہر شہر
از مریدان خود راکہ آئین دکان آرائی ومعرفت	ودیار میں ایک آدمی اپنے مریدوں میں سے
فروشی ومردم فریبی را از دیگران پختہ تر داند	جو قاعدہ دکان آرائی اور معرفت فروشی اور
خلیفہ نام نہادہ فرستادہ دمزخرفاتے کہ بمریدان	مردم فریبی اور دوسروں سے بہتر جانتا ہو خلیفہ

[1] مقامات امام ربانی

و معتقدان خود نوشتہ کتابے فراہم آوردہ
مکتوباتے نام کردہ دوران جنگ مہملات
بسا مقدمات لاطایل مرقوم گشتہ کو بکفر و زندقہ
منجر میشود ازانجملہ در مکتوبے نوشتہ کہ در اثنائے
سلوک گذارم بمقام ذی النورین افتاد مقامی
دیدم بغایت عالی و خوش بصفا ازانجا در گذشتم
بمقام فاروق پیوستم و از مقام فاروق بمقام
صدیق عبور کردم و ہر کدام را تعریفے در خور آں
نوشتہ و ازانجا بمقام محبوبیت واصل شدہ
مقامی مشاہدہ افتاد بغایت منور و ملون
خود را بانواع انوار و الوان منعکس یافتم یعنی
استغفر اللہ از مقام خلفاء در گذشتہ بعالی
مرتبت رجوع نمودم و دیگر گستاخیہا کردہ
کہ نوشتن آں طولے دارد و از ادب دور است
بنابریں حکم فرمودم کہ بدرگاہ عدالت آئین
حاضر سازند حسب الحکم بملازمت پیوست
و از ہر چہ پرسیدم جواب معقول نتوانست
ساماں نمود با مقدم خرد و دانش بغایت مغرور
و خود پسند ظاہر شد صلاح حال او منحصر دریں
دیدم کہ روزے چند در زندان ادب محبوس
باشد تا شوریدگی مزاج و آشفتگی دماغش

نام رکھ کر بھیجا ہے اور جو مزخرفات اپنے مریدوں
اور معتقدوں کو لکھی ہے کتابی شکل میں مرتب
کی اور اس کا نام مکتوبات رکھا ہے اور
اس مجموعہ مہملات میں لاطائل باتیں لکھی ہیں
جو کفر اور زندقہ تک پہنچتی ہیں۔ ان میں سے
ایک خط میں لکھا ہے کہ میرا گذر اثنائے سلوک
میں مقام ذی النورین میں پڑا۔ جہاں میں نے
ایک مقام عالی اور صفا دیکھا وہاں سے گذرا
تو مقام فاروقی میں پہنچا اور مقام فاروقی
سے مقام صدیقی کو عبور کیا۔ اور ہر ایک کی
تعریف اس کے مطابق لکھی اور اس جگہ سے
مقام محبوبیت میں پہنچا وہاں ایک عمدہ مقام
دیکھا جس کو نہایت نورانی اور رنگین قسم قسم
کے نوروں اور رنگوں سے منعکس پایا یعنی
استغفر اللہ مقام خلفاء سے گذر کر عالی مرتبت
سے رجوع کیا اور دوسری گستاخیاں کیں جس کا
لکھنا طول ہے اور ادب سے بھی دور ہے
اس واسطے میں نے حکم دیا کہ ان کو درگاہ عالی
میں حاضر کیا جائے۔ حکم کے مطابق وہ حاضر
ہوئے جو بات میں نے دریافت کی اس کا
انہوں نے معقول جواب نہیں دیا اور باوصف

قدرے تسکین پذیر و سورش عوام نیز فرونشیند	کم عقل و دانش کے مغرور خود پسند اور متکبر
لاجرم بانی رائے سنگدلن حوالہ شد کہ در	معلوم ہوا۔ اس کی اصلاح اس میں دیکھی
قلعہ گوالیار مقید دارد (۲۷۳)	کہ وہ چند روز قید خانہ ادب میں رہے
	تاکہ اس کی شوریدگی مزاج اور آشفتگی دماغ
	کو تسکین حاصل ہو اور عوام کی شورش بھی
	کم ہو۔ لاجرم رائے سنگدلن کے حوالے کیا
	کہ ان کو گوالیار کے قلعہ میں قید رکھے۔

جب حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ جیل میں پہنچے تو کئی ہزار مشرک و کافر آپ کے اخلاق حسنہ اور فیوض روحانی سے متاثر ہو کر مشرف باسلام ہوئے اور صدہا قیدی آپ سے بیعت ہو کے ولی کامل بنے۔ آپ نے کبھی جہانگیر کے لئے بددعا نہیں کی اور جب آپ کے بعض مریدوں نے جہانگیر کو ضرر پہنچانے کا ارادہ بھی کیا تو آپ نے اس حرکت کرنے سے انہیں خواب میں یا بیداری میں منع فرمایا اور فرماتے تھے کہ اگر جہانگیر مجھے یہاں نہ بھیجتا تو یہ کافر مسلمان کیسے ہوتے ورنہ اسلام کی دولت سے محروم رہتے۔

دو سال کے بعد جہانگیر کو آپ کی روحانی طاقت کا پتہ لگا تو پشیمان ہوا اور آپ کو اپنے پاس بلا کر معذرت کرنے کے بعد اعزاز و اکرام سے نوازا اور یہاں تک متاثر ہوا کہ ان کو اپنے سے جدا نہیں کرتا تھا اور لشکر سے بھی علیحدہ نہیں رکھتا تھا اور اپنے صاحبزادے شاہجہاں کو آپ کے مریدوں کے حلقے میں داخل کیا چنانچہ شاہجہاں کے عہد سے لیکر عالمگیر کے دور حکومت تک تقریباً اکثر امراء اور وزراء سلسلہ مجددیہ میں داخل ہوئے [1]

یہ حقیقت ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندی اور ان کے ساتھیوں نے اکبر کے پیدا کردہ

---

[1] مقامات امام ربانی ص۱۲۵

اسلام کو ختم کرنے والے فتنہ کا سد باب کیا اور انہی حضرات کے روحانی فیض کا یہ کرشمہ اور اعجاز ہے کہ اکبر کے مشرکانہ وملحدانہ عقیدوں اور طریقوں کا جہانگیر وشاہجہاں کے دور سے خاتمہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور عالمگیر کے عہد حکومت میں ان کا وجود بھی باقی نہیں رہا تھا۔

شاہجہاں بادشاہ کی روزمرہ کی زندگی اور طور وطریقے ایک سچے مسلمان جیسے تھے۔ جب شاہجہاں نے تخت سلطنت پر جلوس کیا تو اکبر کے عہد میں شریعت محمدی میں جو خلل پڑ گیا تھا اس کو ختم کرنے کے لئے اس نے پہلا یہ حکم دیا کہ چونکہ سجدہ کا سزاوار معبود حقیقی ہے اس لئے آئندہ کوئی شخص کسی کے سامنے سجدہ نہ کرے۔

مہابت خاں نے عرض کیا اگر حضرت کو احکام الٰہی کی اطاعت کی وجہ سے سجدہ ناپسند ہے تو اس کی جگہ زمیں بوس مقرر کیا جائے جس سے مخدوم وخادم اور سلطان رعیت میں امتیاز ہو۔ شاہجہاں نے اس بات کو پسند کیا کہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کے پشت دست پر بوسہ دیا اس کا نام زمیں بوس رکھا مگر اسمیں بھی سجدہ کی مشابہت پائی جاتی تھی اسلئے اس نے اس کو بھی موقوف کیا۔[۱]

شاہجہاں نے اپنے سکّہ میں کلمۂ شہادت لکھوایا۔ اس قسم کی اشرفی جو ۱۰۶۴ھ مطابق ۲۸ جلوس میں مضروب کی گئی تھی وہ لندن کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ سکّے کے درمیان "لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ضرب دار الخلافہ شاہجہاں آباد ۱۰۶۴ھ" اور ہر چہار طرف از صدق ابوبکرؓ شد ایمان انور، اسلام قوی دست شد از عدل عمرؓ، دین تازہ شدہ از شرم حیا عثمانؓ، از علم علیؓ یافت ولایت زیور" تحریر ہے۔[۲]

شاہجہاں کی عبادت گذاری اور پنجگانہ نماز کی حالت یہ تھی کہ آخر شب میں طلوع فجر سے دو ساعت پہلے بیدار ہوتے۔ اکبر آباد کی خلوت گاہ میں ایک مسجد تھی اس میں نفلیں پڑھتے اور جب فجر کی نماز کا وقت آتا تو نماز سے فارغ ہو کر مصلی پر بیٹھ کر دعائیں مانگتے اور وظیفہ پڑھتے

---

[۱] بادشاہ نامہ [۲] واقعات دار الحکومت اول صہ ۴۹۳

تھے ۔ اس کے بعد حرم سرائے میں جاتے ۔ ظہر کی نماز پڑھتے اور وظائف سے فارغ ہونے کے بعد کھانا کھا کر قیلولہ کرتے تھے ۔ عصر کی نماز کے بعد دولت خانہ خاص و عام کے جھروکے میں تشریف فرما ہوتے اور دولت خانہ خاص میں مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ ادا فرماتے تھے اور چار پانچ گھڑی سلطنت کے کاموں میں مصروف و مشغول رہنے کے بعد نغمات سنتے ۔ اس سے فراغت پا کر عشاء کی نماز پڑھتے اور دولت خانہ خاص میں شاہ برج میں جاتے ۔ وزیروں اور بخشیوں کو طلب کر کے ان کے کاموں کو انجام دیتے اور سونے سے قبل کتب سیر تاریخ حالات انبیاء و اولیاء وغیرہ کا مطالعہ فرماتے تھے ۔[1]

ارباب فتویٰ و فضلا اور دیندار و دیانت دار لوگ ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے اور علماء کے فتوے کے مطابق فیصلے کئے جاتے تھے ۔ جس مقام پر شاہجہاں خلاف شرع کوئی رسم یا کوئی فعل دیکھتے تو اس کا انسداد کرتے تھے ۔

کابل میں تیراہ اور اس کے نواح افغان خصوصاً غوریہ خیل جو بایزید پیر روشنائی کے مرید تھے شریعت کے مقابلے میں اپنے پیر کی بات کو آیات قرآنی اور حدیث رسول سمجھتے تھے ۔ وہاں نکاح کے لئے یہ رسم جاری تھی جو بلا ایجاب و قبول کے ایک مجلس میں گائے ذبح کی جاتی اور لوگوں کو پکا کر کھلا دی جاتی تھی ۔ اور طلاق دینے کا طریقہ یہ رائج تھا کہ خاوند بیوی کے ہاتھ میں تین سنگریزے دے کر گھر سے نکال دیتا تھا تو اس کو طلاق سمجھ لیا جاتا تھا ۔ جب شاہجہاں کو اس قسم کے واقعات کا علم ہوا تو اس نے حکم دیا ۔ یہ رسمیں ختم کی جائیں اور شریعت کے مطابق نکاح ہونا چاہیے اور شرع ہی کے مطابق طلاق دی جائے (۹۰)"

شاہجہاں ہر سال ۱۲ ربیع الاول کو مجلس میلاد منعقد کرتے تھے جس میں فضلاء علماء اور حفاظ شرکت کرتے تھے ۔ قرآن مجید کی تلاوت ہوتی تھی ۔ مکارم و محاسن جناب

---

[1] تاریخ ہند ذکاء اللہ جلد ہفتم ص۲۰

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ انواع واقسام کے کھانے کھلائے جاتے تھے اور بذاتِ خود شاہجہاں اس متبرک رات میں زمین پر مسند بچھا کر بیٹھ جاتے اور مستحق لوگوں کو حسب حیثیت خلعت ومال تقسیم فرماتے تھے۔ چنانچہ اس رات میں تیس ہزار روپیہ تقسیم ہوتا تھا (۱۶۶)"

شیخ احمد سرہندی سے شاہ جہاں کے بیٹے عالمگیر کی عقیدتمندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عالمگیر بڑا پاکدامن اور پرہیزگار بن گیا تھا۔ وہ شراب کے پاس پھٹکتا نہیں تھا۔ نہ عیاشی کی اس کو لت تھی اور نہ اپنے ذاتی مصارف میں روپیہ ضائع نہ کرتا تھا بلکہ اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں سی سی کر اپنی روزی کماتا تھا اور نہایت سادہ لباس پہنتا تھا۔ اس کو ناچ گانے سے بڑی نفرت تھی۔ تخت پر بیٹھتے ہی اربابِ نشاط جو ان کے باپ کے زمانے کے تھے ملازمت سے علیحدہ کر دیے گئے۔ ان لوگوں نے احتجاجی طور پر ایک جنازہ کا جلوس نکالا جس کو اٹھا کر وہ روتے پیٹتے جھروکے کے نیچے سے نکلے۔ اس پر جب عالمگیر کی نظر پڑی تو اس نے دریافت کیا یہ کس کا جنازہ ہے۔ انہوں نے جواب دیا فن موسیقی کا۔ ہم اُسے گاڑنے جا رہے ہیں۔ عالمگیر نے کہا ذرا گہرا گاڑنا تاکہ پھر اُبھرنے نہ پائے۔[۱]

مآثر عالمگیری میں ہے کہ عالمگیر نے اپنے اٹھارویں جلوس ۱۰۸۵ھ میں تمام منجموں کو جو بادشاہ اور شاہزادوں اور صوبہ داروں کے پاس ملازم تھے موقوف کر دیا تھا۔ بلکہ اس حکم کی تعمیل اس سختی سے کی گئی تھی کہ اس کے مقرب خاص بختاور خاں تک سے مچلکے لکھوا لئے تھے کہ آئندہ تقویم (جنتری) ہنگ نہ بنایا کریں گے۔ حالانکہ حسابوں کی صحت کے لئے سرکاری دفتروں میں جنتریوں کا موجود رہنا ایک ضروری امر تھا اور مذہب کی رو سے ممانعت بھی نہیں تھی مگر افراطِ تشرع سے اس کا رکھنا اور دیکھنا بھی موقوف کیا گیا۔[۲]

---

[۱] سیر المتاخرین جلد اول ص ۴۱۸ [۲] سفرنامہ برنیر کا حاشیہ ص ۲۸۳

عالمگیر نے ۱۶۵۹ء میں شمسی سال جو آتش پرستوں کا ایجاد کیا ہوا تھا ختم کرایا اور مسلمانوں کے قمری سال کو رائج کیا جو اب تک جاری ہے۔ اس نے ایک ملا مقرر کیا جو تمام مملکت سے قمار بازی اور شراب خوری کے مقامات تلاش کر کے نیست و نابود کر دیتا تھا[۱]

عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری مرتب کرا کے اسلامی دنیا پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس نے ہندوستان بھر کے مشاہیر علماء کو حکم دیا کہ وہ تمام فقہ کی کتابوں سے مفتیٰ بہا مسائل کا انتخاب کر کے ایک کتاب تیار کریں۔ ان علماء کے گروہ کے صدر شیخ نظام صاحب تھے اس کام کو انجام دینے کے لئے عالمگیر نے علماء کے وظائف اور دوسرے اخراجات منظور کئے چنانچہ اس کتاب کی تیاری پر دو لاکھ روپے صرف ہوئے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے علماء و طلباء کو تقریباً تمام کتب فقہ سے بے نیاز کر دیا ہے۔[۱]

عالمگیر نے تمام زندگی حلال اور اپنی محنت کی کمائی سے شکم پری کی۔ اس نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی جو ٹوپیاں سی کر میں فروخت کرتا تھا اس کے ساڑھے چار روپے میرے کفن پر خرچ کرنا اور قرآن مجید لکھ کر جو میں نے آٹھ سو پانچ روپے جمع کئے ہیں انہیں محتاجوں میں تقسیم کر دینا

الغرض اکبر نے اسلام کو تباہ و نیست و نابود کرنے میں جو خطرناک مشرکانہ ملحدانہ طریقے رائج کئے تھے ان کا خاتمہ ایک مرد مومن حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں سے ہوا۔ اور اسلام پھر اپنی سابقہ شان و شوکت اور روایات و عقائد کے ساتھ ہندوستان میں عالمگیر کے عہد تک طاقتور بنا۔

ہندوستان کے مذاہب اور خاص طور پر اسلام پر دوسرا حملہ وسیع اسکیم کے تحت غیر ملکی پرتگیزیوں اور انگریزوں نے حکومت کے زعم اور برطانوی، امریکی اور جرمنی مشنری سوسائٹیوں

---

[۱] مفتاح التاریخ صفحہ ۹۱ [۲] مآثر عالمگیری صفحہ ۳۸۷

کے ذریعہ کیا تھا اور پرتگالی و پرتگیزی دور سے لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت تک پرتگیزیوں اور انگریزوں نے ہندوستان کے مذاہب کو نیست و نابود کرنے اور ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لئے انتھک کوششیں کیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد کے دور میں کامیابی حاصل کی

اس سکیم کی ابتدا پرتگالی دور میں بڑی ہیبتناک طریقہ پر ہوئی۔ چوتھی صدی عیسوی میں کچھ شامی خاندان کے عیسائی ہندوستان کے ساحل مالا بار پر آباد ہو گئے تھے۔ مالابار کے راجاؤں نے ان سے بہت اچھا سلوک کیا اور یہاں تک ان کو مراعات دیں کہ شامی عیسائیوں کے تمام فوجداری اور دیوانی مقدمات کا فیصلہ خود ان کے بشپ کرتے تھے۔

اس وقت پرتگالیوں کا یہ دستور تھا کہ وہ جس علاقہ پر قبضہ کرتے اس کے حاکم اور اس کے اہل و عیال کو اسیر کر کے عیسائی بنا کر لسبن دار السلطنت میں بھیجدیتے تھے چنانچہ علاقہ بر چول کے حاکم فرمان خاں اور اس کی بیٹی کو زبردستی نصرانی بنا کر گوا کے پرتگیزی وائسرائے ولسکو دی گاما نے لسبن روانہ کر دیا تھا۔ (تاریخ ہند ذکاء اللہ)

خاص طور پر پرتگیزیوں کے پادریوں کی عجیب حالت تھی۔ مذہبی جنون میں وحشی بنے ہوئے تھے۔ وہ کسی کے مذہب میں مداخلت کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کو ادائے فرض سے جابرانہ طریقوں سے روکتے تھے۔ مسلمانوں کی مسجدیں مسمار کر دیتے تھے اور ان کو پکڑ کر قید میں ڈالدیتے تھے اور مذہب کو تبدیل کرنے کے لئے زور دیتے تھے۔ اگر وہ مذہب کو تبدیل کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے تو ان کو موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ مروانے کا طریقہ کیا ہوتا تھا وہ گوا آکے سیاح وزیر نامی کے صفحات میں پڑھیئے وہ لکھتا ہے:

"میں ایک دن صبح کو اس مقام پر گیا جہاں پادریوں کا دار القضا بنا ہوا تھا۔ دار القضا کیا تھا مقتل گاہ تھا۔ بازار کے بیچ میں ایک بڑا بھاری انجن سولی کی طرح کھڑا کیا

تھا جس پر ایک چرچ لگا ہوا تھا۔ انجن پر بھیجنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اس کو اسٹراپیڈو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سزا پہنچانے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک بڑا شہتیر بلندی پر لگا ہوا تھا اس پر انسان کو کھینچ کر چڑھاتے تھے اور وہاں سے اسے گرا دیتے تھے جس کی ضرب سے اس کی ہڈیاں چور چور ہو جاتی تھیں۔ وہیں تھوڑے فاصلہ پر اوپر دار کو جزیرہ تھا جہاں پادری کے فتوے کے مطابق لوگوں کو زندہ آگ میں جلا دیا جاتا تھا جس کے لئے یہ سزا تجویز ہوئی تھی اس کو دارالقضا سے خوفناک بھتنے اور شیطان کا لباس پہنا کر لاتے تھے اور جلاد کے حوالے کر دیتے تھے۔ بازار میں علاوہ سور کے گوشت کے دوسرے گوشتوں کی ممانعت تھی۔ جو مسلمانوں کی پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی [۱]

انگریزوں نے اکبر و جہانگیر کے درباروں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا تھا اور اپنے لئے آسانیاں بھی مہیا کر لی تھیں۔ شاہجہاں کے عہد میں انہوں نے ہوگلی کی کھاڑی کی طرف جو پرگنے تھے اس پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور وہاں کی رعایا کو زبردستی اور روپے کا لالچ دے کر عیسائی بنا کر فرنگستان بھیجنا شروع کر دیا۔ اگرچہ رعایا کے کم ہو جانے سے اجارہ کا روپیہ ان کو گرہ سے بھرنا پڑتا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس فعل سے باز نہیں آتے تھے۔ ان کی یہ کارروائی دیہات تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ دریا کے کنارے پر جو آدمی ملتا اس کو پکڑ کر فرنگستان بھیج دیتے تھے [۲] مرنے والوں کا مال ضبط کرنا، متوفی کے نابالغ ہندو مسلمان بچوں کو عیسائی بنا کر غلام بنانا۔ ناواقفیت اور غلطی سے داخل ہونے پر ہندو فقیر کو تکلیف دے کر مار ڈالنا اور مسلمان فقیروں کو قبر میں دفنانا ان کا شیوہ بنا ہوا تھا [۳]

اس ظلم کا انسداد آخر شاہجہاں بادشاہ کو کرنا پڑا۔ اس نے ان لوگوں کو سخت سزائیں دیں۔ عالمگیر کے دور میں بھی پرتگیزیوں کا یہی ظالمانہ طور طریقہ جاری تھا۔ منشی ذکاءاللہ صاحب

---

[۱] تاریخ بیجاپور جلد ۶ [۲] بادشاہ نامہ [۳] تاریخ خفی خاں

نے اپنی تاریخ ہند میں اس کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"پرتگیزی سمندر کے کنارے نیا در ہند ہگلی کے قریب رہتے تھے مسلمانوں کے لئے ایک خداپورہ آباد کیا تھا۔ نماز بلا تشویش کے کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ان کے تعلقہ میں رعایا کا کوئی آدمی مرجاتا اور اس کا کوئی نابالغ لڑکا ہوتا اور بڑا بالغ لڑکا نہ ہوتا تھا تو اس کے بچوں کو اپنی سلطنت کا بیت المال سمجھ کر اپنے گرجا میں لے جاتے تھے۔ پادری ان کو عیسائی مذہب کی باتیں سکھاتا تھا خواہ وہ ہندو ہوتا یا مسلمان اس کو عیسائی بنالیا جاتا تھا اور غلاموں کی طرح ان سے خدمت لی جاتی تھی سنہ ۱۱۰۵ھ میں کچھ مسلمان حج کو جارہے تھے۔ ان کو گرفتار کیا۔ واپسی پر گنج سوآلی عالمگیری جہاز پر قبضہ کر کے اس کو لوٹا اور جتنے مسلمان جہاز پر تھے ان کو برہنہ کیا اور مستورات کی بیحرمتی کی جس کی وجہ سے مستورات نے سمندر کی تہ اور خنجر کی دھار کے نظر ہونا منظور کیا[1]"

عیسائی مذہب کو پھیلانے کے لئے پرتگیزیوں اور انگریزوں نے بڑے رنگیک ہتھکنڈے استعمال کئے۔ اپنی لڑکیوں کو بادشاہوں کے حرم میں پہنچانے سے گریز نہیں کیا جو وہ بادشاہوں کی بیویاں بنیں۔ چنانچہ اکبر بادشاہ کی بیوی مریم زمانی، عالمگیر کی بیوی مسیح النسا، شاہ عالم کی بیوی مس ہنری اور نصیر الدین حیدر شاہ کی بیوی مخدرہ عالیہ ہوئیں جو عیسائی مذہب پھیلانے کا باعث بنیں۔

مغلیہ دور میں عیسائی اپنے مذہب کی تبلیغ ہندوستان میں بڑی جانفشانی اور تندہی سے کرتے تھے لیکن اس میں ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر برنیر اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔

"... کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں اس معاملہ کے شوق میں اس قدر محو ہو گیا ہوں

---

[1] تاریخ ہند ذکاء اللہ ہشتم صـ۲۱۲

کہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جس قدر حواریوں کے ایک دفعہ کے وعظ سے ایک اثر عظیم ہوتا تھا۔ اتنا ہی اس زمانہ کے مشنری لوگوں کے وعظ سے بھی ممکن ہے کیونکہ بت پرست اور کافر لوگوں کے ساتھ ملتے جلتے رہنے کے باعث ان کے دلوں کی تاریکی سے مجھے اس قدر واقفیت ہو گئی ہے کہ ہرگز یقین نہیں کہ دو یا تین ہزار آدمی ایک دن میں ایمان لے آئیں، خصوصاً مسلمان بادشاہوں اور ان کی مسلمان رعایا سے تو کسی طرح بھی تبدیلی مذہب کی امید نہیں اور چونکہ ممالک ایشیا کے وہ سب مقامات میرے دیکھے ہوئے ہیں جہاں مشنری لوگ مقیم ہیں اس لئے میں اپنے تجربہ کی رو سے کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں کی خیرات اور تلقین کا اثر مشرکوں ہی پر ہونا ممکن ہے اور یقین نہیں کہ دس برس میں بھی ایک مسلمان عیسائی ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان انجیل کو مانتے ہیں اور مسیح علیہ السلام کا ذکر بغیر نہایت ادب و تعظیم کے نہیں کرتے اور بلا لفظ حضرت صرف عیسیٰ کبھی نہیں کہتے اور ہماری طرح اس کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ معجزانہ طور پر کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور یہ کہ وہ کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے۔ لیکن یہ امید کرنا عبث ہے کہ وہ اپنا دین جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں، چھوڑ دیں اور اپنے پیغمبر کے برحق نہ ہونے کو مان لیں مگر باوجود ان سب باتوں کے پھر بھی فرنگستان کے عیسائیوں کو چاہیئے کہ مشنری لوگوں کی ہر ایک طرح سے مدد کریں اور ان کی دعا ان کی طاقت اور دولت اور اپنے نجات دہندہ (عیسیٰ السلام) کے جلال میں بڑھانے میں صرف ہونی چاہیئے مگر اس خرچ کا متحمل اہل یورپ کو ہونا چاہیئے"[1]

یہ وہ دور تھا جبکہ مسلمان اقتصادی، اخلاقی، مذہبی، معاشی اور تنظیمی حالت میں بہت مستحکم تھا اور اس کی ایمانی قوت کا دشمن بھی لوہا مانتا تھا لیکن عالمگیر بادشاہ کے انتقال کے بعد مسلمانوں کا ہندوستان میں اقتدار ختم ہوتا چلا گیا۔ عوام کی اخلاقی معاشی

---

[1] سفرنامہ برنیر جلد دوم ص ۳۲۳

و تنظیمی حالت بھی گرتی اور خراب ہوتی چلی گئی۔ مذہب سے وہ لگاؤ نہیں رہا جو ایک مسلمان کو ہونا چاہیئے۔ ذہن بہت پست ہو گئے اور بے حسی اور بے بسی طاری ہو گئی۔

انگریزوں کا ۱۸۰۱ء میں مدراس پر قبضہ ہو گیا تھا ان کا طریقہ یہ تھا کہ جس مقام پر قبضہ کرتے وہاں برطانوی امریکی اور جرمنی عیسائی مشنریوں کی ٹڈی دل فوج شہروں قصبوں، دیہاتوں، جنگلوں، پہاڑوں، بازاروں اور محلوں میں پھیل جاتی تھی اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتی تھی۔ سکول کھولے جاتے، ہسپتال قائم ہوتے، طالب علموں اور مریضوں میں نصرانیت کی حقانیت ثابت کی جاتی اور اسلام کی تکذیب و تحقیر کی جاتی تھی اور ان کاموں میں حکمراں بھی حصہ لیتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں تعلیم کے نام پر حاکم اعلیٰ گورنر نے نصرانیت کا پروپیگنڈہ سکولوں میں شروع کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں کلکتہ کے اندر لوٹ مار ہوئی تو میر جعفر سے جرمانہ وصول کیا گیا۔ اس جرمانہ سے کلکتہ میں فری سکول قائم کیا گیا۔ اس کے مہتمم گورنر مقرر ہوتے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست اس اسکول میں تھا اس مدرسہ کی تعلیم کی غرض یہ تھی کہ اس میں ہر قوم کا وہ بچہ جس کی عمر پانچ سال سے دس سال تک ہوتی داخل ہو سکتا تھا اور ہر طالب علم کے لئے یہ لازم قرار دیا گیا تھا کہ وہ عیسوی دعاؤں میں شامل ہو اور بائیبل کی تعلیم ضرور حاصل کرے۔

اس مدرسہ کے علاوہ اس زمانہ میں جو بھی مدرسہ قائم ہوا اس میں نصرانیت کی تعلیم حاصل کرنا ضروری تھا چنانچہ بشپ کالج کلکتہ ۱۸۱۹ء میں قائم ہوا۔ اس کے ہر طالب علم کو یہ قسم کھانی پڑتی تھی کہ وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مشنری کے کاموں میں حصہ لے گا۔

مشن سکولوں میں لڑکوں کو انجیل پڑھا کر ان سے سوال کیا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے اور نجات دلانے والا کون ہے۔ عیسائی مذہب کے مطابق جواب دینے والوں

کو انعام دیا جاتا تھا۔ مشن کے سینکڑوں سکولوں میں داخل ہونے کے لئے حکام ضلع ترغیب دیتے تھے اور سکولوں میں جاکر دیکھتے تھے کہ کون کون شامل ہوا۔ اگر لوگ بچوں کو شامل نہیں کرتے تھے تو مجبور کیا جاتا تھا اور حکماً داخل ہونا پڑتا تھا۔[1]

انگریزی تعلیم دینے کی غرض ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کرنا تھی۔ چنانچہ آنریبل مسٹر چارلس گرانٹ ڈائرکٹر کمپنی جو ہندستان میں انگریزی زبان جاری کرنے کے حامی تھے وہ اس کی غایت یہ بیان کرتے ہیں[2]

"یہ بالکل انگلستان کے اختیار میں ہے کہ وہ ہندوؤں کو بتدریج ہماری زبان سکھائے اور بعد میں اسی کے ذریعہ ہمارے فنون فلسفہ مذہب کی تعلیم دے۔ مگر بلاشبہ سب سے اہم تعلیم جو ہندوؤں کو ہماری زبان کے ذریعہ ملے گی وہ ہمارے مذہب کی معلومات ہونگی۔ مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانہ میں ہندوستان کے کیرکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا . . . لیکن ہمیں ہندوستانیوں کو سچے مذہب (مذہب عیسوی) سے اور بہترین اخلاق سے اور علوم و فنون کے اصول سے محروم نہیں کرنا چاہیئے۔"

سابقہ ہندوستان میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی ہندو عیسائی ہوتا تھا اس کو شاستر کے مطابق ہندو محروم الارث کر دیتے تھے جس سے پادریوں کو آسانی کے ساتھ ہندوؤں کو عیسائی بنانے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ لارڈ ریڈنگ نے اس پریشانی کا سد باب کرنے کے لئے ایکٹ ۱۸۵۰ء نافذ کیا۔ اگر کوئی ہندو عیسائی ہو جائے تو وہ اپنے حقوق اور وراثت سے محروم نہ ہو سکے گا۔

انگریزی حکام نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مخصوص مذہبی نشانوں کو مٹانے کی

---

[1] اسباب بغاوت ہند [2] مسلمانوں کا روشن مستقبل

بھی کوشش کی ۔ اور ۱۸۰۶ء میں پہلی بار بمقام ویلور مدراس میں سر جان کر اور ایک کمانڈر انچیف نے اپنے فوجی قوانین میں تین باتوں کا اضافہ کیا اور حکم دیا کہ ہندوستانی فوجی ماتھے پر تلک نہ لگائیں ۔ ڈاڑھیاں منڈائیں اور اپنی ہندوستانی وضع کی ٹوپیوں کو چھوڑ کر انگریزی ہیٹ پہنیں ۔

اسی پر بس نہیں کیا جاتا تھا بلکہ حکام شہر اور افسران فوج اپنے ماتحتوں سے مذہبی باتیں کرتے تھے ۔ اپنی کوٹھیوں پر بلا کر پادریوں سے مذہب کی تلقین کراتے تھے اور چھوٹی نوکریوں کے لئے یہ ضروری قرار دیدیا گیا تھا کہ سرٹیفکٹ پر ڈپٹی انسپکٹروں کے دستخط ہونے ضروری ہیں ۔ یہ ڈپٹی انسپکٹر زیادہ تر مشنری ہوتے تھے جن کو ہندوستانی لوگ کالا پادری کہتے تھے ۔ اگر سرٹیفکٹ پر ان ڈپٹی انسپکٹروں کے دستخط نہیں ہوتے تھے تو نوکری نہیں ملتی تھی ۔

یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور ان کے علاوہ کتابیں ، پمفلٹ اور اخبارات بھی شائع ہوتے تھے اور ان میں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر حسب ذیل الزامات عیسائی مشنری علی الاعلان لگاتے تھے ۔

(۱) قرآن مجید اصلی نہیں ہے اس میں تحریف و تبدیلی ہوئی ہے ۔

(۲) قرآن مجید میں کوئی نئی چیز نہیں ہے ۔ توریت و زبور سے سرقہ کی گئی ہے اس کے علاوہ اس میں جو کچھ ہے وہ بیہودیوں کی (نعوذ باللہ) خرافات ہے ۔

(۳) نبی کی نبوت کے لئے معجزے ضروری ہیں ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معجزے کا ظہور نہیں ہوا ۔ اس بنا پر وہ (نعوذ باللہ) نبی نہیں تھے ۔

(۴) کتاب مقدس کے مطالب قرآن و حدیث کے خلاف ہیں ۔ اس لئے قرآن کتاب الٰہی نہیں ہے ۔

(۵) اسلام جھوٹ کی تعلیم دیتا ہے ۔

(۶) اسلام جہاد (بزورِ شمشیر) کے ذریعہ پھیلا ہے۔

(۷) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی نہیں آتی تھی بلکہ وہ صرع کی بیماری تھی جس میں (نعوذ باللہ) وہ مبتلا تھے۔

(۸) حضور اقدس کی ذات اقدس پر شرمناک، ناز یبا الزامات و حملے

(۹) ازواج مطہرات کی ذات پر ناپاک الزامات۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر عیسائی مشنریوں کے الزامات کا انداز انتہائی بھونڈا اور غیر شریفانہ ہوتا تھا۔ جن کی دو مثالیں کتاب تلخیص الاحادیث مؤلفہ پادری عماد الدین سے نقل کی جاتی ہیں اور یہی انداز تمام عیسائی مشنری اپنی کتابوں، پمفلٹوں، اخباروں، رسالوں اور تقریروں میں اختیار کرتے تھے۔

(نعوذ باللہ) آپ نفسانی لذائذ خاص کر شہوت کے ایسے پابند تھے کہ گویا دنیا میں اسی کام کے لئے آئے تھے۔ کنیزک اور باندی سے نکاح نہ کرنا۔ بے نکاح اس سے ہم بستر ہونا جو عورت حضرت کو پسند نہ کرے اس کو جبراً جورو بنانا (یہ کام حضرت کا تھا) نعوذ باللہ۔

ایک روز جمعہ کے دن محمد صاحب اس (اپنی بیوی جویریہ) کے پاس آئے۔ مطلب ہم بستر ہونے کا تھا۔ مگر عورت روزہ سے تھی اور روزہ کی حالت میں صحبت کرنا جائز نہیں ہے۔ حضرت نے اس کا روزہ اس حیلے سے افطار کرایا۔ اس سے کہا کہ کل جمعرات کو بھی روزہ رکھا تھا کہ نہیں۔ کہا نہیں رکھا۔ فرمایا۔ اب روزہ توڑ ڈال اور صحبت کر (نعوذ باللہ)

عیسائی مشنری سر بازار علی الاعلان چیلنج کرتے پھرتے کہ ان الزامات کا جواب دو، جواب دینا تو کجا مسلمان ان ناقابل برداشت الزامات کو سنتا تھا اور خاموش ہو جاتا تھا، پہلے رسول کی عزت و آبرو کی خاطر اپنی جان و مال اور آل اولاد کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس وقت اس کو اپنی جان زیادہ پیاری تھی۔ اس لئے عیسائی مشنری ان پر حاوی ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے خاندان کے خاندان عیسائی بننے پر آمادہ ہونے لگے تھے۔ چنانچہ عماد الدین

پانی پتی مع اپنی اولاد کے عیسائی ہو گئے اور ان کے باپ چراغ الدین اور ان کے بھائی خیر الدین نے بھی عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اور صفدر علی، رجب علی بھی اسلام کو خیر باد کہکر عیسائی بن گئے تھے۔ برنیر نے کہا تھا "یقین نہیں کہ دس برس میں بھی ایک مسلمان عیسائی ہو جائے"! لیکن یہاں اس کے برعکس عمل ہو رہا تھا۔

مگر اس پر آشوب زمانہ میں اللہ کے نیک بندے اور شمع توحید کے پروانے بھی تھے مولانا آل حسن صاحب نے انہیں حالات میں ۱۲۵۹ھ میں ردّ نصاریٰ میں ایک کتاب "استفسار" شائع کی جس میں پادری فانڈر کی کتاب میزان الحق کے اعتراضات کے جوابات بھی تھے

اس کے بعد مولانا رحمت اللہ صاحب نے کتب ردّ نصاریٰ لکھی لیکن انہوں نے اس پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ آگرہ میں پادری فانڈر کی کوٹھی پر اسلام کی حقانیت ثابت کرنے اور عیسائیت کی تکذیب کرنے کے لئے پہنچے اور اس کو مناظرہ کی دعوت دینے گئے وہ نہیں ملا تو خط و کتابت سے مناظرہ طے کیا۔ چنانچہ اپریل ۱۸۵۴ء میں دو روزہ تاریخی مناظرہ آگرہ میں پادری فانڈر سے ہوا۔ جس میں پادری فانڈر کو ماننا پڑا کہ انجیل مقدس میں تحریف ہوئی ہے۔ اس مناظرہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے شریک ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب تھے [۱]

اس تاریخی مناظرہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ہر قوم میں بیداری پیدا ہوئی۔ کروٹ لی اور یہ مناظرہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی

---

[۱] ہندوستان میں اسلام کو ختم کرنے کے لئے جو دوسرا حملہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے ہوا اس کا خاتمہ مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے حامیوں نے کس طرح کیا اس کی پوری کیفیت میری تالیف "فرنگیوں کا جال" میں پڑھئے

ابتدا کا باعث بنا اور مولانا رحمت اللہ صاحب بھی اس جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہیرو بنے اور انہوں نے ایک رہنما کے طور پر اس میں حصہ لیا اور اسی کے ساتھ انہوں نے جبکہ مرکز اسلام مکہ معظمہ میں علم کی شمع بجھنے لگی مدرسہ صولتیہ کی بنیاد رکھی جس کا آج سعودی عرب کی مشہور درسگاہوں میں شمار ہوتا ہے اور افضلیت کا درجہ اسی کو حاصل ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے پیروکاروں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا اشرف الحق صاحب، مولانا ابو المنصور صاحب، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری وغیرہ حضرات کی جدوجہد اور ان کی قلم و زبان نے عیسائی مشنریوں کے منصوبوں کو خاک میں ملادیا اور ہندوستان کے مسلمانوں پر جو دوسرا حملہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے کیا گیا تھا وہ بھی ناکام بنادیا گیا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب اور اُن کے حامیوں نے کتابوں کا جواب کتاب سے۔ اخبارات کا جواب اخبارات سے مشنری سوسائٹیوں کا جواب تبلیغی جماعتوں سے دیا اور مناظروں میں مقابلے کرکے دنداں شکن جوابات دے کر اُن کے غرور و تمکنت اور مکر و فریب کی قلعی کھولی۔

گارساں دتاسی جو اپنے خطبوں میں مشنریوں کی کوششوں کو بڑا سراہتا تھا۔ اور ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتا تھا وہ مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے تبلیغی اثرات کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوگیا۔ چنانچہ اپنے خطبہ میں لکھتا ہے

"یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے کہ ہندو لوگ زمرہ اسلام میں شامل ہو رہے ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض عیسائی نہ معلوم کیوں اسلام قبول کر رہے ہیں اردو کے اخبار "چشمہ علم" میں ان یورپینوں کے اسلام قبول کرنے کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ لوگ مدراس کی ایک مسجد میں جمع ہوئے اور مسلمان ہوگئے اور نماز میں مسلمانوں کے ساتھ شرکت کی۔ ایک سوٹزرلینڈ کے باشندے نے کمال کیا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے اسلام قبول کیا بلکہ اب مشرقی لباس زیب تن کئے ہوئے بتدیل کھنڈ میں

تبلیغ کرتا پھرتا ہے۔ مجمعوں میں تقریریں کررہا ہے اور قرآن مجید کے مطالب اردو میں بیان کررہا ہے۔" [۱]

آخر میں دتاسی کو مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے حامیوں کی مخلصانہ کوششوں کی کامیابی اور مشنریوں کی جدوجہد کی ناکامی کا اعتراف صاف لفظوں میں کرنا پڑا۔ وہ تحریر کرتا ہے [۲]

"ہندوستان میں ان مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے دین مسیحی قبول کیا ہو۔" [۳]

ایسے مرد مجاہد اور معمار اسلام مولانا رحمت اللہ صاحب کے حالات زندگی لکھنے کی خواہش مجھ کو عرصہ سے تھی۔ چاہتا تھا کہ ان کے حالات پر ایک جامع کتاب لکھوں اس کتاب کے لئے کچھ مواد بھی فراہم ہوگیا تھا اور "فرنگیوں کا جال" طبع ہوچکی تھی۔ اسی اثنا میں ۱۹۵۳ء میں علامہ مولانا محمد سلیم صاحب نبیرہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم و مغفور ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بھی مولانا رحمت اللہ صاحب کے حالات پر کتاب لکھنے کی طرف توجہ دلائی جس سے میرا ارادہ اور پختہ ہوگیا۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کا میرے والد ماجد مولوی شرف الحق صاحب سے خاص تعلق تھا۔ میرے والد ماجد کا شمار ردِ نصاریٰ کے سلسلہ میں انکے شاگردوں میں ہوتا ہے اس بنا پر بھی میرا فرض تھا کہ میں ان کے ناقابل فراموش مجاہدانہ اور تعلیمی کارناموں کو دنیا کے سامنے لاؤں۔

---

[۱] خطبات گارساں دتاسی، ۲۰ دسمبر ۱۸۶۹ء صفحہ ۱۸ [۲] خطبات گارساں دتاسی خطبہ، دسمبر ۱۸۶۳ء صفحہ ۳۰۲ [۳] ضمیمہ صفحہ ۱۲۶

گارساں دتاسی کٹر قسم کا عیسائی تھا۔ ہندوستان کے مشنریوں کے کارناموں کو فاتحانہ انداز میں لکھتا تھا۔ اور اس کی بڑی خواہش تھی کہ ہندوستان میں عیسائی مذہب پھیلے۔ اسکی قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں۔

میں نے چھ سات سال میں "آثار رحمت" کا کافی سے زیادہ حصہ مرتب کر لیا تھا کچھ حصہ باقی تھا کہ اس عرصہ میں میرے ایک کرم فرما حیدرآباد دکن سے دہلی تشریف لائے ان کا نام نامی کیا لکھوں۔ ان کو میں قابل اعتبار بزرگوں میں سمجھتا تھا۔ وہ مجھ سے یہ مسودہ لے کر حیدرآباد چلے گئے۔ میں نے ان کو یہ مسودہ اس لئے دیدیا تھا کہ ان کی نظر سے گذر جائے گا اور اس میں جو کمی یا جو خامیاں ہونگی ان کی توسل سے دور ہو جائیں گی۔

میری تمام توقعات پر ان بزرگ نے پانی پھیر دیا۔ بہت تقاضوں اور کافی برسوں کے بعد یہ مسودہ میرے پاس آیا۔ وہ کس حالت میں تھا۔ اس کو دیکھ کر دل کو ایک زبردست دھکا لگا اور یقین ہو گیا کہ یہ دنیا اور اس میں رہنے والے قابل اعتبار نہیں ہیں۔ اس مسودہ میں سے کافی صفحات غائب تھے اور کافی صفحوں پر شاید بلّی کے پنجے یا کسی اور جانور کے پنجے لگے ہوئے تھے جن کی عبارت پڑھی نہیں جاتی تھی۔ سوائے صبر کے اور میں کیا کرتا۔ ضائع شدہ صفحات کا مواد فراہم کیا۔ جو عبارت پڑھی نہیں جاتی تھی اس کو بمشکل تمام دوبارہ تحریر کیا۔ اس میں کتنی پریشانی اور دقت مجھ کو اٹھانی پڑی وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ گویا یہ کتاب مجھ کو دوبارہ لکھنی پڑی۔

اگست ۱۹۶۴ء کو مولوی شمیم صاحب مکہ معظمہ سے دہلی تشریف لائے۔ انھوں نے "آثار رحمت" کے مسودہ کو دیکھنے کے لئے مجھ سے بڑے تقاضے کئے۔ میں نے ان ایام میں بھی ان حیدرآبادی بزرگ کو بار بار خط لکھے انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی اور مولوی محمد شمیم صاحب کے جانے کے چند مہینوں کے بعد اس مسودہ کے دیدار نصیب ہوئے۔

لیکن مولوی محمد شمیم صاحب کے آنے کے بعد ایک پرانی خواہش کی ضرور تکمیل ہو گئی کیرانہ جیسی قابل احترام سرزمین کو دیکھنے کی بڑی تمنا تھی اور جس محلہ میں مولانا مولوی رحمۃ اللہ صاحب قیام فرماتے تھے اس کو بھی دیکھنے کا آرزومند تھا۔ مولوی محمد شمیم صاحب جب دہلی سے کیرانہ جانے لگے تو میں بھی ان کے ہمراہ ۱۶ ستمبر ۱۹۶۴ء کو روانہ ہوا۔ اس سفر

کے حالات میں نے متحدہ محاذ ، ۲۱ ستمبر ۱۹۶۷ء میں لکھے ہیں ۔ اس کے ضروری اقتباس ملاحظہ ہوں ۔

پروگرام کے مطابق ۱۶ ستمبر ۱۹۶۷ء کو میں اور مولوی شمیم صاحب دہلی ریلوے اسٹیشن سے بذریعہ بس کاندھلہ کے لئے دن کے ۹ بجے روانہ ہوئے ۔ بس بارہ بجے دن کے کاندھلہ پہنچی ۔ محلہ مولوی صاحبان کے بڑے گھر میں مقیم ہوئے ۔ یہ گھر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہیرو مولانا نورالحسن صاحب کا ہے جن کے مولانا رحمت اللہ سے دیرینہ تعلقات تھے اور اس بڑے گھر میں مولوی شمیم صاحب کے ننھیالی رشتہ دار بابو اعجازالحسن صاحب رہتے ہیں جن سے مولوی شمیم صاحب کی خالہ کی لڑکی بیاہی گئی ہیں ۔ بابو اعجازالحسن صاحب کے بڑے بھائی مولوی مصباح الحسن صاحب اور مولوی احتشام الحسن صاحب ، مولوی اظہارالحسن صاحب ، مولوی افتخارالحسن صاحب اور مولوی فریدالحسن صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ یہ حضرات مولانا نورالحسن صاحب کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں ۔ مولوی احتشام الحسن صاحب کئی دینی اور مذہبی کتابوں کے مصنف ہیں ۔ حال میں آپ نے ایک اور کتاب "مشائخ کاندھلہ" تالیف فرمائی ہے ۔ مولوی افتخارالحسن صاحب مشہور واعظ و مبلغ ہیں ۔ دن رات تبلیغی کاموں میں مصروف رہتے ہیں ۔ بہت نیک و صالح بزرگ ہیں ۔ اس خاندان کا بڑا نادر و نایاب کتب خانہ ہے جس میں بڑی پرانی تاریخی و علمی قلمی کتابیں ہیں ۔ ان حضرات سے دن بھر تبادلۂ خیال ہوتا رہا ۔

دوسرے روز ۱۷ ستمبر کو ۹ بجے مولوی شمیم صاحب اور بابو اعجازالحسن صاحب کے ہمراہ بذریعہ تانگہ کیرانہ روانہ ہوئے ۔ گیارہ بجے دن کے کیرانہ پہنچے ۔ وہاں کے خاندانی حکیم کریم الٰہی صاحب خلف حکیم محبوب الٰہی صاحب " محلہ لبباطیان . . . . کے ہاں مقیم ہوئے ۔ وہاں سے غسل کر کے کھانا کھانے اور آرام کرنے کے بعد ، بعد ظہر محلہ دربار کلاں پہنچے ۔ جہاں مولانا رحمت اللہ صاحب کے مکانات تھے ۔ محلہ دربار کلاں حقیقتاً نواب مقرب خاں کی حویلی تھی جو ٹوٹ پھوٹ کر محلہ کی شکل

اختیار کر گئی ہے اور اس میں مکانات تعمیر ہو گئے ہیں۔ اس محلہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب ان کے بھائیوں اور ان کے پوتے مولوی محمد سعید صاحب ناظم اول مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے مکانات دیکھے۔ اس کے بعد دربار کی مسجد میں گئے وہاں عصر کی نماز پڑھی اس مسجد کو جہانگیر بادشاہ کی کنیز صاحب سلطان والدہ شیخ محمد فضل نے تعمیر کرایا تھا جن کو استانی جی کہا جاتا تھا جن کا تذکرہ اولیاءِ ہند جلد دوم میں ہے۔

اس مسجد کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مولانا رحمت اللہ صاحب نے عبادت الٰہی میں زندگی کا بیشتر حصہ گذارا تھا اور اسی میں اپنی مشہور تالیف ازالۃ الاوہام تصنیف فرمائی۔

اس مسجد میں بچوں کو فارسی عربی اردو ہندی کی درمیانی کتابوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نماز عصر پڑھنے کے بعد اس مسجد کے قریب ہی مولانا رحمت اللہ صاحب کا قبرستان ہے وہاں مولوی محمد شمیم صاحب کے ہمراہ پہنچے۔ فاتحہ پڑھی۔ اس قبرستان میں حضرت شاہ نجم الدین صاحب خلیفہ شاہ نظام الدین صاحب، حکیم علی اکبر خاں صاحب برادر خورد مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی) اور مولانا محمد سعید اور آپ کی اہلیہ گویا مولوی شمیم صاحب کے دادا اور دادی وغیرہ کے مزارات ہیں۔ مولانا محمد سعید صاحب کا انتقال ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ مطابق ۹ رجنوری ۱۹۳۹ء کو کیرانہ میں ہوا۔

اسی روز شام کو میں اور مولوی شمیم صاحب، بابو اعجاز الحسن، مولوی مصباح الحسن صاحب مولوی اظہار الحسن صاحب مولوی افتخار الحسن صاحب اور فرید الحسن صاحب کے ہمراہ پنجیٹھ گاؤں روانہ ہوئے۔ مغرب کے بعد گاؤں کی مسجد میں پہنچے

اس گاؤں میں ایک عظیم شخصیت چودھری حاجی محمد عظیم صاحب کی تھی جنھوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ ان کے پڑپوتوں سے ملاقات ہوئی۔ چودھری عظیم صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور وہ مقام

بھی دیکھا جہاں انگریزی فوج نے گاؤں کو محصور کرنے کے بعد گاؤں پر بمباری کرنے کے لئے توپ رکھی تھی مولوی شمیم صاحب نے جہاں کیرانے کے مقامات کے فوٹو لئے تھے وہاں انہوں نے اس گاؤں کے تاریخی مقامات اور چودھری حاجی عظیم صاحب کے مزار اور ان کے پڑپوتوں کا بھی فوٹو لیا تھا

"رات کو اس گاؤں میں آرام کیا۔ ۱۸ ستمبر کی صبح کو ۸ بجے ہنجیٹھ سے روانہ ہو کر دس بجے دن کے کیرانہ پہنچے اور محلہ دربار کلاں میں ٹھیرے۔ نماز جمعہ دربار کلاں کی مسجد میں پڑھی مولوی شمیم صاحب اپنے دادا مولانا محمد سعید اور دادی کے مزارات کی چار دیواری تعمیر کرانے میں مصروف ہو گئے اور جب وہ تعمیر ہو گیا۔ تو نماز عصر سے قبل اپنے دادا مرحوم کے مزار پر کتبہ مجھ جیسے ناکارہ اور گناہگار کے ہاتھوں سے لگوایا۔

۱۹ ار ۲۰ ستمبر کو کاندھلہ میں رہے اور وہاں مولانا نور الحسن صاحب کے کتب خانہ کی کتابیں میں نے اور مولوی شمیم صاحب نے دیکھیں۔ میں ۲۱ ستمبر کی صبح کو ۹ بجے بذریعہ بس دہلی کے لئے روانہ ہوا اور ساڑھے دس بجے کے قریب دہلی پہنچ گیا۔"

"ہندوستان کے حاجیوں کو مولوی شمیم صاحب سے انتہائی محبت و عقیدت ہے یہ بامروت اور با اخلاق ہیں اور مکہ معظمہ میں ان کا حاجیوں کے ساتھ انتہائی ہمدردانہ سلوک رہتا ہے۔ اس بنا پر عمر رسیدہ لوگ بھی ان کو قابل تکریم سمجھتے ہیں اور ان کو عزت محبت اور عقیدت کی نگاہ سے دیکھنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مکہ معظمہ جیسی بابرکت و مقدس جگہ پر یہ سکونت رکھتے ہیں جہاں بادشاہاں جہاں اپنی جبیں سائی کو نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔"

"ان ہر دو تعلق نے ہندوستان کے لوگوں کو شمیم صاحب کا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ دعوتوں کی بھرمار رہتی تھی۔ ملاقاتوں کے لئے لوگ ترستے تھے۔ ایک انسان کتنی دعوتیں کھائے اور کس کس سے ملے۔ سب کی خواہشیں پوری کرنا یقیناً اس کے لئے مشکل تھا۔"

"کاندھلہ، کیرانہ اور ہنجیٹھ کے سفر میں میرا اور شمیم صاحب کا ساتھ رہا ہے میں نے

وہاں بھی یہی عالم دیکھا۔ خوشی ہوئی کہ لوگوں میں اب بھی ایمانی قوت باقی ہے اور اللہ رسول سے محبت رکھتے ہیں"۔

اس چھ روزہ سفر میں کیرانہ اور پنجیٹھ کے مجاہدوں کے کارنامے اور حاجی محمد عظیم خاں صاحب کے خاندان کے حالات کا پتہ لگا اور مزید معلومات حاصل ہوئی جو "آثار رحمت" کے لئے کارآمد ثابت ہوئی

"آثار رحمت" کی ترتیب دینے میں مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط ایڈیٹر اخبار الجمعیۃ دہلی، مولانا محمد میاں صاحب صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب کشمیری سابق ممبر پارلیمنٹ، علامہ مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ، مولوی محمد شمیم صاحب نائب ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ۔ جناب تنویر علوی کیرانوی پروفیسر دہلی کالج دہلی نے حصہ لیا۔

حضرت العلامہ مولانا آل حسن موہانی صاحب کی وہ ذات گرامی ہے جنھوں نے ردّ نصاریٰ میں سب سے پہلی ایک جامع و مدلل و ضخیم کتاب "استفسار" تالیف فرمائی جس کو مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنی تالیف "ازالۃ الاوہام" کے حاشیہ پر نقل کیا ہے۔ چونکہ ردّ نصاریٰ پر کتاب لکھنے میں مولانا آل حسن صاحب کو **اولیت** کا درجہ حاصل ہے اس لئے میں نے ان کے نام نامی سے "آثار رحمت" کو معنون کیا ہے۔

میرے والد ماجد مولوی شرف الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانہ میں حسب ذیل کتب ردِ نصاریٰ اور کتب مشنری موجود ہیں۔ . . . .

ان کتب سے جو صاحب بھی استفادہ کرنا چاہیں وہ میرے غریب خانہ پر تشریف لاکر ملاحظہ فرمالیں۔ کتاب لے جانے کی خواہش کا اظہار براے مہربانی نہ فرمائیں۔ میں نے کتاب دینی بالکل بند کردی ہے۔

فہرست کتب ردّ نصاریٰ اور کتب مشنری

(۱) رسالہ ردّ نصاریٰ: ایک مولوی صاحب کا کسی ایک شخص عیسوی سے سوال و جواب مطبوعہ ۱۸۴۰ء

(۲) صولۃ الضیغم علیٰ اعداء ابن مریم ۔ مصنفہ مولوی عباس علی صاحب ۱۲۵۸ھ

(۳) استفسار ۔ مولانا آل حسن صاحب موہانی مطبوعہ ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء

(۴) جواب محمدیہ (قلمی رسالہ)

(۵) اعجاز عیسوی ۔ مؤلفہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی

(۶) اظہار الحق ۔ مؤلفہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی (فرانسیسی اور عربی زبان میں

(۷) تکمیل الادیان ۔ مؤلفہ مولانا محمد علی مونگیری

(۸) مرآۃ الیقین ۔ مؤلفہ مولانا محمد علی صاحب مونگیری

(۹) پیغام محمدی ۔ مؤلفہ مولانا محمد علی صاحب مونگیری

(۱۰) دافع التلبیسات ۔ مؤلفہ مولانا محمد علی صاحب مونگیری ۱۳۰۶ھ

(۱۱) تصدیق المسیح درع کلیم القبیح ۱۲۶۸ھ

(۱۲) میزان المیزان ۔ مؤلفہ مولانا ابو المنصور صاحب

(۱۳) مفتاح الابرار ۔ مؤلفہ 〃 〃 〃

(۱۴) لحن داؤدی 〃 〃 〃 〃

(۱۵) عقوبت الضالین 〃 〃 〃 〃

(۱۶) رقیمتہ الوداد 〃 〃 〃 〃

(۱۷) استیصال مسیح الدجال 〃 〃 〃 〃

(۱۸) انعام عام 〃 〃 〃

(۱۹) تصحیح التاویل 〃 〃 〃 〃

(۲۰) افحام الخصام 〃 〃 〃 〃

(۲۱) اعزاز قرآن 〃 〃 〃 〃

(۲۲) حرز جان 〃 〃 〃 〃

(۲۳) دولتِ فاروقی مولفہ مولانا ابوالمنصور

(۲۴) نوید جاوید ״ ״ ״ ״

(۲۵) تصدیق الاسلام ״ مولوی غلام نبی صاحب امرتسری

(۲۶) اعلام الاحبار والاعلام ان الدین عند اللہ الاسلام مولفہ مولانا عبد الباری

(۲۷) بشارت محمدی - مولفہ خواجہ عبد العزیز لکھنوی

(۲۸) ہدایت الکرستان - مولفہ واعظ الدین

(۲۹) تشویش القسیس - مولفہ مولانا ابوالمنصور

(۳۰) تحقیق الجہاد - مولفہ مولوی چراغ علی

(۳۱) تحفۃ الکرستان - مولفہ حسن علی خاں

(۳۲) صیانۃ الانسان عن وساوس الشیطان - مولفہ مولانا ولی اللہ صاحب لاہوری

(۳۳) تنزیہہ القرآن - مولفہ مولانا سید محمد صاحب

(۳۴) استبشار - مولفہ مولانا موئید الدین صاحب

(۳۵) البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف - مناظرہ اکبر آباد ۱۸۵۴ء

(۳۶) مباحثہ مذہبی حصہ اول - مناظرہ اکبر آباد ۱۸۵۴ء

(۳۷) مباحثہ مذہبی - حصہ دوم خط و کتابت مابین پادری فانڈر صاحب اور ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب - ۱۸۵۴ء (فارسی)

(۳۸) خط و کتابت مابین مولانا عبد الباری صاحب و پادری عماد الدین

(۳۹) حجۃ الاسلام - مناظرہ میلہ خدا شناسی شاہجہاں پوری

(۴۰) مناظرہ دہلی مابین مولوی شرف الحق صاحب صدیقی صابری اور پادری لیفرائے

(۴۱) مناظرہ حیدر آباد - مولوی شرف الحق صاحب

(۴۲) دافع البہتان - ہر دو جلد مولفہ مولانا شرف الحق صاحب

(۴۳) مناظرہ غازی پور ۔ مابین مولوی شرف الحق صاحب، پادری روفیس صاحب

(۴۴) استیصال دین عیسوی بمقابلہ دین محمدی ۔ مولفہ مولوی شرف الحق صاحب

(۴۵) طریق الحیات ۔ مولفہ پادری فانڈر صاحب ۱۸۱۷ء

(۴۶) اظہار عیسوی ۔ مولفہ پادری فانڈر صاحب ۱۸۶۳ء

(۴۷) نیاز نامہ ۔ مولوی صفدر علی صاحب ۱۸۶۷ء

(۴۸) تواریخ محمدی ۔ مولفہ پادری عماد الدین صاحب ۱۸۷۱ء

(۴۹) حل الاشکال ۔ مولفہ پادری فانڈر صاحب معہ مراسلات مابین پادری فانڈر صاحب ۔ و مولانا آل حسن صاحب

(۵۰) تعلیقات التعلیقات ۔ مولفہ پادری عماد الدین صاحب ۱۸۷۹ء

(۵۱) تعلیم محمدی ۔ مولفہ پادری عماد الدین صاحب ۱۸۸۰ء

(۵۲) من انا ۔ مولفہ پادری عماد الدین صاحب ۱۸۷۴ء

(۵۳) آثار قیامت ۔ مولفہ " " ۱۸۷۵ء

(۵۴) تحریف قرآن ۔ مولفہ ماسٹر پادری رامچندر صاحب

(۵۵) ابطال دین محمدی بمقابلہ دین عیسوی ۔ مدراس ٹریکٹ سوسائٹی ۱۸۵۴ء

(۵۶) تصدیق الکتاب مولفہ پادری ۔ ٹی ۔ جے سکاٹ

(۵۷) تشریف نسبتین مولفہ منشی پادری رجب علی صاحب ۱۸۶۷ء

(۵۸) الٰہی براہین ۔ مولفہ پادری یونس و پادری رجب علی ۱۸۶۴ء

(۵۹) مباحثہ مذہبی مرتبہ سید عبداللہ اکبر آبادی (پہلا حصہ فارسی)

"آثار رحمت" میں ... جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے ان کے نام یہ ہیں

(۱) تاریخ ہندوستان ۔ مولفہ منشی ذکاء اللہ صاحب

(۲) انوار العاشقین ۔ مولفہ مولوی مشتاق احمد صاحب انبیٹھوی

(۳) ایک مجاہد معمار - مؤلفہ مولوی محمد سلیم صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ
(۴) تاریخ فیروز شاہی مؤلفہ
(۵) سیر الاقطاب - مؤلفہ شیخ اللہ دیا صاحب
(۶) پانی پت اور بزرگان پانی پت - مؤلفہ مولانا محمد میاں صاحب
(۷) تزک جہانگیری - مصنفہ جہانگیر بادشاہ
(۸) اقبال نامہ جہانگیری - مؤلفہ مرزا محمد عرف معتمد خاں بخشی
(۹) خزینۃ الاصفیا - مؤلفہ مفتی غلام سرور صاحب لاہوری
(۱۰) فرنگیوں کا جال - مؤلفہ امداد صابری
(۱۱) طبقات اکبری - مؤلفہ خواجہ نظام الدین احمد
(۱۲) آثار الصنادید - مؤلفہ سرسید احمد خاں
(۱۳) تذکرہ کاملان رامپور - مؤلفہ حافظ احمد علی صاحب شوق
(۱۴) طبقات الشعراء - مؤلفہ مولوی کریم الدین صاحب
(۱۵) تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند - مؤلفہ مولوی ذکاء اللہ صاحب
(۱۶) پیغام محمدی مؤلفہ مولانا محمد علی مونگیری
(۱۷) حالات مشائخ کاندھلہ - مؤلفہ مولانا احتشام الحسن صاحب
(۱۸) تذکرۃ الصالحین - مؤلفہ قاری عبد الحلیم صاحب انصاری
(۱۹) اعجاز عیسوی - مؤلفہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی -
(۲۰) تذکرہ اولیاء ہند - مؤلفہ مرزا اختر صاحب
(۲۱) البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف - مؤلفہ حافظ عبد اللہ صاحب
(۲۲) منتخب التواریخ - مؤلفہ ملا عبد القادر صاحب بدایونی
(۲۳) اطبائے عہد مغلیہ - مؤلفہ کوثر چاندپوری صاحب

(۲۴) بادشاہ نامہ۔ مولفہ ملا عبد الحمید صاحب لاہوری

(۲۵) مآثر الامراء۔ مولفہ شاہ نواز نعمانی صاحب

(۲۶) دفتر ابو الفضل۔ مولفہ ابو الفضل علامی

(۲۷) عمل صالح۔ مولفہ محمد صالح لکھنوی

(۲۸) روز روشن۔ مولفہ مولوی مظفر حسین صبا

(۲۹) مباحثہ دینی۔ مرتبہ سید عبداللہ اکبر آبادی

(۳۰) سوانح قاسمی۔ مولفہ مولانا مناظر احسن گیلانی

(۳۱) ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ۔ مرتبہ خلیق احمد صاحب نظامی

(۳۲) غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط۔ مرتبہ خواجہ حسن نظامی

(۳۳) مولانا فیض احمد بدایونی۔ مولفہ پروفیسر ایوب قادری

(۳۴) غدر کی صبح و شام۔ مرتبہ خواجہ حسن نظامی

(۳۵) قیصر التواریخ۔ مولفہ سید کمال الدین

(۳۶) مجاہد شعراء۔ مولفہ امداد صابری

(۳۷) تاریخ شاہجہانپور۔ مولفہ مولوی صبیح الدین

(۳۸) رسالہ تاریخ بغاوت ہند آگرہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء

(۳۹) غدر کے چند علماء۔ مولفہ مفتی انتظام اللہ شہابی

(۴۰) تذکرۃ الرشید۔ مولفہ محمد عاشق الہٰی

(۴۱) سوانح عمری مولانا محمد قاسم۔ مولفہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی

(۴۲) آئینہ تاریخ نما۔

(۴۳) مفتاح التاریخ۔ مولفہ مولوی وزیر احمد

(۴۴) مقامات امام ربانی۔ مرتبہ مولوی عبد الاحد

(۴۵) واقعات دارالحکومت دہلی۔ مؤلفہ مولوی بشیرالدین صاحب
(۴۶) سفرنامہ برنیر۔ مؤلفہ ڈاکٹر برنیر
(۴۷) سیر المتاخرین۔ مؤلفہ سید غلام حسین خاں
(۴۸) تاریخ بیجاپور۔ مؤلفہ مولوی بشیر احمد دہلوی
(۴۹) مآثر عالمگیری۔ مؤلفہ محمد ساقی مستعد خاں
(۵۰) اخبار متحدہ محاذ دہلی ۱۶ ستمبر ۱۹۶۴ء
(۵۱) خطبات گارسان دتاسی
(۵۲) سیرۃ حاجی امداد اللہ صاحب اور ان کے خلفا۔ مؤلفہ امداد صابری
(۵۳) استفسار۔ مؤلفہ مولانا آل حسن صاحب موہانی
(۵۴) حل الاشکال معہ مراسلات پادری فانڈر و مولوی سید آل حسن صاحب
(۵۵) تنقیح العبادت۔ مولفہ مولانا آل حسن موہانی صاحب
(۵۶) صلیب کے علمبردار۔ مولفہ پادری برکت اللہ صاحب
(۵۷) مظاہر الحق۔ مولفہ مولانا رحمت اللہ صاحب
(۵۸) روئیداد مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ۔ مرتبہ مولوی محمد سعید صاحب
(۵۹) مکتوبات امدادیہ مرتبہ مولانا اشرف علی صاحب۔
(۶۰) تاریخ صحافت اردو جلد سوم مؤلفہ امداد صابری
(۶۱) خاتم سلیمانی۔ مولفہ مولانا غلام حسنین صاحب
(۶۲) سفرنامہ حج۔ مولانا اشرف الحق صاحب (قلمی)
(۶۳) وکیل اخبار امرتسر ۲۴ اپریل ۱۸۹۹ء
(۶۴) حیات شبلی مؤلفہ علامہ سلیمان ندوی صاحب
(۶۵) مشیر قیصر لکھنو ۱۲ فروری ۱۸۹۰ء

(۶۶) مراۃ الیقین ۔ مولانا محمد علی مونگیری صاحب

(۶۷) صیانۃ الانسان عن وساوس الشیطان ۔ مؤلفہ حافظ ولی اللہ صاحب لاہوری

(۶۸) تذکرہ مشائخ دیوبند ۔ مؤلفہ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب

(۶۹) پہلا حصہ مباحثہ مذہبی ۔ مرتبہ سید عبداللہ اکبر آبادی

(۷۰) ازالۃ الشکوک ۔ مؤلفہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی

(۷۱) ازالۃ الاوہام " " " "

(۷۲) شجرہ خاندان عثمانی ۔ مرتبہ مسیح اللہ عثمانی (قلمی)

(۷۳) مباحثہ مذہبی دوسرا حصہ مرتبہ سید عبداللہ اکبر آبادی

امداد صابری

مدینہ منورہ ۹ شوال ۱۳۸۵ھ

مطابق ۲۸ جولائی ۱۹۶۶ء

سلسلہ نسب

مولانا رحمت اللہ صاحب کا خاندان ہندوستان کا نامور خاندان ہے جس میں معروف ونامور مشائخ اور اطبا گذرے ہیں جنھوں نے علمی تاریخی، ادبی و تعلیمی اور انقلابی کارنامے انجام دیئے ہیں اور سامراجی طاقتوں کا خاتمہ کیا اور فوجی خدمات انجام دیں اور جنگی معرکے بھی سر کئے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی ان کی خدمات جلیلہ کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اس خاندان کا نسب نامہ یہ ہے۔

رحمت اللہ بن خلیل اللہ المعروف بہ خلیل الرحمٰن بن حکیم نجیب اللہ بن حکیم حبیب اللہ بن حکیم عبدالرحیم بن حکیم قطب الدین بن شیخ حکیم فضیل بن حکیم دیوان عبدالرحیم ...

... برادر نواب مقرب خاں) بن حکیم عبدالکریم المعروف بہ حکیم بینا المقلب بہ "شیخ الزماں" بن حکیم حسن بن عبدالصمد بن ابو علی بن محمد یوسف بن عبدالقادر بن کبیر الاولیاء حضرت مخدوم جلال الدین محمدؒ بن محمود بن یعقوب بن عیسیٰ بن اسماعیل بن محمد تقی بن ابی بکر بن علی نقی بن عثمان بن عبداللہ بن شہاب الدین بن شیخ عبدالرحمٰن گازرونی بن عبدالعزیز سرخسی بن خالد بن ولید بن عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن کبیر مدنی[۷] بن عبداللہ الثانی[۶] بن عبدالعزیز[۵] کبیر[۴] بن عبداللہ کبیر[۳] بن عمرو[۲] بن امیر المومنین[۱] ذوالنورین سیدنا بن عفان رضی اللہ عنہ

محمود غزنوی علم دوست بادشاہ تھا جس کو علوم وفنون و علم وادب کا بڑا شوق تھا۔ وہ ابتدا سے اہل علم اور ارباب کمال کا دلدادہ تھا۔ جب اس نے اپنا ایک دلکشا و خوشنما باغ لگوایا تو اس میں ایک دلکش مکان بھی بنوایا تھا جس کے جشن میں

امراء سلطنت کے ساتھ اپنے والد ماجد امیر سبکتگین کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ باپ نے باغ اور مکان کو دیکھا تو بہت پسند کیا اور اپنے سعادت مند و ہونہار فرزند کو یہ نصیحت فرمائی کہ

" ایسے باغ اور مکان تو اور بھی امیر بنوا سکتے ہیں۔ تجھ کو وہ عمارت بنوانی چاہئے جس کی برابری کوئی دوسرا نہ کر سکے۔ محمود نے پوچھا حضرت ایسی عمارت کونسی ہے ؟"

" اس نے جواب دیا کہ "وہ اہل علم و فضل کے دلوں کی تعمیر ہے جو کوئی نہال احسان انکی دل کی زمین میں لگائے گا اس کا ثمر ہمیشہ پائے گا۔" [1]

چنانچہ محمود غزنوی نے باپ کی اس نصیحت پر عمل کیا۔ اس کے دربار میں اس قدر فضلا علماء و شعراء حکماء جمع ہوئے جو کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئے۔ اس نے ایک وسیع و عظیم الشان دار العلوم تعمیر کرایا جس میں ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا۔ محمود غزنوی عالموں کے وظیفوں اور پنشنوں پر سالانہ ایک لاکھ روپیہ صرف کرتا تھا۔ ایک عجائب خانہ بھی اس نے بنوایا تھا جس میں سارے عالم کے عجائب جمع کئے۔ چار سو شعرا اس کے دربار میں ملازم تھے جس میں قابل ذکر فردوسی، طوسی، حکیم عنصری، عسجدی، فرخی اور دقیقی وغیرہ تھے اور دربار محمودی کا درۃ التاج حکیم ابو ریحان البیرونی تھا جس نے تحریر اقلیدس اور مجسطی کا ترجمہ سنسکرت زبان میں کیا۔

محمود نے ممتاز عہدوں پر علماء کرام کو مقرر کر رکھا تھا۔ چنانچہ فوج میں بھی علماء کو امتیازی حیثیت حاصل تھی اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے جد اعلیٰ شیخ عبد الرحمٰن صاحب گازرونی سلطان محمود کی فوج میں شرعی حاکم تھے۔ یہ عہدہ "قاضی عسکر" کے نام سے خلفاء آل عثمان کے زمانے میں بھی قائم رہا۔

شیخ عبد الرحمٰن صاحب گازرونی سلطان محمود کے لشکر کے ساتھ قاضی لشکر کی حیثیت سے

---

[1] تاریخ ہند ذکاء اللہ جلد اول ص ۲۵۳ [2] ایضاً ص ۲۹۹

ہندوستان آئے اور جب محمود غزنوی نے سومناتھ کے مندر پر حملہ کیا تو یہ فوج کے ساتھ شریک تھے۔ پانی پت کی فتح کے بعد اِس قصبہ میں مقیم ہوئے۔ اس کے بعد شاہی فرمان کے ذریعہ پانی پت کا علاقہ آپ کے سپرد ہوا۔ ان کا مزار پانی پت میں زیر قلعہ ہے۔[1]

حضرت مولانا رحمت اللہ کا سلسلہ نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے آپ کا شجرہ خاندانی نسلاً بعد نسلاً اُس قدیم تاریخی قرطاس میں محفوظ تھا۔ جو حضرت کبیرالاولیار مخدوم جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پانی پت میں موجود تھا۔ جس کی متعدد نقول بعض عثمانی النسب اہل پانی پت کے پاس تھیں

جناب عبدالرحمٰن صاحب مدنی مدینہ منورہ سے گازرون تشریف لائے اور جناب عبدالرحمٰن صاحب ثانی گازرون سے تشریف لاکر پانی پت میں مقیم ہوئے۔ حضرت کبیرالاولیار مخدوم خواجہ محمد جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ آپ ہی کی اولادیں ہیں۔ اسی لئے حضرت کو گازرونی کہا جاتا ہے۔

حضرت کبیرالاولیاء کی تربیت اور آپ کے اخلاق و کردار کی تعمیر میں حضرت بوعلی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی فیض صحبت اور توجہ کو بہت دخل تھا حضرت ہی کے سایۂ عاطفت میں آپ نے مدارج معرفت طے کئے۔ حضرت قلندر صاحب کی شفقت اور محبت کا یہ عالم تھا کہ جب تک حضرت کبیرالاولیار کو دیکھ نہیں لیتے تھے چین نہیں آتا تھا۔ ایک روز حضرت کبیرالاولیار کے مکان پر حضرت قلندر صاحب تشریف لے گئے۔ ... معلوم ہوا کہ حضرت کبیرالاولیا کھیت پر گئے ہیں۔ قلندر صاحب گھوڑے پر سوار ہوئے اور انہوں نے کھیت کا رُخ کیا۔ حضرت کبیرالاولیار قلندر صاحب کو دُور سے دیکھ کر پہچان گئے۔ آپ کا ذریعہ معاش زمینداری تھی اور کاشت خود ہی کیا کرتے تھے۔ اس وقت چنے کی پیداوار تھی۔ آپ نے ایک چھاج میں چنے بھرے جیسے ہی قلندر صاحب کھیت کے قریب پہنچے۔ حضرت کبیرالاولیار نے چنوں کی نذر پیش کی۔ آپ اس نذر کو دیکھ کر مسکرائے۔ فرمایا بیٹا

[1] ایک مجاہد معمار صـ۱۲

کیا لائے ہو۔ حسنِ ادب کی وجہ سے آپ کو یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ آپ کی خدمت میں چنے پیش کر رہا ہوں کیونکہ چنا ایسی چیز نہیں تھی جسے نذر میں پیش کیا جاتا۔ انہوں نے عرض کیا۔

حضرت گھوڑے کے لئے تھوڑا سا دانہ پیش کر رہا ہوں۔

قلندر صاحب نے فرمایا۔ گھوڑے سے دریافت کرلو۔ کیا وہ بھوکا ہے اور اس کو دانہ کی ضرورت ہے اگر وہ دانہ کھانا چاہے تو اس کو کھلادو۔

حضرت کبیر الاولیا نے چنے سے بھرا ہوا چھاج گھوڑے کے سامنے پیش کیا۔ گھوڑے نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا میرا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ حضرت دانہ کھلا کر مجھ پر سوار ہوئے تھے۔

حضرت کبیر الاولیاء پریشان ہو گئے کہ یہ نذر قبول نہیں کی جا رہی ہے۔ قلندر صاحب نے ان کی پریشانی کو دیکھ کر فرمایا۔

"پریشان نہ ہو۔ ہم نے تمہاری نذر قبول کر لی ہے اور اب ہم یہ غلہ اپنی طرف سے تمہیں بخشتے ہیں اور میں اللہ رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ ہر دانے کے بدلے تمہیں لڑکا بخشے"[1]

حضرت کبیر الاولیا بچپن ہی سے اللہ کی محبت میں فنا ہو چکے تھے اور ذکر الٰہی کا شوق تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ آپ کسی جنگل میں پہنچ جاتے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو جاتے۔

قلندر صاحب کو حضرت کبیر الاولیا سے بدرجہ غایت محبت تھی۔ لیکن آپ نے ان کو اپنا مرید نہیں کیا۔ جب ان سے حضرت کبیر الاولیا مرید ہونے کی خواہش فرماتے تو ان کو یہ جواب دیا کرتے تھے

"تو تو ہماری بیٹی ہے جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ تجھ کو جہیز میں دیں گے اور تیرا شوہر تجھے اس گھر کا مالک بنائے گا"

[1] تذکرہ اولیا جلد دوم صد ۱۳

چنانچہ جب خواجہ شمس الدین ترک پانی پت میں تشریف لائے تو حضرت قلندر صاحب نے حضرت کبیر الاولیا کو حضرت خواجہ شمس الدین ترک کی خدمت میں مرید ہونے کے لئے بھیجا۔ اس طرح حضرت کبیر الاولیاء "دولت قلندری" سے مالا مال ہو کر "دولت صابری" کے بھی وارث بنے۔ چنانچہ اس واقعہ کا ذکر مولف سیر الاقطاب نے کیا ہے۔[1]

نقل است کہ آنحضرت چہل سال مسافرت کرد مکرر حج الحرمین الشریفین ادا نمود و از بسیار مشائخ کرام نعمت یافتہ پس بوطن مالوف رسید و بعنایت صوری و معنوی حضرت شمس الاولیاء سرفراز گردید و بالہام ربانی مرید شد و خدمتہا نمود و ریاضت و مجاہدہ از حد گزرانید۔ پس خلافت و اسم اعظم کہ سینہ بسینہ رسیدہ بود، آموخت و ہم بجائے فرزند صاحب سجادگی نیز یافت و خانقاہ و خدمت روضہ منورہ نیز بایشان متعلق گشت

نقل ہے کہ (حضرت کبیر الاولیاء) چالیس سال سیاحت کرتے رہے اس عرصہ میں بارہا حرمین شریفین کی زیارت کی۔ بہت سے مشائخ اور اولیاء کرام کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے روحانی فیوض و برکات حاصل کئے۔ اس کے بعد وطن عزیز واپس ہوئے جہاں حضرت صاحب ولایت (حضرت شمس الدین ترک) کی صوری و معنوی عنایتوں سے سرفراز ہوئے۔ اور اشارہ غیبی کی بنیاد پر آپ کے حلقہ ارادت و بیعت میں داخل ہوئے۔ حضرت شیخ کی خدمت کرتے رہے اور حد سے زیادہ ریاضت و مجاہدہ کیا۔ پھر خرقہ خلافت . . . . اور اسم اعظم جو سینہ بسینہ چلا آرہا تھا حاصل کیا بہر صورت جبکہ حضرت کبیر الاولیاء حضرت شمس الدین ترک کے فرزند کی جگہ تھے تو

[1] سیر الاقطاب صـ ۲۰

آپ ہی حضرت خواجہ ترک کے سجادہ نشین
قرار دیئے گئے اور خانقاہ اور حضرت خواجہ
ترک کے مزار کی خدمت آپ کے سپرد ہوئی

حضرت خواجہ شمس الدین ترک حضرت کبیر الاولیاء کی ریاضت و مشقت اور عبادت الٰہی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا اور سند خلافت عطا کی چنانچہ خواجہ ترک تحریر فرماتے ہیں

حضرت خواجہ کلیری نے اس فقیر کو خلافت عطا فرمائی اور خدمت کے لئے یہ علاقہ پانی پت کا احقر کو سپرد کیا اور کہا میں ...... ٹوپی، خرقہ۔ مقراض، عصا اور پیالہ اور جو کچھ میرے قلب، میری روح میرے جسم، میری آنکھ میرے بدن، میرے ظاہر اور پوشیدہ اور مخفی یا علانیہ میں میرے پاس ہے وہ سب عطا کرتا ہوں۔ اپنے روحانی فرزند واقف اسرار محمد بن محمود بن یعقوب کو اور میں نے اس کو جلال الدین کا خطاب دیا ہے اور اپنے مقام پر اس کو قائم کیا ہے اور پورا علاقہ مع اس کے مضافات کے اس کے سپرد کر دیا ہے۔ اب میں اس علاقہ میں کسی کو مرید نہیں بناؤں گا۔ یہ شیخ جلال الدین اسرار خداوندی کے طریقوں سے واقف ہیں اور جو باقی ہیں اُن کی میں تعلیم دے رہا ہوں وہ اس درجہ اور مرتبہ کے لئے بہت موزوں ہیں "(سیر الاقطاب)"

جبکہ خواجہ ترک جیسے ولی کامل نے جب حضرت کبیر الاولیاء کو اپنے روحانی فیوض و کمالات سے مالا مال کر دیا ہو اور جو کچھ ان کو اپنے بزرگوں سے ملا تھا وہ سب ان کو دیا ہو تو ایسا انسان کیسا باکمال ہو جائے گا اور اس کی روحانی طاقت کس قسم کی ہوگی اس کا اندازہ ایک کرامت سے لگا لیجئے۔ صاحب سیر الاقطاب لکھتے ہیں۔

"آنحضرت (حضرت کبیر الاولیاء) جہاں چاہتے پلک کے ایک جھپکے میں وہاں پہنچ جاتے تھے۔ پھر اسی طرح واپس آجاتے۔ خواہ وہ مقام کتنا ہی دور ہوتا۔ چنانچہ جمعہ کی نماز اکثر آپ

خانہ کعبہ میں ادا کرتے تھے۔

حضرت کبیرالاولیا مستجاب الدعوات تھے۔ ان کی زبان پر جو کچھ آتا من وعن وہی پورا ہوتا تھا۔ اسی قبولیت دعا نے فیروز شاہ کو اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ وہ سلام کرنے اور دعا لینے کے لئے پانی پت حاضر ہوتا تھا۔ اور جس واقعہ سے فیروز شاہ متاثر ہوا۔ وہ یہ تھا۔

مخدوم جہانیانِ جہاں گشت حضرت سید جلال الدین اپنے وطن "اوچ" سے دہلی تشریف لائے تھے۔ بادشاہ کے مہمان تھے اسی اثنا میں بیمار ہو گئے۔ یہاں تک کہ نزع کی کیفیت شروع ہو گئی۔ لوگ مایوس ہو کر تجہیز و تکفین کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ دفعۃً حضرت کبیرالاولیا وہاں پہنچے اور حضرت جہانیاں جہاں گشت کے سرہانے کھڑے ہو گئے اور ان کو سلام کیا۔ انھوں نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ حضرت کبیرالاولیا نے فرمایا۔ اٹھئے۔ وضو کیجیے۔ پھر دعا کی تو خدا کے فضل سے وہ تندرست ہو گئے۔ بیماری کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ فیروز شاہ جو سید جلال الدین مخدوم جہانیانِ جہاں گشت سے بیعت تھا وضو کر کے اس لئے آرہا تھا کہ اپنے پیر کی آخری زیارت کرے جب اس نے یہ کرامت دیکھی تو وہ بھی حیران ہو گیا۔ اس دعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ اور دس سال تک زندہ رہے۔

فیروز شاہ سید جلال الدین بخاری کی بیحد توقیر و عزت کرتا تھا۔ جب حضرت سید جلال الدین بخاری فیروز آباد کے نواح میں پہنچتے تو فیروز شاہ بہت دور تک ان کے استقبال کے لئے جاتا ... اور جب روانہ ہوتے تھے تو اس وقت تک کھڑا رہتا تھا۔ جب تک آپ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتے تھے[1]

حضرت کبیرالاولیا غریبوں کی امداد کرنے سے بہت خوش ہوتے تھے اور ان کے

[1] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۳۳

کام کاج کرنے سے بھی دریغ نہیں فرماتے تھے اور ان کو اپنے فیض روحانی سے بھی مستفید کرتے تھے۔ آپ ایک روز کہیں تشریف لے جارہے تھے کہ راستہ میں ایک ضعیفہ مل گئی جو حد سے زیادہ کمزور ونحیف تھی۔ اس کو چلنا پھرنا دوبھر تھا۔ پانی کی ٹھلیا لئے جارہی تھی۔ آپ نے اس سے یہ ٹھلیا لے لی اور دریافت کیا تمہارا کوئی نہیں ہے جو پانی لے جاتا۔ ضعیفہ نے کہا اگر میرا کوئی ہوتا تو میں یہ مصیبت کیوں اٹھاتی۔ آپ نے ٹھلیا میں پانی بھرا اور اس کے گھر پہنچادیا۔ اسی کے ساتھ آپ نے فرمایا۔ بڑی بی تم جب تک زندہ ہو، انشاء اللہ تعالیٰ اس ٹھلیا کا پانی ختم نہیں ہوگا۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی کہ جب تک وہ ضعیفہ حیات رہی ٹھلیا کا پانی ختم نہیں ہوا[1]

ہمیشہ کفر اور اسلام کا مقابلہ ہوا ہے اور دنیا نے دیکھا کہ کفر کو منہ کی کھانی پڑی ہے اسی طرح ایک معرکہ حضرت کبیرالاولیاء کو بھی پیش آیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کسی دریا کے کنارے پر پہنچے وہاں ایک جوگی آنکھ بند کئے بیٹھا تھا۔ آپ اس کے پاس پہنچے تو اس نے آنکھ کھولی اور کہا تم خوب آئے۔ میں نے طے کرلیا تھا جو پارس پتھری میرے پاس رکھی ہوئی ہے جب میں آنکھ کھولوں گا اس وقت جو بھی میرے سامنے آئے گا اس کو یہ پتھری دیدوں گا۔ تم خوش نصیب ہو کہ میرے سامنے آگئے لو یہ پارس پتھری اپنے پاس احتیاط سے رکھو۔ اس سے تم مالامال ہوجاؤ گے۔ آپ نے وہ پتھری اس سے لے لی اور بے اعتنائی کے ساتھ دریا میں پھینکدی۔ جوگی اس بات سے بہت ناراض ہوا اس نے آپ کو بہت سخت سست باتیں کہیں۔ آپ نے اس سے کہا تم مجھ کو پارس پتھری دے چکے تھے وہ میری ہوگئی تھی۔ اب میری مرضی ہے اس کا میں جو چاہے کروں۔ خواہ میں اسے دریا میں ڈالوں۔ آپ کیوں ناراض ہوتے ہیں۔ مگر جوگی آپے سے باہر ہوگیا اور سختی کے ساتھ پتھری کا تقاضا کرنے

[1] انوارالعاشقین ص۵۲

لگا۔ آپ نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا خفا کیوں ہوتے ہو۔ دریا میں نظر ڈالو۔ اس جیسی دریا میں بہت سی پارس پتھریاں ملیں گی مگر ان میں سے تم صرف ایک پتھری لینا۔ جوگی نے دریا میں دیکھا تو اس میں بیشمار پارس کی پتھریاں تھیں حیران ہوا اور ایک سے زیادہ پتھریاں اٹھانے لگا۔ آپ نے اس کو منع کیا کہ اپنے وعدہ پر قائم رہو اور ایک سے زیادہ پتھری نہ لو۔
(سیر الاقطاب ص ۲۰۵)

جب جوگی کی ناراضگی ختم ہو گئی اور اس نے ایک پارس پتھری لے لی تو اس وقت آپ نے اس کو ہدایت کی کہ جس کو خدا نے یہ طاقت دی ہے کہ پتھروں کو پارس کی پتھری بنادے وہ پارس کی ایک پتھری کی کیا قدر کر سکتا ہے اور بھائی جوگی پارس کی پتھری کی تلاش بے سود ہے۔ اس کی جستجو کرو جو سنگریزوں کو پارس کی پتھری بنا دیتا ہے۔ یہ باتیں سن کر جوگی کی آنکھیں کھلیں اور حقیقی طاقت کی جستجو میں آپ کے دامن سے وابستہ ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

حضرت کبیر الاولیاء ہر روز لنگر خانے میں ایک ہزار مہمانوں کو کھانا کھلاتے تھے اگر کبھی مہمانوں کی تعداد پوری نہیں ہوتی تھی تو خدام کو حکم ملتا تھا کہ کوچہ و بازار سے آدمیوں کو لاکر تعداد پوری کریں[۱]۔ کھانے انواع و اقسام کے ہوتے تھے۔ اگر آپ کبھی پندرہ بیس روز یا ایک مہینے شکار میں رہتے تھے تو وہاں بھی مطبخ کی یہی شان اور مہمانوں کی یہی تعداد رہتی تھی۔

اس کے برعکس اگر ان کے گھر کی حالت دیکھی جاتی تو فقر و فاقہ کی زندگی گذرتی تھی ایک دن کی خوراک کا سامان بھی گھر میں موجود نہیں ہوتا تھا۔ قوت لایموت بھی مشکل سے پیدا ہوتی تھی۔

دولت و ثروت کو حضرت کبیر الاولیا حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کبھی اس کی

[۱] خزینۃ الاصفیا ص ۲۵۰

طرف توجہ نہیں کی اور انتہائی خود دار اور مستغنی المزاج تھے۔ ایک مرتبہ فیروز شاہ نے اپنے پیر طریقت سید جلال الدین بخاری جہانیانِ جہاں گشت سے عرض کیا کہ دل چاہتا ہے کہ حضرت کبیر الاولیار کی خدمت میں حاضر ہوں۔ سید بخاری نے فرمایا۔ بہت اچھا خیال ہے۔ ضرور حاضری دیجیے۔ چنانچہ فیروز شاہ شاہانہ ٹھاٹ کے ساتھ پانی پت پہنچا۔ خدمت مبارک میں حاضری دی اور عرض کیا کچھ ہدیہ لایا ہوں وہ منظور فرما لیجیے۔ چنانچہ اس نے کافی خوان ہیرے جواہرات، سونے چاندی کے سکوں اور اعلیٰ قسم کے کپڑوں سے بھرے ہوئے پیش کیے۔ حضرت کبیر الاولیار نے فرمایا۔ یہ ہمارے کس کام کے ہیں ہم فقیر لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں نہ کوئی دربان، نہ چوکیدار۔ ہمارے یہاں رات کو دروازے کے کواڑ بھی بند نہیں ہوتے۔ ان ہدایا کی حفاظت کس طرح کی جائے گی۔ آپ ہی ان کو حفاظت سے رکھ سکتے ہیں۔ یہ آپ کو ہی مبارک ہوں۔ فیروز شاہ نے بہت اصرار کیا۔ مگر آپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔ جب فیروز شاہ حضرت کبیر الاولیار کی منظوری حاصل نہ کر سکا۔ تو اس نے آپ کے صاحبزادوں کو راضی کرنا چاہا۔ وہ بھی آمادہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سب کچھ دے رکھا ہے تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اپنے فقر و استغنا کو چھوڑیں جب فیروز شاہ کو ان کی طرف سے بھی مایوسی ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ یہ سب خوان آستانہ کبیر الاولیار پر چھوڑ دیے جائیں[1]

حضرت کبیر الاولیار ۶۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰ ربیع الاول ۷۵۲ھ کو فوت ہوئے۔ اس حساب سے ان کی عمر ۱۳۵ برس کی ہوئی۔ عمر کے تقاضوں اور ریاضتوں اور مجاہدات کی وجہ سے آپ بیحد کمزور ہو گئے تھے۔ آخر میں آپ پر ہر وقت استغراقی کیفیت طاری رہنے لگی تھی۔ نماز کے لئے آپ کو متوجہ کیا جاتا تھا

آپ کے پانچ صاحبزادے اور دو لڑکیاں تھیں۔ یہ پانچوں صاحبزادے اپنے

---

[1] پانی پت اور بزرگان پانی پت ص ۲۲۲

والد کے صحیح جانشین اور کامل و مکمل ولی تھے جن کے نام یہ ہیں :

(۱) خواجہ عبدالقادر صاحب حضرت مولانا رحمت اللہ انھیں کی اولادیں ہیں ۔

(۲) خواجہ ابراہیم صاحب

(۳) خواجہ شبلی صاحب آپ اپنے والد کے عظیم المرتبت خلفاء میں تھے

(۴) خواجہ کریم الدین صاحب

(۵) خواجہ عبدالواحد صاحب

(۶) دو صاحبزادیاں فردوسیہ اور زبیدہ

خواجہ ملک انصاری پانی پتی کے دونوں صاحبزادوں ۔ خواجہ نصیر الدین کا فردوسیہ سے اور خواجہ محمد مسعود کا زبیدہ سے عقد ہوا ۔ (تذکرۃ الصالحین)

خواجہ عبدالقادر صاحب کی اولاد سے علوم دینی پھیلا اور انسانیت کی بقاو تندرستی کو فائدہ پہنچا ۔ خواجہ شبلی اور ان کی اولاد اپنے والد اور اپنے جدامجد کے نقش قدم پر چلی اور تصوف کی راہ پر گامزن ہوئی ۔ چنانچہ ان کی ہی اولاد میں سجادگی چلی آتی ہے اور سلسلہ خلافت و بیعت بھی جاری ہے ۔ اس خاندان کے روحانی کارناموں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور خواجہ ابراہیم کی اولاد نے بھی اپنے دونوں بزرگوں کے مقابلہ میں دینی خدمت انجام دینے میں کافی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اس کا بھی مختصر سا خاکہ پیش کیا جائے گا تاکہ اندازہ ہو جائے کہ اسلام کو فروغ دینے اور علم کی روشنی پھیلانے میں عثمانی خاندان کسی سے پیچھے نہیں رہا ہے اور نہ اب ہے خواجہ عبدالواحد اور خواجہ کریم الدین سے کے کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی ۔

پہلے خواجہ شبلی اور خواجہ ابراہیم صاحب کی اولاد کے حالات و کارنامے لکھے جاتے ہیں اس کے بعد خواجہ عبدالقادر کی اولاد کے حالات تحریر کئے جائیں گے ۔

حضرت کبیر الاولیا کے انتقال کے بعد چند روز کے لئے ان کے منجھلے فرزند خواجہ ابراہیم نے حضرت کبیر الاولیا کی سجادہ نشینی کے فرائض انجام دیئے ۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے چھوٹے

بھائی خواجہ شبلی کے حق میں دست برداری دیدی تھی ۔

خواجہ شبلی ایک جیّد عالم تھے ۔ فقہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ۔ اہل دنیا سے احتراز اور بادشاہوں کی دربارداری سے نفرت کرتے تھے ۔ توکل اور استغنیٰ طرہ امتیاز تھا ۔ علماء اور فضلا ان سے اکتساب کرتے تھے ۔ ان کے بے شمار مرید و خلیفہ تھے ۔ آپ کے صاحبزادے شیخ عبدالقدوس پانی پتی اور پوتے شیخ عبدالکبیر بالاپیر تھے ۔

شیخ عبدالکبیر حضرت کبیرالاولیا کی طرح مادرزاد ولی تھے اور صاحب کرامت بزرگ تھے ۔ چنانچہ ان کی یہ کرامت بہت مشہور ہے

ایک روز سلطان سکندر لودی اپنے دو وزیروں کے ہمراہ پانی پت پہنچا ۔ آپ کے کشف و کرامات کو آزمانا چاہا اور یہ خیال کیا کہ ہم جس چیز کی کھانے کی نیت کریں گے دیکھیں ان کو اس سے آگاہی ہوتی ہے یا نہیں ؟ جب یہ تینوں ان کی خدمت میں پہنچے سلطان سکندر کے سامنے گوشت کے گرم سموسے رکھے گئے اور میاں بدھا وزیر کے سامنے نان اور یخنی رکھی گئی اور دوسرے وزیر ملک محمد مسوانی کے سامنے حلوا پیش ہوا ۔ یہ دیکھ کر تینوں حضرات حیرت میں پڑ گئے کہ جن جن چیزوں کا ہم نے خیال کیا تھا وہی ہمارے سامنے رکھی گئی ہیں ۔ بہت شرمندہ ہوئے اور حضرت سے معذرت خواہ ہوئے ۔ آپ نے جواب میں فرمایا ۔[1]

"حیرت کی کیا بات ہے ۔ خدا اپنے دوستوں کو اہل دنیا کے سامنے شرمسار نہیں کرتا ۔"[2]

حضرت شیخ کبیر کے صاحبزادے شیخ عثمان زندہ پیر تھے جو علوم ظاہری و باطنی میں کامل تھے ۔ آپ روحانی کمالات کے ساتھ فراخ حوصلہ اور معاملہ فہم تھے ۔

چنانچہ ان کے زمانہ میں دو جاٹ تھے جس میں ایک مسلمان اور دوسرا ہندو تھا ۔ ان کا عرصہ سے کسی معاملہ پر جھگڑا چل رہا تھا جو طے ہونے کو نہیں آتا تھا ۔ یہ قضیہ الغرض دونوں نے آپ کے سامنے طے کرنے کے لئے رکھا ۔ واقعات سن کر انہوں نے ایک جاٹ کے حق میں

---

[1] سیر الاقطاب ص ۲۲۹ [2] خزینۃ الاصفیاء ص ۴۱۳

فیصلہ دیا۔ جو مسلمان تھا۔ ہندو جاٹ اس فیصلہ پر معترض ہوا کہ آپ نے مسلمان ہونے کی رعایت کی ورنہ حق دار میں تھا اور میرے ہی حق میں فیصلہ ہونا چاہیئے تھا۔

اس جاٹ کا یہ اعتراض آپ کو بہت کھٹکا۔ جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ ان دونوں کے ہاں بچے ہونے والے ہیں تو آپ نے اپنی دیانت داری کو ثابت کرنے کے لئے ان دونوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ تم دونوں کے ہاں بچہ ہونے والا ہے۔ جو سچا ہوگا۔ اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا جو جھوٹا ہوگا۔ اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوگی۔ چنانچہ آپ کی دیانتداری کی غیب سے تائید ہوئی اور مسلمان جاٹ کے ہاں لڑکا اور ہندو جاٹ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد فریق معترض مطمئن ہوا۔[1]

حضرت زندہ پیر کے صاحبزادے شیخ نظام الدین پانی پتی تھے۔ جو زاہد، قانع، اور مستغنی المزاج تھے۔ ان کے بڑے بھائی شیخ کمال الدین صاحب تھے۔ جو صاحب جلال و جمال تھے اور جذبہ عشق الٰہی میں مستغرق رہتے تھے ان کو لوگوں نے سجادہ نشین بنانا چاہا لیکن انہوں نے منع فرمایا اور اپنے چھوٹے بھائی شیخ نظام الدین کے سر پر اپنے ہاتھ سے دستار باندھی۔ شیخ نظام الدین صاحب ۷۴ سال کی عمر میں ۱۰۱۸ھ میں فوت ہوئے۔[2]

حضرت عبد السلام چشتی المعروف شاہ اعلیٰ حضرت شیخ نظام الدین پانی پتی کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے اپنے خاندانی فیوض کے علاوہ قصبہ نارنول کے شیخ نظام سے بھی فیوض حاصل کئے اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ شیخ نظام نے ہی آپ کو شاہ اعلیٰ کا خطاب دیا تھا۔ آپ سپاہیانہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ تیر اندازی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ آپ کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا[3] اسی مجاہدانہ ذوق کی وجہ سے آپ فوج میں بھرتی ہوئے۔ آپ کا کمانڈر فراخاں بابر کا فوجی افسر تھا۔ یہی آپ کی فوج کی ملازمت کی وجہ بنی۔ آپ نے حسب حج بیت اللہ کا ارادہ کیا تو والد صاحب سے اجازت حاصل کرنے کے بعد سفر شروع

---

[1] خزینۃ الاصفیا ص ۹۳۹ [2] پانی پت اور بزرگان پانی پت ص ۲۵۰ [3] سیر الاقطاب ص ۲۲۴

کردیا اور جس وقت دریائے سورت یا کھمبات کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا اس زمانہ میں جہاز نہیں جارہے ہیں کیونکہ فرنگی اور پرتگالی قزاق سمندر میں لوٹ مار کر رہے ہیں اور۔۔۔۔ راستہ مخدوش ہے۔ آپ وہاں سے مجبور ہوکر مالوہ پہنچے جہاں بابر کی فوج مقیم تھی جس کا افسر فراخاں تھا۔ انہوں نے فوج میں ملازمت کرلی۔ یہ فراخاں کے اس قدر معتمد علیہ ہوگئے تھے کہ جب بھی کوئی مشکل مسئلہ اس کے سامنے آتا وہ اُن کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔[1] آپ نے ۱۴ سال تک ۹۳۳ھ سے ۹۴۷ھ تک فوج میں ملازمت کی۔ اور ۹۴۷ھ میں اس وقت فوج کی ملازمت سے علیحدہ ہوئے جب شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔

حضرت شاہ اعلیٰ اپنے بزرگوں کی طرح صاحب کشف وکرامات تھے۔ اولیائے کرام کے تذکروں میں اُن کی کرامات تحریر ہیں۔

صاحب خزینۃ الاصفیا لکھتے ہیں۔

شاہ اعلیٰ کی خانقاہ میں ایک کنواں تھا جب اس کی تعمیر ہوچکی تو اس میں سے تلخ پانی نکلا۔ مریدوں نے اس کی شکایت کی۔ اتفاقیہ طور پر چند کاک حضرت خواجہ قطب بختیار کاکی کے مزار کے تبرک کے طور پر آپ کے پاس رکھے ہوئے تھے۔ ان کے آپ نے ٹکڑے کئے اور کنوئیں میں ڈالدیے اور کچھ پڑھ کر فرمایا۔ کنوئیں سے پانی کھینچو۔ پانی کھینچا گیا تو وہ بجائے تلخ کے شیریں نکلا۔[2]

شاہ اعلیٰ کی وفات کے چند سال بعد استانی صاحبہ نے آپ کے مزار کو پختہ بنوانے کے لئے کام شروع کردیا تھا۔ جو معمار اس کام پر لگا ہوا تھا اس نے خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے مزار پر کھڑے ہوئے ہیں اور فرمارہے ہیں کہ بنیادیں جب تم لوگوں نے کھدائی شروع کی ہے اس سے میری قبر کا ایک پتھر ٹوٹ گیا ہے جو میری داہنی ران پر آپڑا ہے۔

---

[1] سیر الاقطاب ص ۲۳۶ [2] ایضاً ص ۲۴۰

پہلے اس کو نکال لو پھر تعمیر شروع کرنا۔ یہ خواب دیکھ کر معمار استانی صاحبہ کی خدمت میں آیا۔
اور خواب کا ذکر کیا۔ انہوں نے ہدایت کی کہ قبر کھول کر دیکھو۔ جس وقت قبر کھولی جانے
لگی تو قصبہ کے ذمہ دار لوگ ان کے مزار پر پہنچ گئے چنانچہ جب قبر سے مٹی ہٹائی گئی تو آپ کا
تمام جسم مبارک صحیح و سالم تھا اور ران پر ٹوٹا ہوا پتھر پڑا ہوا تھا۔ اس پتھر کو قبر سے نکالا
پھر قبر کو درست کر کے مجر کی تعمیر کی۔

اس واقعہ کی عبارت کے آخری الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"تمام جسم مبارک صحیح و سالم موجود و بغولہ ہائے چشم ہم بحالت اصلی است۔ گویا
آنحضرت بخواب ناز رفتہ و بے خبر افتادہ است۔ پس سکنائے شہر از صغار و کبار پدید پر انوار
آنحضرت مستفید گشتند و باز تختہ صندوق درست کردہ از سر نو بنیاد عمارت نہادند[1]"

آپ کی زندگی متوکلانہ اور مجاہدانہ تھی۔ دنیاداری چھوئی تک نہیں تھی۔ چنانچہ آپ کی
پوری زندگی اسی طرح گذری۔ آپ نے ایک دفعہ حضرت شیخ مودود دلاور کے مقبرے کے
نزدیکی غار میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں آپ کو پانچ روز تک کھانے کی کوئی چیز نہیں
ملی جس کی وجہ سے آپ بہت نحیف و کمزور ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے
لگا تھا۔ لیکن آپ توکل و اعتماد علی اللہ پر قائم رہے۔ آپ اسی حجرہ میں تھے کہ باہر سے
ایسی آواز آئی جیسے آپ کو کوئی بلا رہا ہے۔ اس آواز کو سن کر آپ باہر چلے گئے۔ دیکھا
ایک بزرگ نورانی صورت سفید لباس پہنے ہوئے تشریف فرما ہیں۔ ایک روٹی ان کے
ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے روٹی کے ٹکڑے کئے اور اپنے ہاتھ سے وہ ٹکڑے حضرت
شاہ اعلیٰ کو کھلائے اور فوراً چلے گئے۔ شاہ اعلیٰ صاحب کی خواہش تھی کہ وہ معلوم کریں کہ یہ کون
صاحب تھے لیکن وہ جلد آنکھوں سے اوجھل ہو گئے جس کا ان کو بہت افسوس ہوا[2]۔ رات کو
جب آپ نے آرام کیا تو خواب میں ان بزرگ سے سوال و جواب ہوئے۔ جب ان کو

---

[1] خزینۃ الاصفیار ص ۴۵۸ ۔ [2] سیر الاقطاب ص ۲۳۹

اطمینان ہوا۔

شاہ اعلیٰ متوکل ہونے کے ساتھ صابر و شاکر بھی تھے۔ مصیبت و پریشانی کو خوشی سے برداشت کرتے تھے۔ ان کے دو فرزند شاہ منصور اور شاہ نور تھے جو صاحب اولاد تھے یہ دونوں صاحبزادے ان کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ پوتے بھی داغ مفارقت دے گئے تھے صرف ایک پوتا بچا جس کا نام شاہ محمد تھا۔ جس کی عمر اپنے والد کے انتقال کے وقت چھ مہینے کی تھی اور اس کی والدہ والد کے ۔۔۔۔ انتقال سے قبل ہی فوت ہو گئی تھیں۔ ان کی پرورش حضرت شاہ اعلیٰ نے ہی فرمائی اور ان کو اپنا خلیفہ و سجادہ نشین مقرر کیا۔[۱] دونوں صاحبزادے جب مرے اور پوتے بھی لقمۂ اجل ہوئے۔ تو حضرت شاہ اعلیٰ کے چہرہ پر ملال کے آثار ذرّہ برابر نہیں تھے۔ تجہیز و تکفین کا کام خود اپنے ہاتھوں سے کیا۔ قبرستان سے آنے کے بعد لوگوں کو جو کھلایا جاتا تھا اس کا سامان خود ہی لائے اور کھانا پکوا کر لوگوں کو خود ہی کھلایا اور صبر کی تلقین فرمائی۔ آپ کے حالات میں ایک مبسوط کتاب جواہر اعلیٰ ہے۔

صاحب تذکرۃ الصالحین نے شاہ محمد کی حسب ذیل اولاد کا ذکر کیا ہے۔

"شیخ شاہ محمد بن شیخ یار محمد بن شیخ نظام الدین بن شیخ محمد شہید بن شیخ پیر محمد ابراہیم عرف شاہ محمد ماہ۔ بن نظام ثالث۔"

شیخ محمد ماہ ایک صاحب نسبت و کشف و کرامات بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ سخت قحط پڑا۔ لوگ بیحد پریشان ہوئے۔ آپ کے گھر میں سیر سوا سیر جو کے سوا کچھ نہیں تھا اسی کو پیس کر روٹی پکائی ۔۔ اسی اثناء میں ایک سائل نے سوال کیا۔ جو روٹیاں پکی تھیں۔ وہ آپ نے اس کو دیدیں۔ گھر والے پریشان ہوئے کہ کئی فاقوں کے بعد یہ روٹیاں نصیب ہوئی تھیں یہ بھی ختم ہو گئیں۔ اب کیا کھایا جائے گا۔ آپ نے جواب دیا خدا پر بھروسہ کرو۔ وہی رزاق ہے۔ چنانچہ رات کو عشا کے بعد کسی اجنبی شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک بھرا ہوا طباق

---

[۱] خزینۃ الاصفیا صفحہ ۴۵۷

جس میں گرم گرم پلاؤ تھا دیا۔ سب گھر والوں نے سیر ہو کر کھایا[1]۔ شیخ محمد ماہ کی صاحبزادی حبیب النساء کی شادی قاری عبد الرحمن پانی پتی کے خاندان میں ہوئی تھی۔

خواجہ شبلی کی اولاد میں ہی سجادگی کا سلسلہ چلا اور سلسلہ خلافت و بیعت بھی انہی میں جاری رہا۔ آخر میں حضرت شاہ نظام ثالث گذرے ہیں جن کے صاحبزادے پیر عبد الواحد صاحب شاہ فضل حق صاحب اور پیر عبد الہادی صاحب ہوئے اور ایک صاحبزادی اسلام النساء ہوئیں۔ پیر عبد الواحد صاحب کے فرزند پیر حافظ محمد صادق صاحب، پیر ضیاء الحق صاحب پیر محمد اعلیٰ صاحب اور ایک صاحبزادی صدیق النساء ہوئیں۔

پیر محمد صادق صاحب کے صاحبزادے حسام الحق صاحب اور حسام الحق کے فرزند اسلام الحق صاحب ہوئے اور پیر ضیاء الحق صاحب کے لڑکے پیر مصباح الحق صاحب اور مصباح الحق صاحب کے خلف منظور الحق صاحب ہوئے اور پیر محمد اعلیٰ صاحب کے صاحبزادے پیر انعام الحق صاحب اور پیر انعام الحق صاحب کے فرزند منصور الحق صاحب اور مطیع الحق صاحب ہوئے۔

شاہ فضل حق صاحب کے صاحبزادے پیر عبد الحق صاحب اور محمد کرم الحق صاحب اور ایک صاحبزادی ذکیہ ہوئیں۔ پیر عبد الحق صاحب کے فرزند پیر محمد مظہر الحق صاحب اور پیر معراج الحق صاحب ہوئے۔

شاہ محمد کرم الحق صاحب یا کریم الحق صاحب اپنے والد صاحب کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ چنانچہ آپ ۱۳۳۲ھ میں سجادہ نشین تھے[2]۔ ان کے صاحبزادے شاہ عین الحق صاحب ہوئے جنہوں نے اپنے والد کی وفات کے بعد سجادہ نشینی کے فرائض انجام دیئے۔ عین الحق صاحب کے فرزند مصباح الحق صاحب معز الحق صاحب مجیب الحق صاحب اور مطیع الحق صاحب ہوئے[3]۔

---

[1] تذکرۃ الصالحین صفحہ ۲۷ [2] انوار العاشقین صفحہ ۵۳ [3] شجرہ خاندان عثمانی

شیخ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد صاحب کے صحیح جانشین تھے اور ان کے والد حضرت کبیر الاولیاء کو اپنے تمام بیٹوں سے محبت تھی۔ چنانچہ جب آپ نے یہ دیکھا کہ سید جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشت کی عمر پوری ہو چکی ہے تو آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اپنی عمر کا کچھ حصہ اپنے ہم نام کو دیدوں۔ جب ان کے تمام فرزندوں نے یہ سُنا تو چار نے یہ عرض کیا کہ ہم کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ آپ کی عمر کم ہو، ہمارے لئے تو آپ کا زندہ رہنا ضروری ہے اور ہماری آرزو یہ ہے کہ ہم سب اپنی عمریں آپ کو نذر کریں۔

پانچویں صاحبزادے حضرت شبلی نے کہا اگر فرمان خداوندی ہے تو آپ یقیناً اپنی عمر کا کچھ حصہ سید جلال الدین بخاری کو عطا فرمادیں۔ تاکہ خلق خدا ان کے فیوض سے اور زیادہ مستفید ہو۔

حضرت کبیر الاولیاء اس جواب سے خوش ہوئے اور اسی وقت آپ پر استغراق کی کیفیت طاری ہوگئی۔ حضرت شیخ عبدالقادر صاحب کے علاوہ اور صاحب زادے آپ کے پاس سے چلے گئے تھے۔ جب آپ بیدار ہوئے اور آنکھیں کھولیں تو وہاں صرف شیخ عبدالقادر صاحب موجود تھے۔ فرمایا تم موجود ہو۔ میرے ساتھ چلو اور اپنے پاؤں میرے پاؤں پر رکھدو اور آنکھیں بند کرلو۔ چنانچہ عبدالقادر صاحب نے ایسا ہی کیا۔ جب آپ نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا پانی پت کے بجائے دہلی کے شاہی محل میں ہیں جہاں حضرت جلال الدین بخاری پر نزع کی کیفیت طاری ہے۔ آپنے سرہانے کھڑے ہو کر ان کو سلام کرکے وضو کے لئے کہا جب وہ بیدار ہو گئے آپ نے انگلیوں سے اشارہ کیا کہ میں نے اپنی عمر کے دس سال آپ کو دے دیئے۔ یہ کہنے کی دیر تھی کہ حضرت جلال الدین بخاری صاحب فوراً تندرست ہو گئے اور حضرت کبیر الاولیا مع اپنے صاحبزادے شیخ عبدالقادر صاحب کے واپس پانی پت پہنچ گئے [1]

خواجہ یوسف صاحب کے فرزند خواجہ بوعلی صاحب اور خواجہ ابوالفتح صاحب ہوئے

---

[1] سیر الاقطاب ص ۲۱۱

خواجہ بوعلی صاحب کے صاحبزادے خواجہ عبدالصمد صاحب اور خواجہ عبدالصمد صاحب کے لڑکے خواجہ ابومحمد صاحب، خواجہ ابراہیم صاحب و خواجہ حسن حکیم ہوئے۔

حسن صاحب کے صاحبزادے خواجہ عبدالکریم المعروف حکیم بنیا، خواجہ اولیاء، خواجہ حبیب اللہ اور خواجہ اسماعیل صاحب ہوئے (شجرہ خاندان عثمانی)

حضرت عبدالقادر صاحب کے صاحبزادے خواجہ زین العابدین صاحب و خواجہ یوسف، حکیم عبدالکریم دربار اکبری کے طبیب تھے اور شیخ الزماں کا لقب اکبر کی طرف سے ملا تھا۔

حکیم شیخ حسن صاحب کو صاحب منتخب التواریخ نے سرہندی لکھا ہے۔ لیکن طبقات اکبری، آئین اکبری اور مآثر الامراء میں ان کو پانی پتی لکھا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ دنوں شیخ حسن سرہند میں رہے ہوں۔ بہر حال یہ اپنے زمانہ کے مشہور طبیب تھے۔ ان کے متعلق ابوالفضل نے یہ تحریر کیا ہے [۱]

"از صحبت محبت صمیمی کہ با ملکی ملکات حکیم حسن دارد۔ امیدواری چنان است کہ از عالم معنی بہرہ ور باشند بحکیم روحانی سلام شوق افزا ابلاغ فرمایند۔"

حکیم حسن صاحب کی اہلیہ استانی صاحبہ اپنے زمانہ کی مخیر خاتون تھیں۔ چنانچہ انہی کے متعلق صاحب سیر الاقطاب لکھتے ہیں۔ جن استانی صاحبہ سلطان نے شاہ اعلیٰ صاحب کا مزار تعمیر کرایا تھا۔ وہ میری دادی تھیں۔ گویا آپ کے دادا حکیم شیخ حسن کی یہ اہلیہ تھیں۔ انہیں صاحب سلطان نے کیرانہ کی دریار مسجد تعمیر کرائی تھی۔ چنانچہ اس مسجد کے بیرونی صحن اور درمیانی حصہ کی دیوار پر حسب ذیل عبارت کا تاریخی پتھر آویزاں ہے [۲]

بانی این مسجد صاحب سلطان والدہ شیخ محمد فضل در سنہ الف خمیس مسجد بنا نمود و برائے خرید فرش در روشن چراغ از حاصل چاہ بابت محمد پور موازی شصت وہشت بیگہ پختہ گزد خرید

---

[۱] دفتر ابوالفضل جلد دوم ص ۸۷

[۲] اخبار متحدہ محاذ دہلی ۲۷ ستمبر ۱۹۶۴ء

شہمت دہشت دکان در وجہ معیشت بخدمت خرچ مسجد صرف کند بروئے حرام است "۔

شیخ حسن صاحب کے صاحبزادے عبدالکریم صاحب المعروف حکیم بینا تھے ۔ مسجد کی مذکورہ عبارت میں شیخ حسن کے صاحبزادے حکیم بینا کا نام نہیں ہے بلکہ شیخ فضل کا نام درج ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حسن کے بڑے صاحبزادے شیخ فضل اور چھوٹے صاحبزادے حکیم بینا ہوں گے ۔ اس لئے بڑے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے شیخ فضل کا نام اس عبارت میں آیا ۔ چھوٹے کا نہیں آیا ۔

تاریخوں میں استانی صاحب سلطان کے بارے میں جہاں شاہ اعلیٰ صاحب کے مزار کی تعمیر کرانے کا ذکر ہے ۔ وہاں ان کے متعلق کیرانہ کی دربار مسجد تعمیر کرانے کا بھی تاریخی کتابوں میں ذکر ہے ۔ چنانچہ اس مسجد کے بارے میں صاحب تذکرہ اولیاء ہند لکھتے ہیں [1]

"ان استانی کی کیفیت جو کاتب الحروف نے اپنے بزرگوں سے سنی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت جد امجد نور الدین جہانگیر بادشاہ نے اپنی کنیزوں میں سے ایک کنیز اپنے رضاعی بھائی نواب مقرب خاں کو (جنھوں نے کسوٹی کے کھنبہ قلندر صاحب کی درگاہ پر چڑھائے تھے وہیں ان کا مقبرہ ہے اور اولاد سے شیخ کبیر الاولیاء کے تھے) عنایت کی ۔ وہ بی بی نہایت عفیفہ اور قرآن شریف کی حافظ تھیں ۔ نواب اور ان کا تمام خاندان عطیہ سلطانی سمجھ کر ان کی عزت کرتا تھا یہ نہایت پرہیز گار اور نمازی تھیں ۔ یہ امراء پانی پت کیرانہ کی لڑکیوں کی استانی تھیں یعنی دختر نواب اور دختر دیوان عبدالرحیم اور دیگر لڑکیاں اس خاندان کی اور دیگر شرفا کی ان کے پاس قرآن پڑھتی تھیں ۔ زیور ان کے پاس بہت تھا ۔ انہوں نے اس کو فروخت کر کے شاہ اعلیٰ صاحب کی درگاہ بنوائی اور کیرانہ میں درمیان دونوں دریاؤں کے چاہ اور حوض اور مسجد عالی شان تیار کرائی ۔ اس مسجد کے صحن میں ان کی قبر ہے ۔ اس پر سنگ مرمر کا

---

[1] تذکرہ اولیائے ہند جلد دوئم صفحہ ۹۱

تعویذ ہے وہ مسجد بھی استانی کی مسجد مشہور ہے جوانجان ہیں وہ دربار کی مسجد کہتے ہیں۔

حکیم حسن صاحب کے صاحبزادے حکیم عبدالکریم صاحب تھے۔ آپ کی عرفیت میں اختلاف ہے۔ طبقات اکبری، ماثر الامرا اور بادشاہ نامہ میں شیخ بھینا۔ تزک جہانگیری میں شیخ بہا، منتخب التواریخ میں شیخ بینا اور کسی نے شیخ ہینا اور شیخ نیسائی لکھا ہے۔

شیخ بینا اکبر بادشاہ کے دربار کے طبیب تھے۔ حکمت کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ جراحی کے کام پر مامور تھے اور جراحی میں بے نظیر سمجھے جاتے تھے اور ہاتھیوں کے علاج میں انھوں نے عجیب و غریب اختراعات کی تھیں[1]

۱۰۰۰ھ میں اکبر ہرنوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ایک ہرن ان کی طرف دوڑا۔ اس نے اکبر کے ایک نازک مقام پر سینگ مار دیا۔ اس صدمہ سے خراش ہو کر ورم آ گیا جس نے اتنی شدت اختیار کی کہ سات روز تک اکبر بیت الخلا نہیں جا سکا۔ اس واقعہ سے ملک میں کافی تشویش پیدا ہوئی۔ حکیم مصری اور حکیم علی علاج کر رہے تھے مگر زخم کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی شیخ بینا اور مقرب خاں کرتے تھے۔ دونوں باپ بیٹوں نے اس علاج میں بڑی ذہانت کا ثبوت دیا[2]

اکبر نے ان باپ بیٹوں کی خدمات کے صلے میں حکیم بینا کو شیخ الزماں کا خطاب اور پرگنہ بطور جاگیر عطا کیا۔ فرمان شاہی کی نقل یہ ہے۔

---

[1] مشہور است کہ در ملازمت عرش آشیانی بخدمت طبابت خاصہ جراحی کہ در آں فن بے نظیر روزگار بود قیام می نمود۔ معالجہ فیل از غرائب مخترعات اوست و شہرت تمام دارد (ماثر الامرا جلد سوم صفحہ ۳۷۹)

[2] در سال چہل و یکم ۱۰۰۰ھ ہزار و چہار در تماشائے آویزۂ آہوان آہوے بجانب بادشاہ دویدہ شاخ بند گردانید۔ خراشے بہ بیضہ رسید و آماس نمودہ ہفت روز بخلا جا نرفت۔ سخت سورشے در مملکت افتاد اگرچہ چارہ بحکیم مصری و حکیم علی بازگرد اما در گذاشتن مرہم و بند کشاد آں ایں پدر و پسر طرفہ نیک اندیشیہا بجا آوردند (ماثر الامراء جلد سوم صفحہ ۳۸۰)

"فرمان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ بضمن معافی وعطائے۔

جاگیر کیرانہ مع علاقہ خوانین رفیع مقدار و سلاطین و امرائے باوقار صدور وزرا کفایت شعار وعمال ممالک ہندوستان صانہا اللہ عن آفات الزمان چوں فضائل مآب کمالات اکتساب حکمت شعار مسیحا آثار شیخ در ازالہ امراض و اعراض انسان بقدر الوسع والامکان بساط احسان و امتنان بظہور رسانیدہ و مے رساند۔ بنا بران عنایات و التفات۔ بے غایات شامل حال و کامل مآل آں فضائل مآب گردانیدہ

فرمان واجب الاتباع شرف نفاذ یافت کہ موازی پانصد بیگہ زمین مزروع از موضع ڈوماکھیڑی کھندراولی پرگنہ کیرانہ من اعمال میان دوآب حضرت دہلی بعوض مبلغ دہ ہزار تنگہ و دیگر ازاں موضع موجب فرمان عالیشان حضرت و دو قلبہ زمین از سواد قصبہ پرگنہ مذکور متعلق بمشار الیہ مفوض و متعلق بمشار الیہ بودہ باشد کہ واجبی آنرا سال بسال کسو بحال افزوندہ معاش خود کنند و ازالہ امراض زمرۂ انام بغایت اہتمام بظہور رساندہ داروغہا و عمال آں پرگنہ را می باید کہ زمین ہائے مذکور را بتصرف گذارند و اخراجات وکل تکالیف جیولی مزاحمت نسازند و مضاف و مسلم دانستہ بہیچ وجہ پرامون نگروند۔ و ہر سال بفرمان محتاج ندارند تحریر ہذا فی شہر ذلقعدہ ۹۹۵ھ ہجری

جس زمانہ میں حکیم بینا کو اکبر نے کیرانہ میں جاگیر عطا کی اس وقت سے یہ خاندان کیرانہ میں آباد ہوگیا اور اس معمولی قصبہ کی توسیع و تنظیم کی گئی۔ قصبہ کے باہر نواب مقرب خاں اور دیوان عبدالرحیم صاحب نے اپنے محلات کچہریاں اور متعلقین ریاست کے مکانات وغیرہ بنوائے اور ایک عظیم الشان باغ لگوایا۔[۱]

شیخ بینا کے پاس خطرناک کیس بھیجے جاتے تھے۔ یہ عام حکیموں کی طرح غیر ذمہ دارانہ علاج کرنے اور مریضوں کو پھنسانے کے عادی نہیں تھے جس مریض کو ناقابل علاج سمجھتے

[۱] ایک مجاہد معمار ص۱۵

تھے اس کے متعلق صاف طور پر کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ لاعلاج ہے۔ چنانچہ حسین خاں کے بارے میں بھی انہوں نے یہی رائے دی۔

"حسین خاں کوہستان کی جنگ میں انبت پور کے مقام پر ایک بندوق کی گولی سے زخمی ہو گئے اسی کے ساتھ شانہ کے نیچے بان کا ایک سخت اور کاری زخم آیا۔ وہاں سے یہ روانہ ہو کر دریائے گنگ کے راستے سے ہوتے ہوئے گڈھ مکٹیسر کے نواح میں پہنچے جہاں ان کے اہل وعیال رہتے تھے۔ گڈھ مکٹیسر سے آگرہ پہنچے۔ اکبر نے شیخ بینا کو فتح پور سے ان کے علاج کی غرض سے آگرہ بھیجا۔ انہوں نے حسین خاں کو دیکھ کر بادشاہ سے عرض کیا کہ زخم نہایت خطرناک ہے"[1] اس کے بعد حکیم عین الملک کو بھیجا گیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی بھی عین الملک کے ساتھ گئے۔ ان کے حسین خاں سے خاص تعلقات تھے۔ چنانچہ ملا عبدالقادر نے حسین خاں کے زخم اور مرہم پٹی کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے۔

"حسین خاں مجھ سے باتیں کر رہا تھا کہ بادشاہی جراح مرہم پٹی کرنے آ گئے۔ زخم میں ایک بالشت لمبی سلائی چلی گئی۔ جراح سلائی سے زخم کو کریدکرید کر دیکھ رہے تھے لیکن حسین خاں مسکرا رہے تھے۔ اس کی پیشانی پر بل تک نہ تھا۔ مگر یہ زخم اچھا نہ ہو سکا۔ تین چار دن کے بعد حسین خاں کو دست آنے لگے اور ان کا انتقال ہو گیا"[2]

رقعات ابوالفضل میں شیخ بینائی طبیب کے نام ایک خط ہے جس سے ان کی طبی قابلیت وحذاقت نیز تقرب شاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس خط کے ضروری اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔[3]

"آپ نے ظل الٰہی (اکبر) کے لئے جو دوا سربمہر ارسال کی تھی وہ اچھی ساعت میں پیش کر دی گئی۔ بادشاہ نے بے حد شوق ظاہر کیا اور آپ کو یاد بھی کیا۔ اسی وقت تھوڑی سی

---

[1] شیخ بینا طبیب از فتحپور در آگرہ بموجب امر برائے معالجہ او رفتہ و بعرض رسانید کہ زخمے مخوف دارد

[2] منتخب التواریخ ص ۲۰۱ [3] مآثر الامراء جلد سوم

دوا نوش جان فرمائی۔ تھوڑی سی بندہ کو بھی عنایت کی اور فرمایا شیخ بینا ہمارا دانشمند حکیم ہے۔ ہم اس پر بہت نوازش کرتے ہیں اور اُسے بہت پسند کرتے ہیں۔ مجھے حکم دیا کہ یہ عبارت شیخ کو لکھدو۔ " تجھے بادشاہ بہت یاد کرتے ہیں اور آرزو کے ساتھ فرماتے ہیں کہ تعجب ہے کہ تم اتنے عرصہ سے ہم سے الگ ہو۔" ان مسیح الزمانی کے لئے یہی مناسب ہے کہ خط دیکھتے ہی فوراً چلے آئیں کہ بادشاہ ہر گھڑی یاد کرتے ہیں۔ دو تین معاملے ایسے پیش آگئے ہیں کہ بادشاہ بے اختیار آپ کو یاد کرتے ہیں۔ بادشاہ کی ایک حرم کو ایسی بیماری لاحق ہو گئی ہے جو علاج پذیر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شہزادہ کام گار خسرو ایک بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس لئے بادشاہ کی طبیعت بدمزہ ہے۔ اکثر اطبا علاج میں سرگرداں ہیں مگر صحت نہیں ہوتی۔ اب علاج آپ کے آنے پر موقوف ہے۔ لہذا آنے میں تاخیر روانہ رکھیے"۔

یہ خط لاہور سے ۱۰۰۳ھ کو لکھا گیا تھا۔ اس خط سے اس بات کا تو پتہ لگ گیا کہ شیخ بینا اپنے زمانے کے مسلمہ طبیب تھے اور ایسے آڑے وقت میں بھی کام آتے تھے جب دوسرے اطبا ناکام ہو جاتے یا حیران و سرگرداں ہوتے تھے۔ اور شیخ بینا کو بادشاہ کا اس اصرار اور آرزو سے طلب کرنا ظاہر کرتا ہے کہ آپ صرف جراحی میں ہی نہیں بلکہ مشکل اور پیچیدہ بیماریوں کے علاج میں بھی یگانہ روزگار تھے۔

شیخ بینا کی قابلیت و حذاقت کا معترف ان کا زبردست مخالف بھی تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی ان سے غالباً اس لئے ناراض ہو گئے تھے کہ ان کے دوست حسین خاں کے علاج کرنے سے انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ ان سے ایسے برگشتہ ہوئے کہ ان کا ذکر اس انداز سے کیا۔

"دریں ایام خرافت مزاج اوراہ یافتہ وچندے دیگر از مجاہیل اہل اسلام واز علاعین ہندوان ہم ہستند کہ دل بذکر آنہا یاری نمی دہد"۔

ان الفاظ سے یاد کرنے کے باوجود ملا عبدالقادر بدایونی نے ہی ان کی قابلیت کا

اعتراف بھی کیا ہے۔

"شیخ بینا ولد شیخ حسن مطبب سرہندی در جراحی دستے تمام دارد و معالجت فیل از نوادر و غرائب است"[1]

قریب قریب انھی الفاظ میں صاحب "طبقات اکبری" نے شیخ بھینا کا ذکر کیا ہے[2]۔

حکیم بینا کے صاحبزادے نواب مقرب خاں دیوان عبدالحکیم و دیوان عبدالرحیم تھے۔ نواب مقرب خاں کا ...... اصل نام محمد حسن تھا۔ اکبر نے ان کو مقرب خاں کے خطاب سے نوازا تھا اور ان کو شیخ حسو بھی کہا جاتا تھا۔ اوائل عمر سے اکبر کے پاس رہے۔ ان کی تربیت نہایت اچھے طریقے سے ہوئی۔ جہانگیر کہا کرتا تھا۔ شیخ حسو جیسا ملازم شاید ہی کسی بادشاہ کو میسر ہوا ہو۔ شہزادگی کے زمانہ میں جہانگیر کے اصرار کے باوجود شیخ حسو نے سرکار شاہی سے کوئی چیز نہیں لی۔ جب جہانگیر کے منصب میں ترقی ہوئی تو اس نے پہلے شیخ حسو کو منصب عطا کیا۔ چنانچہ اس بات کی تصدیق و تائید صاحب "ماثر الامرا" نے کی ہے۔

"شیخ حسو از صغر سن در خدمت جنت مکانی تربیت یافتہ شگرف پرستاریہا بتقدیم رسانید۔ چنانچہ جہانگیر بادشاہ می گفت کہ مثل حسو خدمت گاری کم بادشاہی داشتہ باشد در ایام شاہزادگی ہر چند شاہزادہ مبالغہ می کرد۔ چیزے از سرکار شاہی نمی گرفت۔ پس اناں بمنصب شاہزادہ افزودہ شد۔ اول کسے را کہ بمنصب امتیاز بخشیدہ اوبود و نظر بریں مراتب بود۔ بعد جلوس بخطاب مقرب خانی و منصب پنج ہزاری بلند مرتبہ گردید۔ دراں عہد از بے پروا مزاجی بادشاہ در کارسازی و معاملہ پردازی مرد سرکار و کار ہر مرد منظور نبود۔"

نواب مقرب خاں جہانگیر کے سچے اور پکے قابل اعتبار اور لائق اعتماد دوست تھے۔ کسی قیمت پر

---

[1] منتخب التواریخ صفحہ ۳۳۵ [2] طبقات اکبری جلد دویم صفحہ ۴۸۳

ان کی دوستی وفاداری اور اعتماد کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اکبر کی علالت کے دوران بعض امرار بالخصوص راجہ مان سنگھ اور خاں اعظم یہ سعی کر رہے تھے کہ اکبر کے پوتے خسرو کو ولی عہد قرار دیکر تخت حکومت پر بٹھادیں۔ مان سنگھ نے مقرب خاں کو بھی اپنا شریک بنانا چاہا۔ مقرب خان نے اپنی عرضداشت کے ساتھ مان سنگھ کی تجویز جہانگیر کے پاس بھیجدی اور جہانگیر کی رفاقت سے منحرف نہ ہوا بلکہ جو امرار جہانگیر سے برگشتہ تھے انکو بھی راہ راست پر لانے کی انہوں نے پوری کوشش کی

مولا اذکار اللہ نے چھوٹی تزک جہانگیری کی عبارت نقل کی ہے جس میں جہانگیر نے نواب مقرب خاں کے بارے میں اپنی خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان کی وفاداری کی تعریف کی ہے۔

"رائے مان سنگھ نے اپنی تجویز و صلاح سے مقرب خاں کو مطلع کیا کہ وہ اس کا شریک ہو۔ اس نے اپنی عرضداشت کے ساتھ اس صلاح کے کاغذ کو میرے پاس بھیجدیا۔ قلعہ میں مقرب خاں بہت میری خدمت کرتا تھا اور اس مدت میں اس نے آرام نہیں کیا وہ امرائے برگشتہ کو پھر راہ پر لایا جب وہ بادشاہی سرکار میں سہ ہزاری تھا تو میں ہر چند اس سے کہتا کہ مجھ سے کوئی چیز لے مگر وہ نہ لیتا۔ جب باپ نے مجھے دہ ہزاری منصب دیا تو اپنے مقربوں سے اول جس شخص کو میں نے باپ کے روبرو منصب دار بنایا وہ مقرب خاں تھا۔ اس کے منصب پر ہزاری کا اضافہ کیا۔ وہ میرا مخلص خیر اندیش تھا۔"[1]

بڑی تزک جہانگیری میں بھی جہانگیر نے نواب مقرب خاں کے قابل اعتماد اور باوفا ہونے کے ساتھ ان کی قابلیت ذہانت کا ذکر کیا ہے۔

"شیخ حسن شیخ بہا کے صاحبزادے ہیں آج کے دن تک میری خدمت میں رہے۔

---

[1] تاریخ ہند ذکاءاللہ جلد ششم ص ۲۸۲

شہزادگی کے زمانہ میں میں نے ان کو مقرب خاں کا خطاب دیا تھا۔ کام میں بہت چالاک و چست ہیں۔ میرے ساتھ شکار میں پیادہ (پیدل) دوڑا ہے۔ تیر و بندوق کا ماہر ہے اور فن جرّاحی میں نامی۔ اور اس کے بزرگ بھی یہ کام خوب جانتے تھے۔ جلوس کے بعد مجھ کو ان پر مکمل اعتماد تھا۔ فرزندان اور متعلقان برادر دانیال کو لانے کے لئے ان کو برہان پور بھیجا تھا اور خانخاناں کو نشیب و فراز کی باتیں اور سودمند نصیحتیں اس کی معرفت کہلوائی تھیں جس کو انہوں نے تھوڑے دنوں میں بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا اور خانخاناں اور امراء کے دلوں میں جو شکوک تھے وہ نکال دیئے اور بڑے بھائی کے متعلقات کو مع اموال واسباب بحفاظت لاہور پہنچا دیا تھا۔"

تزک جہانگیری کی فارسی عبارت بھی ملاحظہ ہو۔

شیخ حسن پسر شیخ بہا است کہ از اوان طفولیت تا امروز ہمیشہ در ملازمت و خدمت من بود و در ایام شاہزادگی بخطاب مقرب خانی سر بلندی داشت۔ در خدمت بسیار چست و چالاک بود و در شکارہا پیادہ در جلوئے من راہ ہائے دور را قطع میکرد و تفنگ را خوب می انداخت و در جراحیہا سر آمد عہد خود است پدران او ہم این عمل را خوب ورزیدہ بودند بعد از جلوس بنا بر کمال اعتمادی کہ باو داشتم بخدمت آوردن فرزندان و متعلقان برادرم دانیال بہ برہان پور فرستادم و بخانخانان سخنان پست و بلند و نصائح سودمند پیغام دادم۔ مقرب خان این خدمت را چنانکہ بائیست در اندک مدتے بتقدیم رسانید در رفع دغدغہائے کہ در خاطر خانخانان و امرای آں جا کردہ بود و انمودہ باز ماندہائے برادرم را بہ صحت و سلامت با کار خانجات و اموال و اسباب در لاہور آوردہ بنظر گذرانید۔" (تزک جہانگیری ص۱۲ جلوس اول)

جہانگیر نے نواب مقرب خاں کو دو ہزاری پھر سہ ہزاری اور اس کے بعد پنج ہزاری اور دو ہزار و پانچ سو سواروں کا منصب عنایت کیا تھا۔[۱]

---

[۱] مقرب خاں را سہ ہزاری ذات و دو ہزار سوار بود۔ پنجہزاری ذات و دو ہزار پانصد سوار مقرر داشتم (تزک جہانگیری ص۱۴۹ جشن دسواں)

جہانگیر نواب مقرب خاں کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا اور ان کی خواہش کی تکمیل کرتا تھا۔ جہانگیر نے نواب مقرب خاں کو کافی جاگیر دی تھی لیکن ان کی آرزو علم اور نقارہ کی تھی۔ جہانگیر نے اس کو بھی پورا کیا[۱]

اسی طرح نواب مقرب خاں کی دلی آرزو تھی کہ وہ گجرات کے حاکم بنیں جس کا اظہار انہوں نے جہانگیر سے شہزادگی کے زمانہ میں کیا تھا۔ اس خواہش کو بھی جہانگیر نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا اور نواب مقرب خاں کو حاکم گجرات مقرر کیا[۲] پھر دہلی کا حاکم مقرر کیا[۳] اس کے بعد صوبہ بہار کا انتظام ان کے سپرد ہوا[۴] اور آگرہ کا حاکم بھی ان کو بنایا گیا[۵]۔

جہانگیر اپنے اہم کام نواب مقرب خاں کے سپرد کرتا تھا اور صوبوں کے حاکموں کی دیکھ بھال کے لئے بھی ان کو مقرر کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان کو جہانگیر نے

---

[۱] چوں نظر بر خدمت قدیم مقرب خاں نمودم بخاطر رسید کہ آرزوے در دل او بناید گذاشت منصب اورا کلاں کردہ بودم جاگیرہائے خوب یافتہ بود آرزوے علم و نقارہ داشت بایں عنایت ہم سرفراز و کامروا گشت (تزک جہانگیری ص۱۲۳ جشن ساتواں) [۲] مقرب خاں کہ از خدمتگاران قدیم این درگاہ است از زمان شہزادگی مکرر استدعائے صوبۂ گجرات از من میکرد چوں ایں نوع حرکتے از عبداللہ خاں بوقوع آمد بخاطر رسید آرزوئے خدمتگار قدیمی خود برآوردہ اورا بجائے خان مذکور باحمدآباد فرستم در ہماں روز ساعت اختیار نمودہ بہ تسلیم حکومت و صاحب صوبگی صوبہ مذکور اورا کامروائے صورت و معنی ساختم (تزک جہانگیری ص۱۶۲ جشن گیارھواں) [۳] حکومت دہلی و حفظ و حراست آں ولایت بمقرب خاں مقرر گشت (۱۰۹ جشن ساتواں) [۴] مقرب خان بصاحب صوبگی بہار سرفراز گشتہ جوالصوب شتافتہ مشار الیہ خود را بدرگاہ رسانید کہ زمین بوس نمودہ متوجہ مقصد گردد بنابرین روز مبارک شنبہ دوم خورداد فیل باتلا ببرد دو اسپ و کپیوہ مرصع عنایت نمودہ رخصت فرمودم و پنجاہ ہزار روپیہ برسم مساعدت مرحمت شد (تزک جہانگیری ۱۷۰ جشن چودھواں) [۵] مقرب خاں را کہ از قدیمان و بابریان ایں دولت است بحکومت و حراست آگرہ بلند پایگی بخشیدہ رخصت فرمودم۔ (تزک جہانگیری ص۲۷۵ جشن اٹھارواں)

بندر گودہ کے وزیر کی جانچ کرنے اور وہاں سے عمدہ اور عجیب و غریب چیزیں لانے کے لئے بھیجا وہ وہاں کافی مدت رہے۔

انہوں نے حاکم گودہ کے متعلق معلومات حاصل کی اور حسب ذیل عجائب اپنے ساتھ لائے اور جہانگیر کو دیئے جس کا ذکر تزک جہانگیری میں کیا ہے [1]

"ایک مدت تک نواب منقرب خاں وہاں رہے اور عمدہ چیزیں فرنگیوں کے مشورہ سے خرید کر لائے جو کئی مرتبہ میری نظر سے گذریں اس میں ہر قسم کے تحفے تھے اور چند جانور ان میں عجیب و غریب تھے۔ نہ میں ان کا نام جانتا تھا۔ میرے والد نے اپنے واقعات میں اکثر جانوروں کی صورتیں لکھی ہیں لیکن ان کی تصویر نہیں بنوائی۔ میں نے جہانگیر نامہ میں ان کی تصویریں بنوادی ہیں۔ ان کے متعلق جیسے سننے سے تعجب ہوتا ہے ویسے ہی دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے۔ ایک جانور ان میں مورنی سے بڑا تھا اپنی دم کو مستی میں طاؤس کی طرح کرلیتا ہے اور ناچتا ہے۔ مرغ کی طرح اس کے پاؤں اور چونچ ہے اس کے سر اور گردن کا ہر وقت نیا رنگ ظاہر ہوتا ہے مستی میں ایسا سرخ ہوجاتا ہے گویا مرجان میں جڑا ہوا ہے اور تھوڑی دیر میں وہی جگہ سفید ہوجاتی ہے اور روئی کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ مستی میں گوشت کے ٹکڑے کے بقدر ایک بالشت سونڈ کے مانند لٹک آتی ہے اور پھر جب اوپر کھینچتا ہے تو بارہ سنگھی کے باقی سینگھ کی طرح دو دو انگشت کھڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور آنکھوں کے کنارے ہمیشہ فیروزہ رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ نہیں بدلتا اور باقی پروں کا رنگ مختلف دکھائی دیتا ہے۔

---

[1] مقرب خاں کہ از بندہائے عمدہ و محرم قدیم الخدمت جہانگیر لیست بمنصب سہ ہزار ذات دو ہزار سوار سرفرازی یافتہ از بندر کھنبایت رسیدہ سعادت ملازمت دریافت اورا بجہت بعضے مصلحت ہا حکم کردہ بودم کہ بہ بندر گودہ رفتہ وزیرے را کہ حاکم گودہ است ببینید و نفائسے کہ در آنجا بدست آید جہت سرکار خاصہ شریفہ خریداری نماید۔ (تزک جہانگیری ص ۱۰۵ جشن ساتواں)

برخلاف طاؤس کے پروں کے - ایک بندر عجیب طرح کا لا تھا کہ ہاتھ پاؤں سر اور گوش اس کے بندر کے سے تھے اور منہ لومڑی کا سا اور آنکھیں باز جیسی لیکن باز کی آنکھوں سے بڑی تھیں۔ وہ سر سے لے کر دم تک ایک گز کا تھا - بندر سے نیچا اور لومڑی سے اونچا - بدن کے بال بٹیر کی طرح خاکستری رنگ کے کانوں سے ٹھوڑی تک - سرخ دم آدھ گز سے کچھ بڑی، بندروں کی دم کے برعکس - اس کی دم بلّی کی طرح گری ہوئی تھی - کبھی ہرن کے بچے کی طرح بولتا - غرض عجیب جانور ہے - جنگلی جانوروں میں جس کو چکور کہتے ہیں کسی سے نہیں سنا کہ اس نے گھر میں انڈے بچے دیئے ہوں - میرے والد نے بھی بہت کوشش کی - لیکن بچے نہ ہوتے اور میں نے جب ان کے نر و مادہ کو بڑی تعداد میں اکٹھا رکھا تو انہوں نے انڈے دیئے - پھر میں نے مرغی کے نیچے رکھ کے نکلوائے اور دو سال میں تقریباً اسی بچے ہو گئے - لوگوں نے تعجب کیا اور کہا ہم نے ولایت میں بہت کوشش کی لیکن ان کے انڈے بچے نہیں ہوتے -"

نواب مقرب خاں جہانگیر کی خواہشوں کو حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے - جب رانا مفتوح ہوا تو جہانگیر کے صاحبزادے خرم نے اجمیر میں آکر ایک موتی قیمتی ساٹھ ہزار روپے کا دیا - جہانگیر کا خیال تھا کہ اگر اسی طرح کا دوسرا موتی مل جائے تو وہ ان موتیوں کا بازو بند بنا کر اپنے بازو میں باندھے - چنانچہ نواب صاحب نے جہانگیر کی اس آرزو کو پورا کرنے کے لیے دوسرا موتی قیمتی بیس ہزار کا لاکر جہانگیر کو دیا[1]

نواب مقرب خاں جہانگیر کو تحائف بھی پیش کرتے تھے - ایک مرتبہ انہوں نے جواہرات مرصع، سونا چاندی کے فرنگستانی برتن، دوسرے نفیس تحفے، لونڈی، غلام، عربی گھوڑے اور ہر قسم کی عمدہ چیزیں جہانگیر کو پیش کیں جو اس کے ملاحظہ خاص میں ڈھائی مہینے رہیں[2]

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۸۵ جشن بارھواں [2] تزک جہانگیری صفحہ ۸۰ جشن پانچواں

نواب مقرب خاں نے ایک تصویر جہانگیر کو ایسی بھیجی تھی جس کے بارے میں فرنگی کہتے تھے کہ یہ شبیہ شاہ تیمور کی اس وقت کی ہے جب سلطان بایزید یلدرم روم کے لشکر میں قید ہوا تھا۔ اس وقت استنبول کا حاکم نصرانی تھا جس نے اپنا ایک وکیل معہ تحائف و ہدایا اطاعت و بندگی کے لئے بھیجا تھا۔ جن کے ہمراہ ایک مصور آیا تھا اس نے شاہ تیمور کی یہ تصویر اتاری تھی۔ جہانگیر نے اس تصویر کو دیکھ کر کہا۔ اگر یہ شاہ تیمور کی صحیح شبیہ ہے تو اس تحفہ سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔ چونکہ شاہ تیمور کے اولاد کے حلئے سے یہ تصویر مطابقت نہیں کھاتی اس لئے اس پر یقین نہیں کرتا[1]

جب جہانگیر کیرانہ گیا تو اس وقت نواب مقرب خاں وہاں موجود نہیں تھے۔ ان کے وکیلوں نے جہانگیر کو اکانوے قطعہ یاقوت چار قطعہ الماس برسم پیشکش، ہزار گز مخمل بصیغہ پا انداز اور سو شتر برسم تصدق پیش کئے جن کے بارے میں جہانگیر نے حکم دیا کہ ان کو مستحقوں میں تقسیم کر دو[2]

نواب مقرب خاں جہانگیر کے معالج تھے جس کا ذکر اس نے تزک جہانگیری کے شروع میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری جگہ اس نے فصد کھولنے کے ساتھ کھپوہ مرصع عنایت کرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ نواب مقرب خاں کے علاوہ ان کے بھتیجے قاسم نے بھی جہانگیر کا علاج کیا تھا یعنی فصد کھولی تھی جس پر جہانگیر نے ان کو دو ہزار روپے اور خلعت دیا تھا۔ تزک جہانگیری میں اس انعام کا ذکر ان الفاظ میں ہے اور نواب مقرب خاں کی بھی تعریف کی ہے۔

"مقرب خاں کہ دریں فن ید طولیٰ دارد ہمیشہ او فصد من کردہ ممکن کہ ہرگز خطا نکردہ باشد دو بار خطا کرد بعد ازاں قاسم برادر زادہ او فصد کرد خلعت دو ہزار روپیہ بمشار الیہ دادہ"
(جشن سترھواں صہ ۳۴۷)

---

[1] تزک جہانگیری صہ ۱۰۲، جشن تیسرا [2] تزک جہانگیری صہ ۳۲۴ جشن پندرھواں
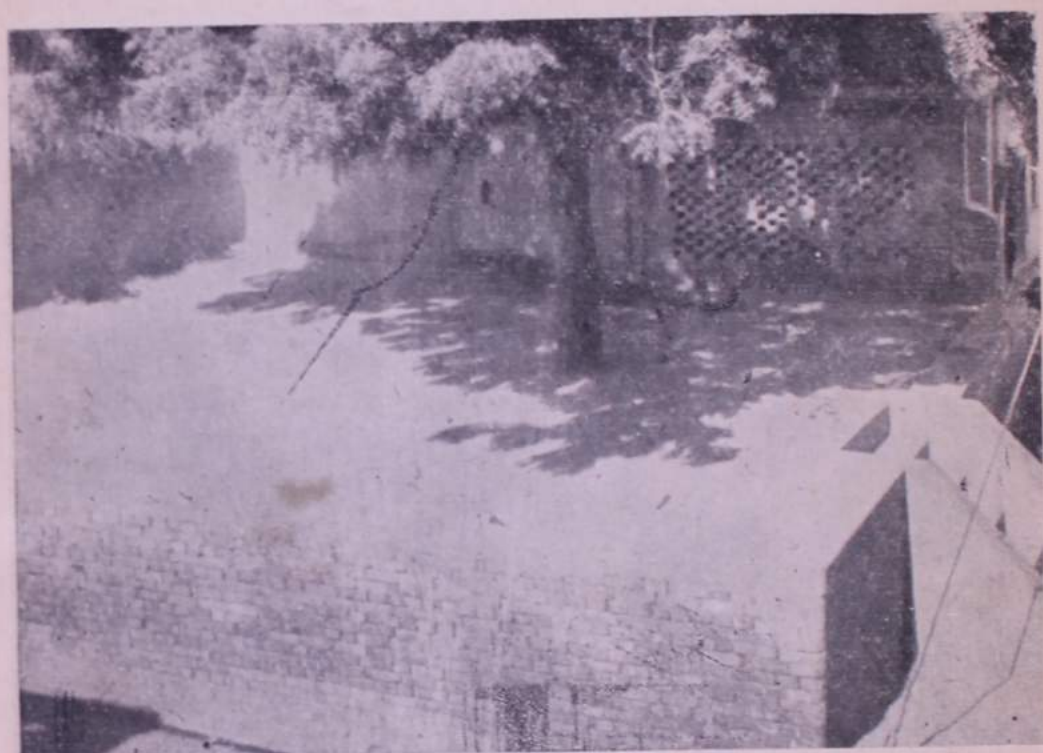
دربار دروازہ کے سامنے کا چبوترہ جسے دربار کے مجاہدوں کے خلاف
انگریزی فوجوں نے دمدمہ کے طور پر استعمال کیا تھا۔

اقبال نامہ جہانگیر کے مصنف نے بھی اس باغ کی تعریف کے ساتھ اس باغ کے آموں کی خصوصیت بیان کی ہے وہ لکھتا ہے۔

"مقرب خاں نے ایک شاندار باغ بنایا ہے جو آم اس کے باغ میں ہوتے ہیں، تمام ہندوستان میں کہیں نہیں ہوتے۔ دکن گجرات اور دور دراز ملکوں سے جہاں آموں کی تعریف سنی بیج لاکر اس باغ میں بوئے ہیں جو خوب پھلتے ہیں"[1]

نواب مقرب خاں نے ملک کی حفاظت کے لئے دشمنوں سے مقابلہ کیا اور جہانگیر کی جان بچانے کے لئے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ چنانچہ جب نواب مقرب خاں گجرات کے حاکم تھے۔ اس وقت فرنگیوں نے بے قولی کر کے چار جہاز اجنبی بندر سورت میں تاراج کئے اور مسلمانوں کی کثیر جماعت کو اسیر کر کے ان کا مال و متاع چھین لیا۔ بادشاہ کو یہ طریقہ فرنگیوں کا ناگوار گذرا۔ اس کا تدارک کرنے کے لئے نواب مقرب خاں کو گھوڑے اور ہاتھی دے کر روانہ کیا[2] چنانچہ نواب صاحب نے ان کا قلع قمع کیا۔ زور توڑا اور ہمتیں پست کیں۔

مرزا جو قلعہ اور بندر سورت پر قبضہ کرنے کے لئے بڑے ساز و سامان سے آیا تھا اس وقت انگریز وہاں پناہ لینے کے لئے آئے ہوئے تھے ان سے مرزا کا مقابلہ ہوا انگریزوں نے اس کے کافی جہاز جلائے مرزا ناکام ہوا مقابلہ نہ کر سکا اور بھاگ گیا اور اس نے نواب مقرب خاں کو فریب دینے کے لئے اپنے وکیلوں کے ذریعہ یہ کہلوا بھیجا۔ انگریز مجھ سے بلاوجہ لڑے ہیں۔ میں صلاح کے لئے آیا تھا لڑنے کے لئے نہیں[3]

---

[1] اقبال نامہ جہانگیری ص ۹۰ [2] ہمیں ماہ خبر رسید کہ فرنگیاں کو دہ بیقولی نمودہ چہار جہاز اجنبی را از جہازات مقرر بندر سورت بود در حوالی بندر تاراج نمودند وجمع کثیر را از مسلمانان اسیر نمودہ مال و متاع کہ دوران جہا زبود متصرف گشتند ایں معنی برخاطر گراں آمدہ مقرب خاں را کہ بندر مذکور حوالہ او بود بجہت تدارک تلافی ایں امر اسپ و فیل و خلعت دادہ (تزک جہانگیری آٹھواں جشن ص ۱۲۵

[3] تزک جہانگیری نواں جشن ص ۱۳۴

مہابت خاں نے اپنی بیٹی کی شادی جہانگیر کی اجازت کے بغیر کردی تھی۔ جہانگیر کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس کو بُرا لگا اس نے دولہا کو جیل میں ڈال دیا اور مہابت خان نے بیٹی کے جہیز میں جو سامان شادی میں دیا تھا اس کو بھی ضبط کر کے شاہی خزانے میں داخل کرنے کا حکم دیا جس سے مہابت خاں بہت پریشان ہوا۔ اور ہر وقت مغموم و متفکر رہنے لگا۔

اسی دوران میں جہانگیر کا قیام دریائے بھٹ کے کنارے ہوا۔ جہانگیر کے کوچ سے ایک روز قبل دستور کے مطابق امراؤ لشکر نے دریا عبور کرنا شروع کیا۔ تمام امراء اور نامی منصبدار یہاں تک آصف خاں۔ فدائی خاں۔ خواجہ ابوالحسن جیسے مقربان خاص بھی دریا سے پار چلے گئے اور جہانگیر کے پاس سوائے نور محل، صادق خاں امیر منصور بدخشی، شجاع خاں، نواب مقرب خاں اور چند عہدیداروں اور خواص کے کوئی نہیں رہا۔ جب مہابت خاں کو معلوم ہوا کہ جہانگیر کے پاس ذمہ دار لوگ نہیں ہیں تو وہ چار پانچ ہزار راجپوتوں کے ساتھ اپنی قیام گاہ سے نکل کر پل پر پہنچا وہاں دو ہزار سوار اس لئے متعین کئے اگر کوئی پل سے آنے کا ارادہ کرے تو پل میں آگ لگا دیں اور مقابلہ کریں۔ خود مہابت خاں پانچ ہزار سواروں کے ساتھ جہانگیر کے خیمہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب خیمہ پر پہنچا تو اس کے ساتھیوں نے خیمہ کو گھیر لیا اور چار پانچ سو راجپوتوں کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا جس سے جہانگیر بہت برہم ہوا۔ دو مرتبہ تلوار پر ہاتھ رکھا لیکن ہر مرتبہ منصور بدخشی نے ترکی میں سمجھایا کہ اس وقت یہ بات مناسب نہیں ہے۔ اس لئے جہانگیر نے صبر و تحمل کا اظہار کیا۔

مہابت خاں نے ہوشیاری سے کام لیا۔ کورنش بجالایا اور شادی کے واقعات اور آصف خاں کی عداوت کا حال سنا کر کہا کہ میں حضور کی پناہ میں آیا ہوں۔ اگر قتل کی سزا کا مستحق ہوں۔ تو مجھے اپنے سامنے قتل کر دیجئے مگر اس دشمن کے حوالے نہ کیجئے۔

جوں جوں وقت گذرتا رہا۔ مہابت خاں جہانگیر کی خوشامد و چاپلوسی کر کے اپنی بے گناہی ثابت کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے عرض کیا کہ سواری اور شکار کا وقت ہے۔ جہانگیر نے لباس

بدلنے اور نور محل کے پاس مشورہ کرنے کے لئے جانے کا ارادہ کیا تو مہابت خاں مانع ہوا۔ اور کہا حضور یہیں لباس بدل لیں اور جلدی سوار ہوں اور غلام کو اپنے ہمراہ لے چلیں۔ جہانگیر کو مجبوراً اُس کی بات ماننی پڑی۔ لباس و جواہر پہنا۔ مہابت خاں جہانگیر کا ہاتھ پکڑ کر تسلی دیتا ہوا خیمہ سے باہر سوار کرنے کے لئے لایا۔ جہانگیر کے ساتھیوں نے جہانگیر کے پاس گھوڑا، ہاتھی بھیجنے کی کوشش کی لیکن مہابت خاں کے آدمیوں نے منع کیا اور خود مہابت خاں نے اپنا گھوڑا پیش کیا۔ جہانگیر اس پر سوار نہ ہوا۔ شاہی گھوڑا طلب کیا۔ اس پر سوار ہوا۔ لیکن چاروں طرف سے راجپوتوں نے گھیر لیا۔ چند قدم چلے ہوں گے کہ مہابت خاں اپنا ہاتھی لایا اور منت سماجت کر کے جہانگیر کو اس پر سوار کیا تاکہ جہانگیر بالکل بے بس ہو جائے۔ اس نے جہانگیر کے دونوں طرف دو مسلح راجپوت بٹھائے اِسی وقت درو غہ فیل خانہ گجپت خاں شاہی ہاتھی لایا تاکہ جہانگیر اس پر سوار ہوں۔ سوار ہونے سے قبل ہی مہابت خاں کے اشارہ پر راجپوتوں نے داروغہ فیل خانہ اور اس کے لڑکے کو مار دیا[1] اسی اثنا میں نواب مقرب خاں خوصہ کے اندر جہانگیر کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ جس کی وجہ سے اُن کی پیشانی پر زخم آیا اور خون منہ اور سینہ پر بہنے لگا[2] غرض مہابت خاں جہانگیر کو اپنے خیمہ میں لے گیا اور وہاں بادشاہ کی تسلی و تشفی کرتا رہا اور ہر وقت دست بستہ کھڑا رہتا تھا۔ اسی دوران میں موقع پا کر نور محل اپنے امیروں کے پاس پہنچ گئی۔ اور طے کیا کہ مہابت خاں کی سرزنش کرنے اور جہانگیر کو رہائی دلانے کے لئے نور جہاں کو ہاتھی پر لے جایا جائے۔ اور مقابلہ کیا جائے۔ اس بات کی اطلاع جب جہانگیر کو پہنچی تو اس نے نواب مقرب خاں صادق خاں بخشی اور امیر منصور بدخشی کے ذریعہ نور محل وغیرہ کو پیغام پہنچایا کہ اس وقت

---

[1] دریں اثنا مقرب خاں خود را رسانیدہ با ستر ضائی اندروں حوضہ نزدیک بآنحضرت رفتہ نشست ظاہر و دریں آشوب گاہ بے تیزی زخمی بر پیشانی مقرب خاں رسید۔ (تزک جہانگیری اکیسواں جشن صـ ۴۰۳)

[2] تاریخ ذکاء اللہ جلد چھٹی صـ ۲۱۱

کیرانہ کی جامع مسجد کا دروازہ۔ جس کے سامنے کے میدان میں مجاہدین کا اجتماع ہوتا ہے۔ اب یہاں بازار ہے۔
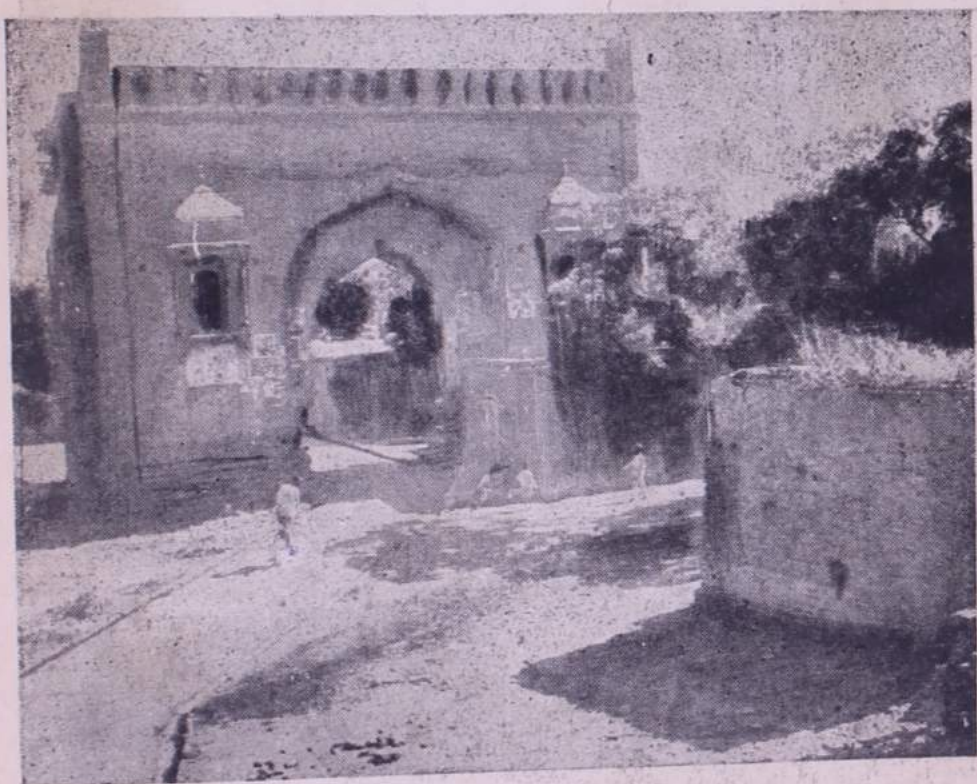
نواب دروازہ: جو نواب مقرب خاں کے عالیشان محل کا صدر دروازہ تھا

لڑنا صحیح نہیں ہے[1]

نواب مقرب خاں ہی جہانگیر کے معاون و معین نہ تھے بلکہ ان کے خاندان کے لوگوں نے بھی جہانگیر کا ساتھ دیا تھا اور جاں نثاری کی تھی اور جہانگیر کی فوج میں ان کے قریبی رشتہ دار اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ چنانچہ ساتویں جشن میں جہانگیر نے اسلام خاں کو بنگال کا حاکم مقرر کیا تھا۔ یہ نوجوان تھا۔ لیکن نظام حکومت کے معاملہ میں کافی تجربہ رکھتا تھا۔ چنانچہ عثمان افغان جو بڑا فسادی تھا اور اکبر کے زمانے میں کئی دفعہ شاہی فوج سے مقابلہ کر چکا تھا اور زیر نہیں ہوا تھا۔ اس کے شر کو ختم کرنے کے لئے اسلام خاں کو مقرر کیا اور ہدایت کی کہ اس کو پہلے اس بات پر راضی کیا جائے کہ جہانگیر کی اطاعت پر تیار ہو جائے۔ اگر اس پر آمادہ نہ ہو تو مخالفوں کی طرح اس کو سزا دی جائے۔ ان ایام میں شجاعت خاں اسلام خاں کے پاس پہنچا۔ اس کو لشکر کا سردار مقرر کیا اس کے ہمراہ شاہی معتمدوں میں سے کشور خاں، افتخار خاں، سید آدم بارہہ، شیخ اچھے برادر زادہ مقرب خاں اور معتمد خاں جو فوجی افسر تھے روانہ کئے جب شاہی فوج اس ملک کے قلعہ کے قریب پہنچی تو کئی وکیل عثمان افغان سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ چونکہ اس کا خیال بنگالہ اور دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے کا تھا۔ وہ اطاعت کے لئے تیار نہیں ہوا اور جنگ کے لئے آمادہ نظر آیا۔ تو اس وقت طے ہوا کہ اسی جگہ معرکہ ہو۔ چنانچہ نو محرم یکشنبہ کو شجاعت خاں نے جنگ کا بگل بجایا۔ عثمان خاں نالے کے کنارے پر مقابلہ کے لئے آیا۔ اس نے اس وقت اپنے مست ہاتھی کو شاہی ہراول فوج میں چھوڑ دیا۔ معرکہ آرائی خوب ہوئی۔ چنانچہ جہاں عثمان افغان کے آدمی کام آئے۔ وہاں شاہی فوج کے سرداروں میں سید اعظم بارہہ اور شیخ اچھے نے بھی جام شہادت نوش کیا

---

[1] دریں مرتبہ اوّل آں جاہل خیرہ سر نیل مست جنگی خود را پیش انداختہ بر فوج ہراول می تازد بعد از رد و خورد بسیار از سرداران ہراول سید اعظم بارہہ و شیخ اچھے بدرجہ شہادت میرسند۔

(تزک جہانگیری ساتواں جشن ص ۱۰۳)

ایک انگریز کپتان ہاکنس جہانگیر کے دربار میں تھا جو ترکی زبان جانتا تھا۔ وہ سورت میں ۱۶۰۸ء میں ہیکٹر جہاز میں آیا تھا۔ اس وقت گجرات کے حاکم نواب مقرب خاں تھے۔ انہوں نے اس سے بہت سی ولایتی چیزیں خریدی تھیں۔ ہاکنس کی ہندوستان میں آنے کی غرض انگریزوں کی تجارت کو جمانا اور فروغ دینا تھا جس سے ہندوستانیوں کو ہی خطرہ نہ تھا بلکہ پرتگیزی بھی اس کے مخالف تھے جو نواب مقرب خاں کو بھی بہکاتے تھے۔ انگلینڈ کا جیمس اول چھچھوندر کا بادشاہ اور گریٹ برٹن ایک ذلیل و حقیر جزیرہ ہے"۔

ہاکنس جانتا تھا کہ نواب مقرب خاں اور ان کے ساتھی ان کے مقاصد کو پورا نہ ہونے دیں گے اور مخالفت کرینگے اس لئے اس نے نواب مقرب خاں کی جہانگیر سے مخالفت کرنی شروع کردی تھی۔ ان پر طرح طرح کے الزامات لگاتا اور شکایتیں کرتا تھا۔ لیکن نواب مقرب خاں دبنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے جہانگیر سے کہا اگر انگریزوں کو تجارت کی ممانعت کردی جائے تو میں گوا سے لعل لاؤں گا۔ نواب مقرب خاں کی بات کی تائید کرتے ہوئے ایک امیر نے جہانگیر سے کہا اگر ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جم جائیں گے تو وہ ہندوستان کے مالک بن جائیں گے۔ اس پر جہانگیر کی آنکھیں کھلیں اور اس نے ہندوستان میں انگریزوں کی تجارت کی ممانعت کا فرمان جاری کردیا، اور ہاکنس بھی جو ۱۶۱۱ء میں معہ اپنی میم کے دربار آگرہ میں چلا گیا تھا۔ دو برس تک کوشش کرتا رہا کہ انگریزوں کو ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت مل جائے لیکن نواب مقرب خاں کی وجہ سے ناکام ہوا اور اس کی دو برس کی محنت خاک میں مل گئی[1]

نواب مقرب خاں نے اپنی دانشمندی اور حکمت عملی سے سات جہاز جو سالہا سال سے غرق تھے سمندر سے برآمد کرائے علاوہ اور چیزوں کے ان جہازوں میں ستون کسوٹی بھی تھا۔ جب ان اشیا کی برآمدگی کی اطلاع جہانگیر کو ہوئی تو اس نے یہ تمام سامان ان کو دیدیا

[1] تاریخ ہند ذکاء اللہ جلد ششم صہ ۲۵۲

اس کے بعد مقرب خاں نے اپنے رہنے کے لئے مکان بنوایا۔ جس میں دو تالاب پختہ بنوائے تالاب کے کنارہ پر ایک بنگلہ تعمیر کیا۔ اس پر چبوترہ بنوا کر ستون کسوٹی لگوائی اور ایک گڑھی بنوائی، دکھن سے بیج منگوا کر پانچ باغ لگوائے۔ سولھویں جلوس میں جہانگیر کیرانے آیا چنانچہ تزک جہانگیری میں جہانگیر نے لکھا ہے۔

مخلص و محب خاص یار وفادار مقرب خاں متمنی تھا کہ میں اس کے یہاں آؤں۔ میں نے اُس کے گھر کو قدوم میمنت لزوم سے قابل رشک بنا دیا اور اس خیر خواہ قدیم کو بیش قیمت سامان قیمتی جواہرات تین لاکھ روپے کے، ایک باغ اور ایک وسیع مکان دیا[1] یہ جگہ محلہ نواب دروازہ کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

ایک معتبر راوی بیان کرتا ہے کہ ایک روز جہانگیر بادشاہ سے کسی نے کہہ دیا کہ مقرب خاں کے پاس ایک ایسی شے ہے جو حضور کے پاس نہیں ہے جب اس نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ "ستون کسوٹی" ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ مقرب خاں کو لکھو کہ "حضور کی خدمت میں بھیجدو۔" مقرب خاں کے وکیل نے اسی وقت ان کو اطلاع دی تو انہوں نے ستون کسوٹی اپنے مکان سے اکھڑوا کر راتوں رات پانی پت کی خانقاہ میں لگوا دی تیسرے روز جب فرمان شاہی آیا تو انہوں نے جواب دیا۔ آپ کا فرمان آنے سے قبل کسوٹی خانقاہ کے لئے بھیجدی گئی ہے۔ اگر حکم ہو تو وہاں سے اکھڑوا کر بھیجدوں۔ فرمان آیا ضرورت نہیں۔ خانقاہ میں یہ کسوٹی جلدی میں لگ گئی تھی اس لئے اس پر اس وقت نواب صاحب کچھ لکھوا نہیں سکے تھے۔ بعد میں ان کے صاحبزادے حکیم رزق اللہ صاحب نے حسب ذیل تاریخی کتبہ لکھوایا۔[2]

---

[1] ایک مجاہد معمار ص ۱۵

[2] تذکرہ اولیا جلد دوم ص

منظہرِ نورِ جمالست و جلال	ہمچو عیسیٰ مردہ بخشند روان
بوعلی چوں بوعلی سیناش کرد	زاں سبب گیت آں ارسطوئے زماں
تا نیا فرمود ایواں چو خلد	ہر ستون سنگ محک در زیر آں
از خرد جستم غبار سال او	چوں طلائی کیمیا کرد عیاں
سال و تاریخ بنائش در حساب	شہ بوالاجاہ رزق اللہ خاں

جہانگیر کے دربار کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک تاجر ایک انگوٹھی دربار میں لایا۔ اس نے جہانگیر کے حضور میں پیش کی، درباریوں میں سے کوئی شناخت نہ کر سکا۔ یہ کس چیز سے بنائی گئی ہے، مقرب خاں نے دیکھ کر عرض کی کہ پانی میں ڈالدی جائے۔ پانی میں ڈالی گئی تو آریدہ کا رنگ متغیر ہوگیا جس سے معلوم ہوگیا کہ وہ مصری سفیدے تراشی گئی ہے [1]

شاہجہاں جب تخت حکومت پر بیٹھے تو ۲۲ جمادی الثانی ۱۰۳۷ھ کو مقرب خاں حکیم مسیح الزماں کے ساتھ لاہور سے آگرہ آئے اور کورنش کا شرف حاصل کیا۔ بادشاہ نے ان کو خلعت خاص عنایت کیا۔ چونکہ مقرب خاں بوڑھے ہو چکے تھے اس لئے ان کو ملازمت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا گیا تاکہ وہ آرام و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ کیرانہ کی جاگیر کی آمدنی ایک لاکھ روپیہ کی تھی۔ [2]

نواب مقرب خاں بہت خوش نصیب انسان تھے۔ زمانے نے جیسی ان کے ساتھ موافقت کی شاید کسی کے ساتھ کی ہو۔ زندگی میں کبھی زمانہ ان کے خلاف نہ ہوا جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو ایک ہزار عورتوں کے ہجوم میں نہایت مسرت اور بے فکری کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کے تمام کام عورتوں کے سپرد تھے۔

نواب مقرب خاں حضرت کبیر الاولیاء کے مزار کے متولی تھے

---

[1] فرنگیوں کا جال ص ۲۲۹ [2] بادشاہ نامہ جلد اول ص ۱۵۹

۲۷ ذیقعدہ ۱۰۵۶ھ میں شاہجہاں کو اطلاع ہوئی کہ مقرب خاں ولد شیخ مینا کا انتقال ہوگیا جس کی عمر نوے برس کے قریب تھی[۱] ان کا مزار حضرت بو علی شاہ قلندر رحمۃ اللہ کے مقبرہ کے پاس پانی پت میں ہے۔

مقرب خاں صاحب کے ایک صاحبزادے رزق اللہ خاں صاحب تھے جو نامور دادا اور باکمال باپ کے صحیح جانشین تھے۔ شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہشت صدی منصب پر فائز ہوئے۔ عالمگیر کے زمانہ میں ان کو خانی کا خطاب ملا اور منصب کا بھی اضافہ ہوا ۱۰ سنہ جلوس عالمگیری میں ان کا انتقال ہوا۔ چنانچہ صاحب "ماثر الامرا" ایکے متعلق تحریر کرتے ہیں[۲]

"رزق اللہ اعلیٰ حضرت بمنصب ہشت صدی رسید در جراحی و طبابت مہارتے وافی داشت در زمان عالمگیری بخطاب خانی وافزودے منصب امتیاز یافت و در سال دہم درگذشت"
یہ شاہجہاں کا علاج بھی کرتے تھے۔ انکے کچھ دشمن بھی تھے جنھوں نے ان کو بدنام کرنے کے لئے ان پر یہ الزام لگایا تھا کہ ۱۰۶۷ھ میں انھوں نے بادشاہ کے جسم پر ملنے کے لئے ایک تیل بنایا تھا جس کے ملنے سے بادشاہ کو بخار اور ہیچش اور حبس بول کی شکایت ہوگئی تھی اور یہی عارضہ ان کی موت کا باعث ہوا[۳]

حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پت کی خانقاہ میں جو مسجد سرخ ہے وہ شیخ رزق اللہ صاحب نے ہی تعمیر کرائی تھی[۴] یہ ۱۶۶۸ء میں فوت ہوئے

شیخ سعد اللہ مسیحا کیرانوی کو نواب مقرب خاں نے منہ بولا بیٹا بنایا تھا جو شعراء میں شہرت یافتہ تھے[۵] انہوں نے رام وسیتا کا قصہ ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ملا شیدا فتحپوری سے ان کے قریبی تعلقات تھے اور کمال کا اتحاد تھا چنانچہ

---

[۱] اطبائے عہد مغلیہ [۲] ماثر الامراء ص ۳۸۲ [۳] عمل صالح جلد سوم ص ۳۴۹ [۴] تذکرہ اولیاء ہند دوم ص ۱۱۶ [۵] روز روشن ص ۶۲۸۔

اسی سلسلے میں انہوں نے کہا ہے۔

در منا و شیدا نماند اندر حقیقت امتیاز | من بشیدا مانم و ماند بمن شیدائے من
در بزم عاشقاں چو بر آرم ز سینہ آہ | چوں ہیزمے کہ دود کند دور م افگنند
گر از خراش دلم منکرے ببیں بر جسم | کہ پوست کندہ سخن میکند ادا تا خن
برخوان عطائے تو مسیحا محروم | چوں صورت تصویر کہ باشد برخواں

مثنوی رام وسیتا کے چند اشعار ؎

کنم من سر فدائے نام سیتا | چہ یکتا سر چیدہ نامر چہ سی تا
گریباں زمیں شد ناگہاں چاک | در آمد ہمچو جاں در قالب خاک
چوں آب انداخت برفرق آں بت مست | زدستش آب ہم میرفت از دست
قدم چوں بعد غسل از آب برزد | نہال آتشیں از آب سر زد
قوی شد قول اہل ہند گویا | کہ ماہ آمد بروں بے شک ز دریا

حکیم دیوان عبدالرحیم صاحب اکبر کے زمانہ میں زمرۂ اطبا میں ملازم تھے[۱]۔ آپ نواب مقرب خاں کی گورنری دکن و گجرات وغیرہ کے زمانہ میں طبیب جہانگیر رہے۔ ان کی اولاد میں آج تک طب کا سلسلہ اور خدمت خلق کا جذبہ باقی ہے۔ دیوان عبدالرحیم صاحب کی اولاد میں ہر ایک اپنے وقت کا کامل فن طبیب تھا۔ ان کے صاحبزادے خواجہ چشتی، خواجہ گوہر، حکیم اللہ دیا، خواجہ فضل، خواجہ امین الدین۔ خواجہ جمال اللہ، خواجہ دوست محمد، حکیم قاسم، خواجہ یار محمد تھے۔

دیوان عبدالرحیم کا مکان محلہ نواب دروازہ میں تھا اور دیوان خانہ ان کا عدل گڑھ میں تھا جس کو عوام بادل گڑھ کہتے تھے۔ انہوں نے اپنی حیات میں سکونتی مکان شیخ حسینی اور شیخ اللہ دیا کو دیکر دوسرا مکان تعمیر کیا تھا اور اس کا نام دربار مقرر کیا تھا شیخ

---

[۱] آئین اکبری جلد اول ص ۱۸۵

فضل لپسر سوہی جو درباری مصاحب تھے۔ ان کا مسجع مہر یہ تھا۔

فضل شد بدل وجاں غلام شاہجہاں

اس کے اجد شیخ قطب الدین صاحب اور شیخ بدرالدین صاحب جو دونوں سگے بھائی تھے اور خواجہ فضل کے صاحبزادوں میں سے تھے جب اُن کی جائداد ان دونوں میں تقسیم ہوئی تو اس وقت دربار کلاں شیخ قطب الدین صاحب کے حصے میں۔ اور دربار خورد شیخ بدرالدین صاحب کے حصے میں آیا۔

شیخ قاسم عبدالرحیم صاحب کے بیٹے نوب مقرب خاں کے بھتیجے تھے۔ یہ عمر میں اپنے چچا سے چھوٹے تھے۔ جراحی میں جو اُن کے آباؤ اجداد کا فنی پیشہ تھا۔ انہوں نے کمال بہم پہنچایا۔ اپنے دادا شیخ بینا کے شاگرد رشید تھے۔ ان کی طب اور ریاضی میں بہت اچھی دستگاہ تھی۔ دوسرے فنوں سے بھی واقف تھے۔ جراحی میں وہ اپنے چچا اور دوسرے افراد خاندان کی طرح کافی مہارت رکھتے تھے ۱۰۳۱ھ میں جہانگیر نے حکیم مومنا کی تجویز سے فصد کھلوائی۔ نواب مقرب خاں نے بھی دو مرتبہ فصد کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اس وقت کامیاب نہیں ہوئے اور قاسم صاحب کو کامیابی حاصل ہوئی۔ جس پر جہانگیر نے ان کو دو ہزار روپیہ کا انعام دیا تھا۔[۱]

بادشاہ نامہ میں ہے۔

"بہ یمن خدمت گذاری درگاہ خواقین نشان اسباب جمعیت آمادہ دارد وابواب رفاہیت کشادہ"

خواقین سے مراد اکبر اور جہانگیر ہیں۔ کیونکہ ان کے باپ عبدالرحیم صاحب اکبر کے ملازم تھے اور قاسم صاحب نے جہانگیر کی خدمت میں عمر گذاری۔[۲]

یہ وہی شیخ قاسم ہیں جس کا ذکر ان کے چھوٹے بھائی شیخ اللہ دیا صاحب مصنف

---

[۱] تزک جہانگیری ص ۳۴۷ [۲] اطبائے عہد مغلیہ ص ۱۶۳

سیرالاقطاب نے اپنے اسی تذکرے میں کیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں۔

"ایک مرتبہ حضرت شاہ اعلیٰ صاحب کیرانہ تشریف لائے۔ کچھ دنوں پہلے شاہی دربار سے میرے عم محترم مقرب خاں صاحب پٹنہ کے صوبیدار مقرر فرمائے گئے تھے۔ عم محترم پٹنہ کے لئے پورے حشم کے ساتھ روانہ ہوئے تو میرے بڑے بھائی مولانا شیخ قاسم صاحب جن کو خدا نے اس درجہ کا عالم و فاضل بنایا ہے کہ علم و ہنرمندی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے یہ بھی اپنے جملہ متعلقین کے ساتھ چچا صاحب کے ہمراہ روانہ ہو گئے تھے اور یہ پورا قافلہ کشتیوں پر روانہ ہوا۔ الغرض حضرت شاہ العالمین جب کیرانہ رونق افروز ہوئے تو قصبہ کے تمام آدمی خصوصاً خاندان کے جملہ افراد ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ میرے والد صاحب بھی تشریف لائے۔ حضرت شاہ العالمین صاحب نے والد صاحب کو دیکھا تو مجھ کو اور والد صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا "چند روز بعد بہت وحشتناک خبر پہنچنے والی ہے مگر آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ کے بھروسہ پر صبر و سکون سے رہیں۔ اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں گے حضرت کا یہ ارشاد خود وحشت انگیز تھا مگر صبر و ضبط کی ہدایت تھی۔ اس لئے ہم نے گھبراہٹ ظاہر نہیں کی مگر خبر کا انتظار ضرور رہا۔ پھر حضرت نے خود ہی خبر بھی دی کہ جس کشتی پر قاسم سوار تھے وہ بھنور میں پھنس کر ڈوب گئی۔ اور اسکے تمام سوار غرق ہو گئے۔ مگر خدا کے فضل سے شیخ قاسم اُن کی خوشدامن صاحبہ اور سب اہل و عیال جو اس کشتی پر تھے محفوظ رہ گئے۔ حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ میں یہی خبر دینے آیا تھا۔ (۲۴۴)

شیخ اللہ دیا بن دیوان عبدالرحیم صاحب مرحوم و مغفور تذکرہ سیرالاقطاب کے مولف تھے انہوں نے یہ تذکرہ ۱۰۳۶ھ میں ترتیب دینا شروع کیا اور ۱۰۵۶ھ میں ختم کیا۔ اس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے حضرت عبدالسلام صاحب تک کے اولیاء کرام کے حالات ہیں۔ آپ شاہجہاں بادشاہ کے منصب دار تھے۔ شاہجہاں کے ساتھ سفر میں بھی رہتے تھے۔ چنانچہ شیخ اللہ دیا صاحب نے سفر کابل شاہجہاں کے ساتھ کیا تھا۔ اس وقت

آپ کے بھائی آپ کے ہمراہ تھے، انہوں نے چار باغ پر منزل کی اور دریا پر خیمہ نصب کیا۔ یہ تذکرہ سیر الاقطاب کا بڑے ذوق سے مطالعہ کر رہے تھے کہ آندھی آئی۔ جس کے زور میں رات کو یہ قلمی تذکرہ دریا میں گر گیا اور پانی میں اس کی جلد علیحدہ ہوگئی رات بھر یہ کتاب پانی میں رہی۔ صبح جب تلاش کے بعد یہ ملی تو اس کے کنارے تو پانی سے تر تھے لیکن کتاب کے کسی ورق پر پانی کا اثر نہیں تھا۔ اسی عجیب واقعہ کا ذکر اسی تذکرہ سیر الاقطاب میں ہے [1]

"واقعہ پوشیدہ نماند کہ چوں ایں تذکرہ بتوجہ ظاہر و باطن پیران ما صاحبان ما بادشاہان ما حضرت خواجگان چشت رضی اللہ تعالی عنہم از مسودہ برآمدہ بہ تصحیح رسید ہمدران ایام در سفر کابل برکاب سعادت بادشاہ ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہجہان غازی اشفاق پناہی قبلہ گاہیم شیخ فضیل از برادر کلان شیخ قاسم چند خرد و از یں حقیر کلاں تر اند۔ نیز در رکاب سلطان بودند و قریب و منزلت تمام داشتند دران ایام اخوان پناہ را بمطالعہ این کتاب ذوق بسیار بود و اکثر اوقات چوں از دیگر امور فارغ می شدند ہمیں کتاب بدست داشتند اتفاقاً منزل بچار باغ واقع شد و خیمہ فقیر و ایشاں بر آب جو نصب کردند چنانکہ پردہ ہائے خیمہ یکدیگر باہم بستہ بودند و مابین آبجو میرفت وقت شام ایں تذکرہ را بر مسند گذاشتہ برائے نماز برخاستند بعد فراغش چوں شب تاریک بود و باد تند وزید و چراغ روشن نمی شد بنا بر آں نماز خفتن خواندہ آسائش نمودند فراش و مسند بحوالہ از تاریکی ہیچ ندانست و ملاحظہ نہ کرد کتاب در آبجو افتاد چوں گران بود آبش فرو برد و تمام شب اندر بماند تا صبح صادق بدمید و اخوان پناہی بیدار شدند و نماز بامداد و انمودہ بر کنار آبجو نشستند چوں دیدند کہ جلد کتاب جدا شدہ بر آب آمدہ بشناختند ازیں جہت مضطرب الحال گشتند بر تحویلدار و فراشان چنداں اعتراضے کردند و بر غضب شدند ہم چنانکہ در خدمت حاضر بودند برائے تفحص او در آبجو افتادند

[1] سیر الاقطاب ص ۲۵۰

بدست آمد چوں دیدند ورقہائیکش تا کنار حاشیہ ترگردیدہ بودند باقی ہمہ سلامت ماند کہ قطرۂ آب بدرونہ نرسید ازیں واقعہ ہمہ کس متحیر ماندند و عظمت تذکرہ حضرت چشت وغیر ہم رضی اللہ عنہم دانستند۔"

شیخ اللہ دیا صاحب لاولد ہوتے۔ خواجہ فضل صاحب کے صاحبزادے خواجہ شمس الدین صاحب، حکیم قطب الدین صاحب، علی صابر صاحب، خواجہ بدرالدین صاحب خواجہ رکن الدین صاحب خواجہ عبدالوہاب صاحب ہوئے۔ حکیم قطب الدین صاحب کے فرزند عبدالرحمٰن صاحب عبدالرحیم صاحب اور نجم الدین احمد صاحب ہوئے۔

عبدالرحیم صاحب کے صاحبزادے عزیز اللہ صاحب (لاولد) حبیب اللہ صاحب ہوئے۔ حبیب اللہ صاحب کے صاحبزادے غازی نجیب اللہ ہوئے جو جنگ نادرشاہی میں شہید ہوگئے تھے۔

نجیب اللہ کے فرزند احمد اللہ صاحب، ولی اللہ صاحب، نعمت اللہ صاحب مولوی خلیل اللہ صاحب، کلیم اللہ صاحب، امین اللہ صاحب اور شکر اللہ صاحب ہوئے۔

مولوی خلیل اللہ صاحب کے صاحبزادے مولوی عبدالجلیل صاحب، حکیم علی اکبر صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب ہوئے۔

خواجہ ابراہیم صاحب کے خاندان میں قابل ذکر ہستی مفتی عبدالسمیع صاحب کی ہے جن کی اولاد میں مولوی حبیب اللہ صاحب کے دونوں صاحبزادے قاضی محمد فضل اللہ صاحب قاضی القضات اور مولوی ثناء اللہ مفسر ہیں۔ جن کی اولاد میں قاضی احمد اللہ صاحب، قاضی محمد دلیل اللہ صاحب، قاضی القضات، محمد صفوۃ اللہ صاحب، شیخ المشائخ قاضی عبدالواحد صاحب عرف قاضی غلام غوث، مولانا مولوی حمد اللہ صاحب مفتی و محدث مجاہد آزادی، فخرالاسلام غلام مجدد اور ام القریٰ ابو محمد محی الاسلام پیدا ہوئے[1] جنھوں نے

[1] شجرہ خاندان عثمانی

اسلام کی خدمت کرنے اور علوم پھیلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ اس خاندان کے حالات طوالت کی وجہ سے تحریر نہیں کئے جا سکے ۔ صرف مولوی ثناء اللہ صاحب کے حالات لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔

مولوی ثناء اللہ حضرت کبیر الاولیاء شیخ جلال الدین کی دسویں پشت میں تھے ۔ ۷ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور سولھویں برس میں جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی ۔ حجۃ اللہ البالغہ کی تکمیل شاہ ولی اللہ سے اور بیعت اولیٰ شاہ محمد عابد سنامی سے کی ۔ ان کی وفات کے بعد حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی خدمت میں حاضری دی ۔ آپ کو شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے بیہقی وقت کا خطاب عنایت کیا تھا اور مرزا مظہر جان جاناں نے آپ کو علم الہدا کا خطاب بخشا تھا تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ اپنے خاندانی منصب قضا پر پانی پت میں ممتاز ہوئے وہیں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا ۔ آپ کی شہرت کا باعث درس و تدریس نہیں ہوا بلکہ آپ کا نام آپ کی تصانیف نے چمکایا ۔

یوں تو آپ کی کافی تصانیف ہیں مگر تفسیر مظہری نے عربی دنیا میں بڑی وقعت حاصل کی جس کی خوبیوں کا اندازہ تمام متقدمین و متاخرین کی مطول و مختصر تفسیروں کے مطالعہ کے بعد آپ کی خاص تاویل دیکھنے سے کیا جا سکتا ہے ۔ آپ کو حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے ساتھ خاص محبت تھی ۔ اپنی اسی تفسیر قرآن کا نام مرزا مظہر جانجاناں کی نام کی نسبت سے رکھا ۔

حضرت مظہر جانجاناں نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک رسالہ لکھنے کے لئے فرمایا انہوں نے یہ رسالہ لکھ کر مرزا صاحب کے پاس بھیجدیا ۔ مگر آپ کو پسند نہ آیا ۔ اس کے بعد قاضی ثناء اللہ صاحب سے فرمائش کی اور چند کتابیں بھیجکر لکھا کہ اپنی معلومات کے مطابق ایک کتاب سیرت پر

تحریر کریں۔ قاضی صاحب نے اس کی تکمیل کی۔ ایک رسالہ "حدوث" استاد کے ساتھ چودہ کتابوں کی مدد سے معہ حوالہ کتب لکھا۔ اس میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افعال فقہی ابواب کے ساتھ جمع فرمائے تھے۔ یہ رسالہ ابھی طبع نہیں ہوا۔

قاضی صاحب ۱۲۲۶ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) تفسیر مظہری (سات جلدوں میں) (۲) مالا بد منہ (فارسی) (۳) السیف المسلول یا شمشیر برہنہ (۴) حرمت متعہ ہر دو ردِ روافض (۵) تذکرۃ الموتیٰ والقبور (۶) تذکرۃ المعاد (۷) حقوق الاسلام (۸) رسالہ در حرمت و اباحت سرود (۹) شہاب ثاقب (۱۰) رسالہ اصول فقہ جنکی تعداد تیس تک ہے[1]

مولوی عبدالجلیل صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ زمینداری کے کاموں میں گذرا ان کے صاحبزادے مولوی بدرالاسلام تھے۔ جن کو مولانا رحمت اللہ صاحب نے کیرانہ سے مکہ معظمہ بلوا کر خود ہی تعلیم و تربیت فرمائی اور مولانا صاحب ان کو قسطنطنیہ کے دوسرے سفر میں اپنے ہمراہ سلطان عبدالحمید کی خدمت میں لے گئے۔ سلطان نے ان کے لئے حکم دیا کہ میرے پاس رہیں گے اور کتب خانہ حمیدیہ، سلطان عبدالحمید خاں کا شاہی دارالکتب جو دنیا کے خاص کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے اور جس میں سلاطین آل عثمان کی تمام کتابوں کو جمع کیا گیا ہے، قصر یلدز کا ان کو مہتمم بناتا ہوں۔ حضرت مولانا مرحوم نے اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا اور مولانا بدرالاسلام صاحب اس خاص علمی خدمت پر مامور ہوئے۔ آخر وقت تک سلطان کے معتمد علیہ رہے۔ محاصرہ قصر یلدز اور سلطان عبدالحمید کی معزولی کے پر خطر وقت میں صرف تین اشخاص سلطان کی خدمت میں باقی رہے جن میں مولانا بدرالاسلام بھی تھے۔

مولانا بدرالاسلام صاحب سیاسی آدمی نہیں تھے لیکن اسکے باوجود کافی عرصہ انکو نظر بند رکھا گیا رہائی کے بعد یہ اپنے وطن کیرانہ واپس آگئے۔

[1] تراجم علماء حدیث ہند اول ص۱۰۰

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم جب شروع ہوئی تو انکو انگریزی سرکار شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ان کے علمائے ترکی سے بھی دوستانہ مراسم تھے۔ ان کے پاس ترکی کے تقریباً سب ہی اخبارات آتے تھے اس اشتباہ کو دور کرنے اور ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے اس کے لئے انہوں نے لکھنو جانا بہتر سمجھا۔ جب یہ لکھنو پہنچے تو ان کو ندوۃ العلماء میں عربی ادب کا مدرس مقرر کیا گیا۔

مولانا بدر الاسلام صاحب کے مولانا الطاف حسین حالی سے بہترین تعلقات تھے۔ چنانچہ مولانا حالی ان سے اکثر ملاقاتوں میں کہا کرتے تھے کہ تم بڑے بدنصیب ہو کہ اتنی عظیم الشان لائبریری کے مدیر عام ہوتے ہوئے بھی اس خزانہ سے تم نے استفادہ نہیں کیا نہ کوئی کتاب مرتب کی اور نہ ہی لائبریری کے کتابوں کے بارے میں کچھ لکھا۔

مولانا بدر الاسلام صاحب کا انتقال غالباً لکھنو میں ہوا۔ ان کے ایک صاحبزادے مولوی عبد الہادی صاحب اور تین صاحبزادیاں تھیں۔

مولوی عبد الہادی صاحب نے منشی محمد علی صاحب سے رڑکی میں تعلیم پائی۔ اور نقشہ نویسی میں امتحان دیا۔ مولانا بدر الاسلام صاحب جو جائیداد اور زمین چھوڑ گئے تھے ان کا انتظام یہی فرماتے تھے۔

۱۳۴۵ھ میں جب مولانا محمد سعید صاحب مدرسہ صولتیہ کے کسی کام کے سلسلے میں ہندوستان تشریف لے گئے تھے تو آپ کی کوششوں سے آپ محکمہ تعمیرات میں ملازم ہوتے اور ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں پاکستان چلے گئے اور آج کل وہیں مقیم ہیں۔

مولانا عبد الہادی کے صاحبزادے عبد الباقی صاحب اور انوار الاسلام صاحب ہوئے۔ یہ دونوں پاکستان میں مختلف محکموں میں سرکاری ملازم ہیں۔ ان کی بہن رضیہ خاتون کی شادی مولانا احتشام الحسن صاحب خلیفہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب سے ہوئی۔

مولوی عبد الہادی صاحب کی دوسری اہلیہ سے عارف الاسلام صاحب بی اے

اور عبدالولی صاحب اور ایک صاحبزادی عطیہ سلطانہ ہوئیں۔ دونوں صاحبزادے جودھپور میں رہتے ہیں۔ عطیہ سلطانہ پاکستان میں سرگودھا میں اپنے خاوند سید عزیز زیدی کے ساتھ رہتی ہیں۔

حکیم علی اکبر صاحب اپنے زمانے کے مانے ہوئے طبیب تھے۔ جن کا دور دور تک شہرہ تھا۔ ہندوستان کے شہرۂ آفاق حکیم عبدالمجید خانصاحب دہلوی ان کی بے پناہ عزت کرتے تھے اور ان کی صلاحیت و قابلیت کے معترف تھے۔ کیرانہ یا اس کے گرد و نواح کا کوئی مریض ان کے پاس چلا جاتا تو آپ اس سے دریافت فرماتے تھے کہ تم نے حکیم علی اکبر صاحب سے رجوع کیا یا نہیں۔ اگر وہ انکار کرتا تو آپ فرماتے ان کے علاقے میں مریضوں کو دیکھنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ آپ ان سے پہلے رجوع کریں۔ جبکہ آپ کے علاقہ کے مسلمہ طبیب ہیں تو آپ نے میرے ہاں آنے کی تکلیف کیوں گوارا کی۔ اس زمانہ کے حکیموں کے دستور کے مطابق آپ بھی دمڑیوں کا نسخہ لکھتے تھے۔ تہجد گذار بزرگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ عام طور پر ان کا مریض شفا پاتا اور جلد اچھا ہو جاتا تھا۔ آپ کے پاس قلمی ذخیرہ بہت تھا۔ بہترین خطاط تھے جو کتاب آپ پڑھتے۔ اس کی نقل کرنا آپ ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے بڑی ضخیم کتابیں نقل کی تھیں۔ قلمی کتابیں آپ کے پاس کافی تھیں۔ جس میں کا بہت سا حصہ مدرسہ صولتیہ کے دفتر کھجور روڈ قرولباغ دلی میں ہنگامہ ۱۹۴۷ء میں لٹ گیا۔ آپ کیرانہ میں فوت ہوئے۔ ... حکیم علی اکبر صاحب کے دو صاحبزادے محمد صدیق اور محمد سلیمان تھے۔ ان دونوں صاحبزادوں کی تعلیم اور تربیت آپ نے ہی کی۔ محمد صدیق صاحب کلکٹری کے محکمہ میں پیشکار تھے۔ وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ زیادہ وقت انبالہ میں گذرا۔ محمد سلیمان صاحب زمینداره کا انتظام اور خانگی معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے بڑے اچھے اور ہر دلعزیز منتظم تھے۔ کسان ان سے خوش رہتے تھے۔

محمد صدیق صاحب کے تین صاحبزادے مولانا محمد سعید صاحب حافظ محمد بشیر صاحب اور حافظ محمد عتیق تھے۔ محمد عتیق صاحب انبالہ میں سر رشتہ داری پر مامور تھے۔ ان کا مکان ایک مشن اسکول کے قریب تھا جن میں منشی نہال الدین صاحب فارسی کے طلباء کو پڑھاتے تھے۔ محمد صدیق صاحب اور منشی نہال الدین صاحب دونوں گہرے دوست تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر محمد صدیق صاحب نے اپنے بڑے صاحبزادے مولانا محمد سعید کو مشن اسکول میں داخل کر دیا تھا

جب اس بات کا علم مولانا رحمت اللہ صاحب کو ہوا تو ان کو بہت رنج اور افسوس ہوا کہ مسلمانوں کے جن دشمنوں کے خلاف میں نے آواز اٹھائی اور ان کی شیطنت و مکاری سے مسلمانوں کو آگاہ کیا اور ان کے زہریلے جراثیم سے بچنے کی تلقین کی اور جس کی بدولت مجھ کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ آج میرے ہی خاندان کا بچہ ان سے تعلق جوڑا ہوا ہے اور ان کی خطرناک و مہلک تعلیم پا رہا ہے۔

چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے فوراً اپنے خاندان کے ہر ایک بزرگ کو علیحدہ علیحدہ چٹھیاں روانہ کیں اور اس بات کی مخالفت کی اور سختی کے ساتھ تحریر فرمایا کہ فوراً محمد سعید کو مشن اسکول سے نکال کر مکہ معظمہ روانہ کیا جائے۔ آپ کے والد محمد صدیق صاحب تو کچھ جھجکے لیکن ان کی والدہ . . . . . . مولانا کے حکم کی تعمیل پر تیار ہو گئیں۔ انہوں نے کہا "ایسے بزرگ کی شفقت اور ایسا مقدس مقام لوگوں کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔ میں محمد سعید کو مولانا کی خدمت میں ضرور بھیجوں گی"۔ چنانچہ اس وقت مولانا محمد سعید صاحب کی عمر بارہ سال تھی جب آپ کو مکہ معظمہ روانہ کیا گیا تھا۔

مولانا محمد سعید صاحب کی حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنی نگرانی میں تعلیم و تربیت فرمائی اور فارسی و عربی کی کتب مولانا نے پڑھائیں۔ دوسری کتابیں حضرت نور صاحب سے تحصیل کیں اور معقول کی کتابیں ملا نواب صاحب سے پڑھیں۔ مولانا

رحمت اللہ صاحب نے تعلیم سے زیادہ آپ کی تربیت کا خیال رکھا۔ جس وقت آپ نے اپنی نواسی کی شادی مولانا محمد سعید صاحب سے کی تو اس وقت مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علماء کے ہمراہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف فرما تھے۔ نکاح سے فارغ ہونے کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے مولانا محمد سعید صاحب کو دعائیں دینے کے بعد ان حضرات سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"میں نے اس بچے کی اس طرح تربیت کی ہے جس طرح سنار سونے کو بھٹی میں ڈال کر تپاتا ہے اور کھوٹ نکھار کر پھینک دیتا ہے۔ اس طرح میں نے اس کو بھٹی میں تپا کر نکھارا ہے۔"

جس زمانہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی بصارت میں ضعف آگیا تھا اس وقت ان کے خطوط کے جوابات کے لکھنے کا کام مولانا محمد سعید صاحب کو سونپا گیا تھا اسی طرح حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی ایما اور خواہش پر مغرب اور عشا کے درمیان حاجی صاحب کے خطوط وغیرہ سنانے اور ان کے جوابات لکھنے کا ذمہ دار ان کو بنایا گیا۔ آپ کے لئے ان دونوں بزرگوں کی نگرانی انتہائی مفید ثابت ہوئی جس کی وجہ سے آیندہ اسلام کی خدمت بڑی عمدگی کے ساتھ انجام دی آپ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت تھے۔

مولانا محمد سعید کو حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنی زندگی میں مدرسہ کا انتظام سپرد کر دیا تھا اور اپنا جانشین بنا کر مدرسہ کا مہتمم مقرر کیا تھا۔

مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنی حیات میں مسجد، پرانے مدرسہ کی عمارت اور دارالاقامہ کی عمارت تعمیر کرادی تھی۔ مولانا محمد سعید صاحب نے مولانا کے انتقال کے بعد مدرسہ کی نئی عمارت کا آغاز ۱۳۔۔ھ میں کیا اور تکمیل ۱۳۳۷ھ میں ہوئی ان کی ایک بڑی یادگار اور پچاس سالہ دور نظامت کی ایک خاص نشانی یہی مدرسہ کی نئی عمارت ہے جو اپنی حسن سادگی اور وسعت کے لحاظ سے بے مثل ہے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کے انتقال کے بعد آپ مولانا مرحوم کے وظیفہ کی رقم کی وصولیابی کے سلسلے میں استنبول گئے۔ سلطان عبد الحمید نے مولانا محمد سعید صاحب کو تمغہ مجیدی درجہ پنجم عطا فرمایا اور قصر بلیدز میں شاہی مہمان رکھا۔

مولانا محمد سعید صاحب علما حق کی صحبت یافتہ و تجربہ کار اور جہاں دیدہ لوگوں کے نظر پر وردہ تھے۔ ان کی رائے و مشورے میں خوشامد اور غیر معقولیت نہیں پائی جاتی تھی۔ آپ نے مولانا آزاد کی شکل و صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ الہلال جب جاری ہوا اور بلقان وغیرہ کے سلسلے میں حریت پرور مضامین اس میں شائع ہوئے۔ اس کی تائید آپ نے مدرسہ صولتیہ کی روئداد میں فرمائی اور پسندیدگی کا اظہار کیا۔

کس قسم کا رہبر و قائد ملک اور عوام کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی یہ ٹھوس رائے تھی۔

"جو لوگ مسلمانوں کی ترقی کو کسی ترقی یافتہ قوم کی تقلید و اتباع اور نقالی میں یا علوم مغربیہ کی تعلیم اور یورپ کی تہذیب و تمدن اور جاپان و امریکہ کی وطنیت میں سمجھے ہوئے ہیں وہ ہماری بیماری اور مرض کے حقیقی اسباب و علل کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

مولانا محمد سعید ہر اس فعل، حرکت اور عمل کی جو ملک و ملت کے لئے مفید ہوتا تھا ان کی تائید کرنے میں کبھی تامل نہیں فرماتے تھے اور خاص طور پر تعلیم کے پھیلانے کے مسئلے میں انھوں نے کبھی تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا۔ چنانچہ ۱۳۳۱ھ میں ترکی حکومت نے دنیا کے مسلمانوں کو تعلیم دینے کے لئے مدینہ منورہ میں مدینہ یونیورسٹی تعمیر کرنے کی اسنداعا کی۔ مولانا نے اس کا خیر مقدم کیا اور یہاں تک لکھ دیا کہ اگر یونیورسٹی کامیاب ہو گئی تو ہم مدرسہ صولتیہ کی ضرورت نہ سمجھتے ہوئے اس کو ختم کر دیں گے۔

شریف حسین والی حجاز کی غداری سے دنیا پوری طرح واقف ہے۔ جو شخص انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے خانہ کعبہ کی بے حرمتی کا باعث بنا ہوا اور جس نے ترکی حکومت سے

بے وفائی کی ہو۔ اس کے اقتدار اور حکومت کے زمانہ میں اس کی ظلم و زیادتی کے خلاف سخت الفاظ میں نکتہ چینی کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ وہی شخص جو موت کو لبیک کہتا ہو، اور موت سے نہ ڈرتا ہو ایسے وقت میں نکتہ چینی کر سکتا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد سعید صاحب نے مدرسہ صولتیہ کی روئداد مورخہ ابتدائی ۱۳۳۲ھ لغایت ۱۳۳۸ھ میں شریف حسین کے مظالم کا ذکر "زمین حرم کا خوں ریز ہنگامہ قیامت" کے عنوان کے تحت کیا۔

"تاریخ اسلام کا چودھویں صدی میں یہ انقلاب کس قدر دردانگیز ہے کہ تیرہ سو برس گذر جانے کے بعد اسی سرزمین پاک سے انہیں نامور اور فدائیان اسلام اسلاف کے اخلاف ہونے کے دعویدار ذرا سی دُنیاوی طمع (۲۷ لاکھ ماہوار) اور تاجداری کی امید موہوم پر جو در حقیقت اطاعت اور غلامی کا طوق لعنت ہے اسلام کی بیخ کنی اور مسلمانوں کا شیرازہ بکھیرنے پر تیار اور آمادہ نظر آتے ہیں کس قدر عبرت انگیز منظر ہے کہ جن کے اسلاف نے حرمت حرم پہ جانیں دیدیں۔ ان کی جانشینی کے مدعی آج سرزمین حرم کو غیر مسلموں کی جولان گاہ بنا دینے پر فخر کرتے ہیں۔ جس سرزمین کی یہ عظمت اور حرمت ہو کہ وہاں شکاری جانور صیاد کی جفا اور سرسبز درخت خطاب کے تیشہ کے جور سے مامون و محفوظ ہوں۔ وہاں بے گناہ مردوں اور شیر خوار بچوں کے قتل و خونریزی اور غارتگری کا بازار گرم کیا جائے۔ خاتونان اسلام کی پردہ دری ہو اور مردوں کو ہی نہیں بلکہ پردہ نشین اور عصمت کی پیکر عورتوں کو حریم کعبہ سے پکڑ کر غیر مسلموں کی قید میں دیدیا جائے کہ وہ جہاں چاہیں لے جائیں۔ وہ معصوم بچے جو ماؤں کے ساتھ حرم کعبہ سے نکال کر عیسائیوں کی قید میں دیئے جاتے ہیں۔ وہ ماؤں کے آغوش شفقت سے اس بنا پر علیحدہ کر کے پادریوں کے حوالے کئے جاتے ہیں کہ اسیران جنگ کے کیمپ میں بچے رکھیں جائیں۔ نیرنگی عالم دیکھنی ہوں تو اس واقعہ میں دیکھیے کہ جس قوم نے چھ سو برس تک شجر اسلام کو اپنے خون سے سینچا ہو اس قوم کو آج وہ لوگ جو حرام و حلال میں تمیز نہ کرتے ہوں۔ قطاع الطریقی و خوں ریزی لوٹ مار جن کا ذریعہ معاش ہو ملحد و مرتد بتا دیں

۱۰ محرم ۶۱ھ کے دلگداز واقعہ کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے اسلامی دنیا میں ماتم کیا جاتا ہے اور سید الشہدا کی مصیبت کو یاد کر کے محبان اہلبیت آنسو بہاتے ہیں۔ یہ دردانگیز واقعہ خاندان نبوت اور اہلبیت پر جیسا کچھ گذرا اس کو ہر مسلمان جانتا ہے۔ ۱۰ محرم کی طرح ۹ شعبان ۱۳۳۴ھ کا دن بھی جس روز زمین حرم پر اعلان بغاوت کیا گیا۔ ملت اسلامیہ اور امت محمدیہ کے لئے کچھ کم جان فرسا نہ تھا۔ شریف مکہ نے ترکی حکومت سے جو غداری کی تھی اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا تھا۔ اس سے مدرسہ کی مالی و انتظامی حالت پر بہت برا اثر پڑا تھا۔ آمدنی بہت کم ہو گئی تھی۔ ان پر آشوب حالات سے فائدہ اٹھانے کے لئے شریف حسین نے اپنے جال میں پھانسنے کے واسطے مدرسہ کو مالی امداد کی پیش کش کی تھی۔ لیکن خود دار انسان پریشانیوں اور برے وقت سے گھبراتے نہیں۔ مولانا محمد سعید صاحب نے یہ پیش کش منظور نہیں کی اور صبر و استقلال کے ساتھ تمام مشکلات کا مقابلہ کیا۔"

مولانا محمد سعید صاحب نے نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کے سلسلے میں کافی سے زائد مطالعہ کیا تھا۔ ان کے سامنے مغربی طریقہ تعلیم بھی تھا اور اسلامی نصاب تعلیم بھی۔

آپ قدیم جدید اساتذہ کے طریقہ تعلیم کا بغور مطالعہ کر چکے تھے۔

ان کو قدیم زمانہ کی خوش حالی علم پروری، علم دوستی اور قدرشناسی کا بھی علم تھا اور موجودہ اقتصادی بدحالی اور علم سے بے تعلقی کے حالات بھی ان کے پیش نظر تھے۔

ان تمام حالات کو مدنظر رکھ کر مولانا محمد سعید صاحب نے مدرسہ کی روئداد مورخہ ۵۲-۱۳۴۹ھ میں "نصاب تعلیم پر ناقدانہ تبصرہ" کے عنوان سے ایک جامع مدلل اور پر از معلومات مقالہ تحریر کیا تھا اور انہی نظریات کے تحت آپ نے مدرسہ صولتیہ کا نصاب تعلیم مرتب فرمایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مدرسہ کے طالب علم آج بھی ممالک اسلامیہ کی علمی دنیا میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور علم کو فروغ دینے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کی طلبا کے بارے میں یہ رائے تھی کہ تعلیم کے ساتھ

ان کی تربیت پہ زیادہ زور دینا چاہیئے۔ تاکہ تعلم پاکر یہ طبقہ اعلیٰ اخلاق وسیرت اور کردار کا مالک بنے۔ اگر طلبار کی صحیح تربیت نہیں ہوگی تو ان کے لئے علم بیکار ہے۔ چنانچہ مولانا محمد سعید صاحب بھی اسی نظریہ کے حامل تھے۔ وہ طلبار کی تربیت کو بمقابلہ تعلیم کے مقدم سمجھتے تھے۔ وہ ہر ایک طالب علم کے کردار کا جائزہ لیتے تھے اور جس میں کمزوری پاتے اس پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد علی مونگیری جو ندوۃ العلمار کے ناظم بھی تھے اور جن کا ہندوستان کے مشہور علمار اور رہنماؤں میں شمار تھا جب وہ حج کے لئے گئے تو مدرسہ میں قیام کیا۔ سالانہ امتحان میں شریک ہوئے اور انہوں نے طلبار کا امتحان بھی لیا امتحان لینے کے بعد جو رائے انہوں نے اساتذہ اور طلبار کے بارے میں دی تھی وہ یہ ہے

"مولوی محمد سعید صاحب کی خوش نظمی اور مردم شناسی ہے کہ ایسے مستعد اور صلحار مدرس رکھے ہیں کہ بایدوشاید تعلیم اطفال کے لئے بہت ہی محنت کش اور بافیض مدرس ہونا چاہیئے۔ سو الحمد للہ قاری عبداللہ صاحب ایسے محنتی اور بافیض ہیں کہ ان کے تعلیم یافتہ ہندوستان اور دور دراز ملکوں میں اس فیض کو جاری کر رہے ہیں۔ اس دور کے تمام مدرسین اور طلبار کے خیالات میں نہ افراط و تفریط ہے اور نہ جدال و نزاع سے انہیں شوق ہے اور نہ ہی کسی مسلمان کی تکفیر و تفسیق کا انہیں خیال ہے۔"

مولانا رحمت اللہ صاحب کے زمانہ میں مکہ معظمہ وغیرہ میں ڈاک تقسیم کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ نہ کوئی ڈاک خانہ تھا۔ اس زمانہ میں جو ڈاک آتی تھی حرم شریف کے دروازہ کے سامنے رکھدی جاتی تھی جس کا خط ہوتا تھا وہ تلاش کر کے لے جاتا تھا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے ڈاک کے انتظام کے لئے سعی فرمائی۔ زندگی میں تو اس کا نتیجہ نہیں نکلا۔ البتہ ان کی وفات کے بعد مولانا محمد سعید صاحب نے اس جد وجہد کو جاری رکھا۔ اور سلطان عبدالحمید کو توجہ دلائی تو انہوں نے باب الوداع پر ڈاک خانہ کی عمارت تعمیر کرائی اور ایک ہندوستانی اور جاوی پوسٹ مین مقرر کئے۔ اس کے بعد سے ڈاک کی طرف توجہ

دی جانے لگی اور انتظام کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں جب دمشق سے مدینہ منورہ تک ریل جاری کرنے کی اسکیم بنائی گئی تو اس میں مولانا محمد سعید صاحب نے بھی حصہ لیا اور مسلمانان ہند کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ جب اسٹیشنوں کے نام رکھے جانے لگے تو اس وقت شیخ عبداللہ صاحب الہ آباد کے رئیس حج کرنے کے لئے مکہ معظمہ میں آئے ہوئے تھے۔ مولانا نے ان سے اس میں حصہ لینے کو کہا تو انہوں نے یہ شرط رکھی کہ ایک اسٹیشن کا نام الہ آباد رکھا جائے۔ چنانچہ ان کی یہ شرط منظور ہوئی اور ایک اسٹیشن کا نام الہ آباد اسٹیشن رکھا گیا۔ چنانچہ شیخ عبدالصمد صاحب نے اس اسٹیشن کی پوری رقم مولانا محمد سعید صاحب کو بھیجی جو انہوں نے قسطنطنیہ روانہ کی۔ مولانا محمد سعید صاحب نے بھی نہر زبیدہ کی توسیع کے سلسلے میں حصہ لیا چنانچہ آپ بھی نہر زبیدہ کمیٹی لائف ممبر تھے۔

مولانا محمد سعید صاحب مدرسہ کی روئداد اور سالانہ حساب و کتاب تقریباً ہر سال شائع فرماتے تھے۔ یہ روئداد اردو کے علاوہ عربی زبان میں بھی چھ سال تک شائع ہوئی۔ عربی روئداد کا نام صدابہ العلم من الحجاز (حجاز کی علمی آواز) تھا۔

اسی کے ساتھ آپ مدرسہ کا سالانہ اجلاس فرمایا کرتے تھے جس میں ہندوستان کے علاوہ دیگر ملکوں کی مقتدر ہستیاں اور علماء شامل ہوتے تھے اور مدرسہ کا معائنہ کرنے اور امتحان لینے کے بعد آپ اپنے خیالات کا اظہار فرماتے تھے جس سے ہندوستان کے مجاہد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے تاریخی و انقلابی کارناموں کی یاد تازہ ہوجاتی تھی اور لوگ علم کو پھیلانے کے لئے آمادہ ہوجاتے تھے۔

مولانا محمد سعید صاحب بہت اچھے خطاط تھے۔ یہ فن آپ نے منشی ممتاز علی صاحب کی صاحبزادی فاطمہ بیگم سے حاصل کیا تھا۔ منشی ممتاز علی صاحب مطبع مجتبائی دلی کے مالک تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے

جبل عمر میں رہتے تھے۔ ان کا مکان مولانا رحمت اللہ صاحب کے مکان کے قریب تھا۔ انہوں نے مکہ میں ایک پریس جاری کرنے کا ارادہ کیا تھا جو چند وجوہ سے جاری نہ ہو سکا۔ فاطمہ بیگم کی خطاطی کے نمونے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے خود بھی سلطان عبدالحمید خاں کو دکھلائے، جنہیں وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

مدرسہ صولتیہ مولانا رحمت اللہ صاحب کی وجہ سے ایک مرکزی مقام بن گیا تھا۔ حج کے ایام میں علما، فضلا، صوفیا و مشائخ اس جگہ جمع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا محمد حسین الہ آبادی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مفتی کفایت اللہ جیسے برگزیدہ علما جب مکہ معظمہ تشریف لاتے تو مہتمم مدرسہ سے ملتے تھے ایک مرتبہ مولانا محمد حسین الہ آبادی تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ بلا مزامیر کے قوال تھے۔ سماع ان کی روحانی غذا تھی۔ چنانچہ آپ کا انتقال حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عرس کے موقع پر قوالی میں ہوا۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے خلفاء میں سے تھے۔ جب آپ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس ہوتے۔ راستہ میں بدوں کا گانا سُن چکے تھے۔ اس لئے آپ نے محمد سعید صاحب سے فرمایا۔ میاں رسول خدا نے شاید ان بدوں کی کریہہ آواز سن کر گانے کو پسند نہیں فرمایا ہوگا۔ اگر میرے میاں ان خوش گلو قوالوں کا گانا سن لیتے تو کبھی ناپسند نہ فرماتے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کی شخصیت سے ترکی حکومت کے مرکزی اور حجاز کے حکمراں متاثر تھے اور ان کی ذات مدرسہ کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ اگر مرکزی یا حجاز حکومت کے حکمراں طبقہ مدرسہ کے خلاف کچھ ریشہ دوانیاں کرتا یا نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتا تھا تو مولانا صاحب کو اس کا مداوا اور تدارک کرنے میں کوئی زیادہ دقت پیش نہیں آتی تھی۔ لیکن مولانا کے انتقال کے بعد مولوی محمد سعید صاحب کو ان معاملات میں کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

حجاز میں دو حاکم تھے ایک ترکی گورنر اور دوسرا شریف مکہ تھا۔ جیسے ایک میان میں دو تلواریں سما نہیں سکتیں۔ ایسے ہی دو حکمرانوں کو بیک وقت خوش و راضی رکھنا آسان کام نہیں تھا لیکن مولوی محمد سعید صاحب اس پریشانی کو بڑی خوش اسلوبی سے دور کر لیا کرتے تھے اور اپنی دانشمندی سے دونوں سیاسی قوتوں کو مدرسہ سے برگشتہ و بدظن نہیں ہوتے دیتے تھے اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو بڑی حکمت عملی کے ساتھ ان کی بدظنی کو دور کر دیتے تھے۔ انہوں نے حجاز میں اس دوعملی کے باوجود متصادم حالات میں مدرسہ کو چلایا اور ترقی دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی

مولانا محمد سعید صاحب کے پچاس سالہ دور نظامت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ انتہائی صبر آزما حالات پیہم مالی مشکلات اور گوناگوں انقلاب و سیاسی حوادث میں بھی مولانا رحمت اللہ صاحب بانی مدرسہ صولتیہ کی ہدایات پر کاربند رہے۔

چنانچہ جب ترکی حکومت کے خلاف شریف مکہ نے انگریزوں کے ساتھ مل کر بغاوت وغداری کی اور حجاز پر ترکی کے اقتدار و حکومت کا خاتمہ کرایا۔ پہلی عالمگیر جنگ ۱۹۱۴ء کے دوران سترہ مہینے تک دنیا کے ہر مقام کے رسل و رسائل کے تمام ذرائع بند ہو گئے تھے چنانچہ حجاز کی بھی یہی حالت تھی۔ اس وقت گرانی کا یہ عالم تھا کہ حجاز میں گیہوں کی ایک بوری پانچ سو روپے میں فروخت ہوئی اور مہینوں تک لوگوں نے جوار باجرا شکر کندی سے شکم پری کی۔ شکر تقریباً ناپید ہو گئی تھی۔

ان حالات میں جب کہ مدرسہ کی آمدنی کے کل ذرائع مسدود ہو گئے تھے۔ مدرسہ کا انتظام، مدرسوں کی تنخواہوں کی ادائیگی اور بقایا تمام ضروریات کی کفالت کرنا مولانا محمد سعید صاحب جیسے اولو العزم انسان کا کام تھا۔

اس موقعہ پر بھی برسر اقتدار طبقہ نے مدرسہ کو مالی امداد کی پیش کش کرکے اپنے شکنجوں میں کسنے کی کوشش کی مگر مولانا محمد سعید صاحب نے بڑی خوبصورتی سے انکار کرکے مولانا رحمت اللہ صاحب کی ہدایت پر عمل کیا۔

مولانا محمد سعید صاحب بعض وجوہات کی بنا پر مکہ معظمہ سے ۱۳۴۵ھ میں اپنے وطن کیرانہ میں چلے گئے تھے۔ لیکن وہاں سے تمام ہدایات اپنے صاحبزادے مولانا محمد سلیم صاحب کو دیتے رہتے تھے اور مدرسہ کے لئے ہندوستان میں بھی کام انجام دیتے تھے۔

کیرانہ میں مولانا محمد سعید صاحب کا انتقال ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ میں ہوا اور اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ مولانا محمد سعید صاحب کی پہلی شادی مولانا رحمت اللہ صاحب کی نواسی مریم بنت مولانا حکیم محمد اسماعیل صاحب سے ہوئی جن سے ایک صاحبزادی عائشہ بیگم زوجہ حکیم عبدالباسط صاحب کیرانوی ہوئیں۔

مولانا محمد سعید صاحب کی دوسری شادی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ام کلثوم بنت مولوی حافظ عبدالعلیم صاحب سے ہوئی جن سے مولانا محمد سلیم صاحب حکیم محمد نعیم صاحب اور ایک صاحبزادی نعیمہ بیگم زوجہ حکیم محمد یامین صاحب کاندھلوی ہوئیں۔

مولانا محمد سلیم صاحب اور حکیم محمد نعیم صاحب مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ مولانا محمد سلیم صاحب نے مدرسہ صولتیہ میں قاری عبداللہ صاحب سے تجوید کی مشق کی اور قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد ابتدائی درسی کتابیں مولانا محمد اصغر صاحب شیخ داؤد دہاں اور مولوی عبدالحق صاحب مدنی سے اور اعلیٰ درسی کتابیں مولانا مشتاق احمد صاحب کانپوری اور مدرسہ صولتیہ کے شیخ الحدیث شیخ حبیب اللہ صاحب شنقیطی سے پڑھیں۔ یہ مولانا عبدالحفیظ سلطان براقتس کے استاد تھے اور اپنے زمانہ میں شیخ الحدیث مانے جاتے تھے۔

مولانا محمد سلیم صاحب نے تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ۱۳۴۳ھ سے مختلف اوقات میں پندرہ بیس برس تک مدرسہ صولتیہ میں تعلیم دی اور ۱۳۴۵ھ سے ۱۳۵۷ھ تک نائب ناظم کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۳۵۷ھ سے اب تک ناظم اعلیٰ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مولانا محمد سلیم صاحب صاحب علم دوست دور اندیش اور خلیق انسان ہیں اور کافی تعلیمی تجربہ رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے خاندانی قبرستان میں جناب مولانا محمد سعید صاحب کا مزار
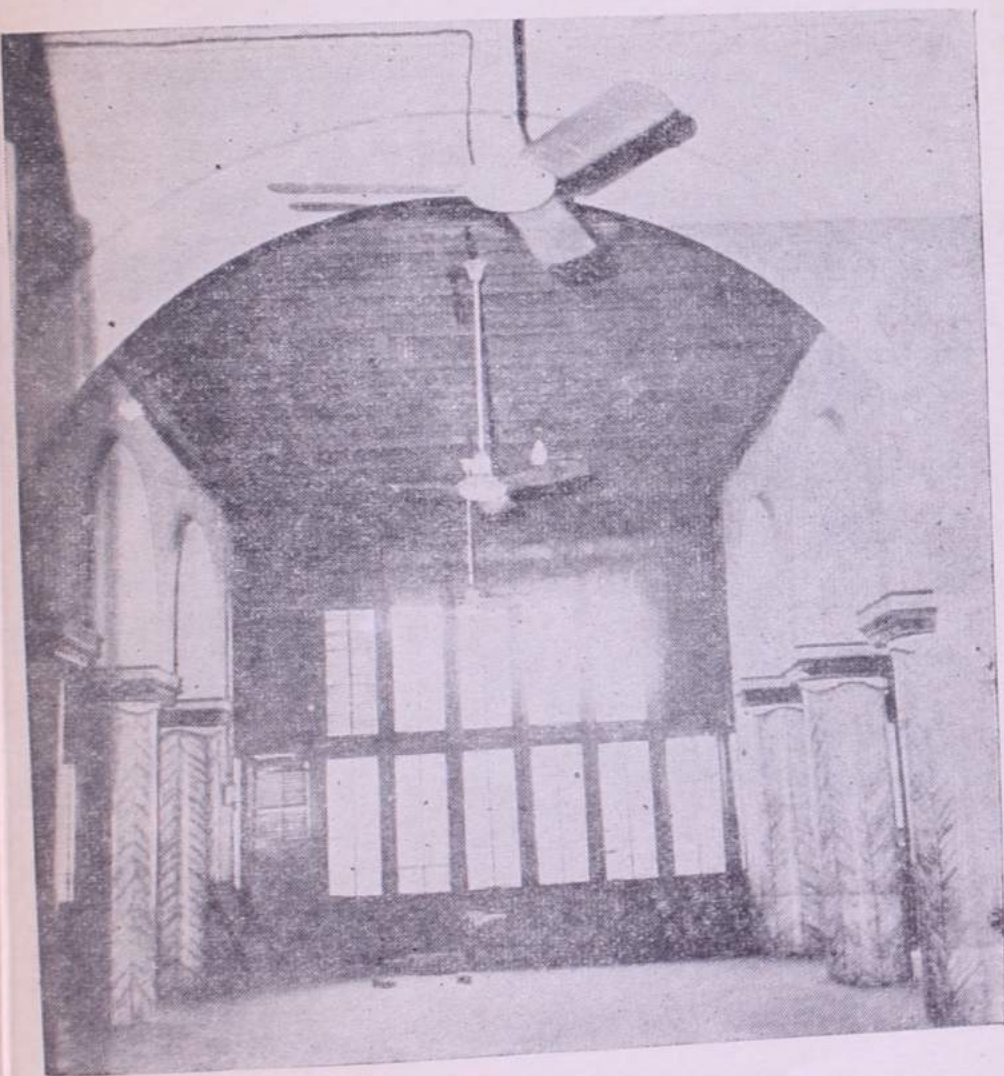
مدرسہ صولتیہ کے وسیع ہال کا منظر

مدرسہ کے چلاتے میں ان کو بھی دشواریاں پیش آئیں ۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر حکمت عملی سے مقابلہ کیا اور مدرسہ کو چار چاند لگائے ۔ مولانا محمد سلیم صاحب کی شادی ۱۳۴۶ھ میں ذکیہ سلطانہ بنت مولوی حکیم عبدالحمید صاحب کاندھلوی سے ہوئی جن سے محمد مسعود صاحب المعروف محمد شمیم صاحب ہوئے ۔

مولوی شمیم صاحب کیرانہ محلہ دربار میں ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے ۔ پانچ سال کی عمر میں اپنے جدامجد حضرت مولانا محمد سعید صاحب کے ہاتھ پر بسم اللہ اور تعلیم کی ابتدا کی اور تین سال تک گھریلو طریقہ پر تعلیم انہیں کے زیر سایہ ہوئی ۔ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ میں اپنے دادا کی وفات کے بعد آپ اپنے والد مولوی محمد سلیم صاحب کے ہمراہ دلی پہنچے ۔ قرولباغ میں قیام کیا اور ۱۹۴۱ء میں پانچویں جماعت میں جامعہ ملیہ میں داخل ہوئے ۔ ڈیڑھ سال کے بعد کاندھلہ میں منتقل ہوئے اور وہاں ساتویں جماعت میں نیشنل اسکول میں داخلہ لیا ۔ ایک سال وہاں تعلیم حاصل کی ۔ پھر دلی آگئے ۔ پرائیویٹ طور پر انگریزی پڑھی اور فتحپوری مسلم ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان دے رہے تھے دو پرچے کر بھی چکے تھے کہ نومبر ۱۹۴۳ء میں مکہ معظمہ جانا پڑا ۔ یہاں ان کے والد صاحب نے گھر پر نحو صرف عربی کی ابتدائی تعلیم دلوائی ۔ اس کے بعد ۱۱ رجون سہ مطابق ۱۳۶۵ھ میں مدرسہ کے شعبہ ثانوی کے پہلے سال میں داخلہ لیا اور ۱۳۷۰ھ میں فارغ التحصیل ہوئے ۔ اس کے بعد مدرسہ میں تعلیم دی ۔ ۱۳۷۶ھ سے مدرسہ کے دفتری صیغہ میں کام شروع کیا جو اب تک جاری ہے ۔ انتہائی ملنسار متواضع ہیں اور خدمت خلق کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں اور مدرسہ صولتیہ کے نائب ناظم ہیں ۔

مولوی محمد شمیم صاحب کی شادی صادقہ بیگم بنت حافظ محمد ضیاء الدین عثمانی سے ہوئی جن سے محمد حشیم محمد زعیم محمد حلیم اور ایک صاحبزادی خدیجہ ہوئیں ۔ تینوں صاحبزادے نوعمر ہیں اور زیر تعلیم ہیں ۔

مولانا محمد سعید صاحب کے دوسرے صاحبزادے محمد نعیم صاحب نے مولوی محمد عمر

صاحب کیرانوی کے گھر میں اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں ۔ مسجد بنگلہ بستی نظام الدین دلّی میں عربی کی ابتدائی کتابیں تحصیل کیں ۔ اس کے بعد طب کی طرف رُخ کیا جو خاندانی فن تھا ۔ جامعہ طبیہ دہلی میں حکیم الیاس صاحب سے سند لی اور حکیم فرید احمد عباسی کے مطب میں ایک سال تک نسخہ نویسی کی ۔ اس کے بعد مکہ چلے آئے ۔

مکہ معظمہ میں مطب و دواخانہ قائم کیا ۔ جدہ ریڈیو کے اردو پروگرام کے اناونسر مقرر ہوئے چنانچہ یہ ذمہ داری پانچ سال تک نبھائی ۔ آپ سعودی عرب ریڈیو کے اردو کے پروگراموں کے سب سے پہلے اناونسر تھے ۔ اس سے قبل ریڈیو پر اردو پروگرام نہیں ہوتا تھا ۔

مولوی محمد نعیم صاحب کی شادی ظاہرہ خاتون بنت پروفیسر حافظ محمد عثمان صاحب ایم اے پرنسپل اسلامیہ کالج پشاور سے ہوئی جن سے ایک صاحبزادے محمد سعدی صاحب (مکہ کے چیف رجسٹرار کے سکریٹری) اور دو صاحبزادیاں صبیحہ بیگم (زوجہ احمد شجاع عثمانی) اور فائزہ بیگم (اہلیہ مظہر حسین کیرانوی) ہوئیں ۔

مولانا محمد سعید صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی محمد بشیر صاحب نے پہلے مدرسہ صولتیہ میں قرآن مجید پڑھا اور دینیات کی تکمیل کی ۔ پھر ہندوستان چلے گئے تو منشی محمد اعلیٰ صاحب سے نقشہ نویسی کا فن سیکھا ۔ انگریزی بہت اچھی جانتے تھے ۔

ابتدا میں مولوی بشیر صاحب ریاست بھوپال کے محکمہ تعمیرات میں ملازم ہوئے اور اس کے بعد بھاولپور میں منتقل ہوئے اور ہندوستان کے خطرناک تاریخی بخار کا شکار ہو کے فوت ہوئے ۔ ان کی ایک صاحبزادی جمیلہ بیگم تھیں جو تھانہ بھون میں اپنے عزیزوں میں بیاہی گئیں تھیں ۔ یہ فوت ہو چکی ہیں ۔

مولانا محمد سعید صاحب کے دوسرے بھائی مولوی محمد عتیق صاحب نے بھی بھوپال میں ملازمت کی ۔ بھوپال کی گورنمنٹ کے اسٹور کا انتظام ان کے ہاتھ میں تھا ۔ انکے کوئی نرینہ اولاد نہیں ہوئی ۔ صرف ایک صاحبزادی ظاہرہ خاتون ہوئیں جو فوت ہو چکی ہیں ۔ انکی نشانی ایک صاحبزادے ہیں جو تھانہ بھون میں آباد ہیں ۔
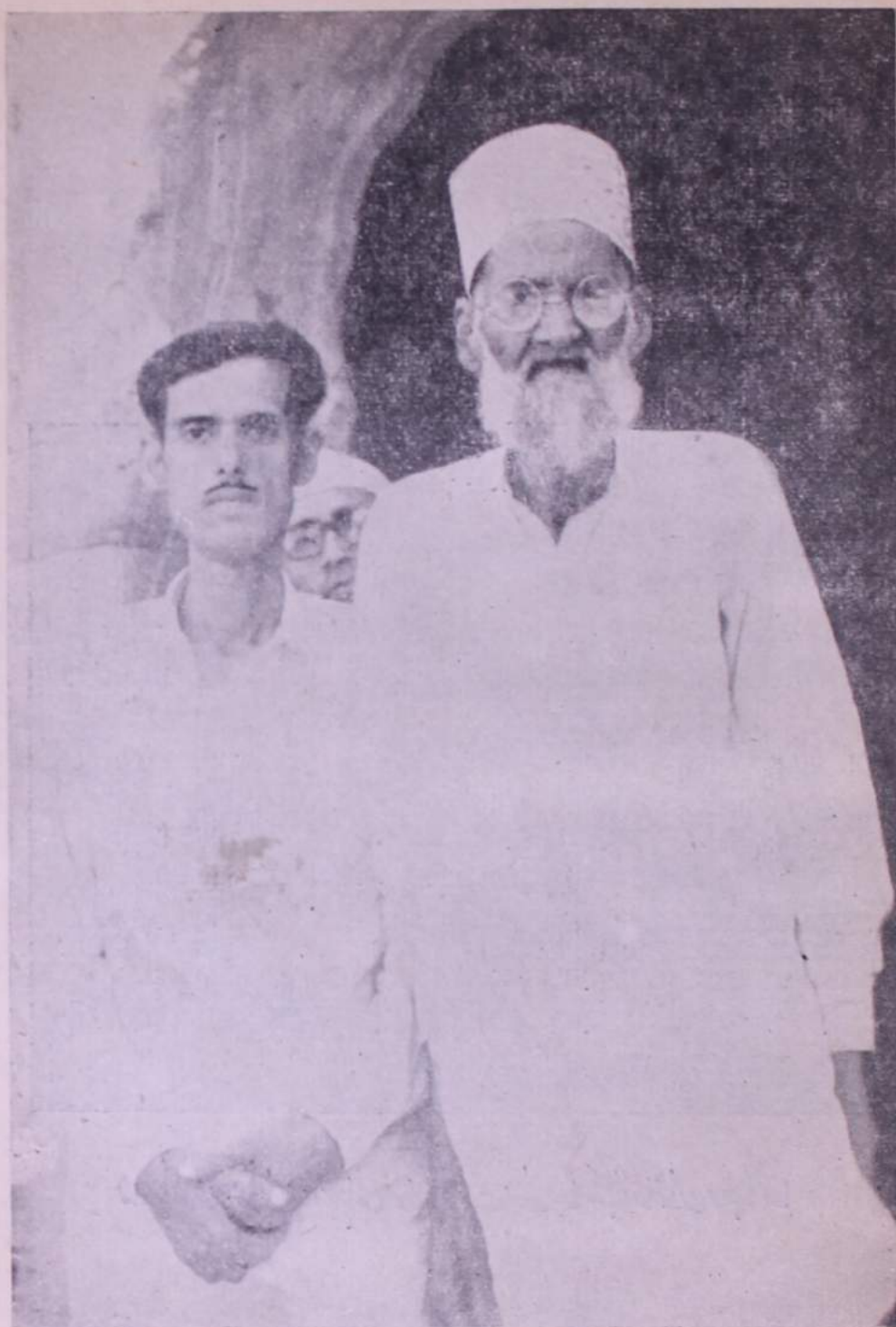
کیرانہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے خاندان کا ایک معمر فرد
جناب محمد فاروق صاحب اور ان کے قریب اُنکے صاحبزادے محمد رفیع
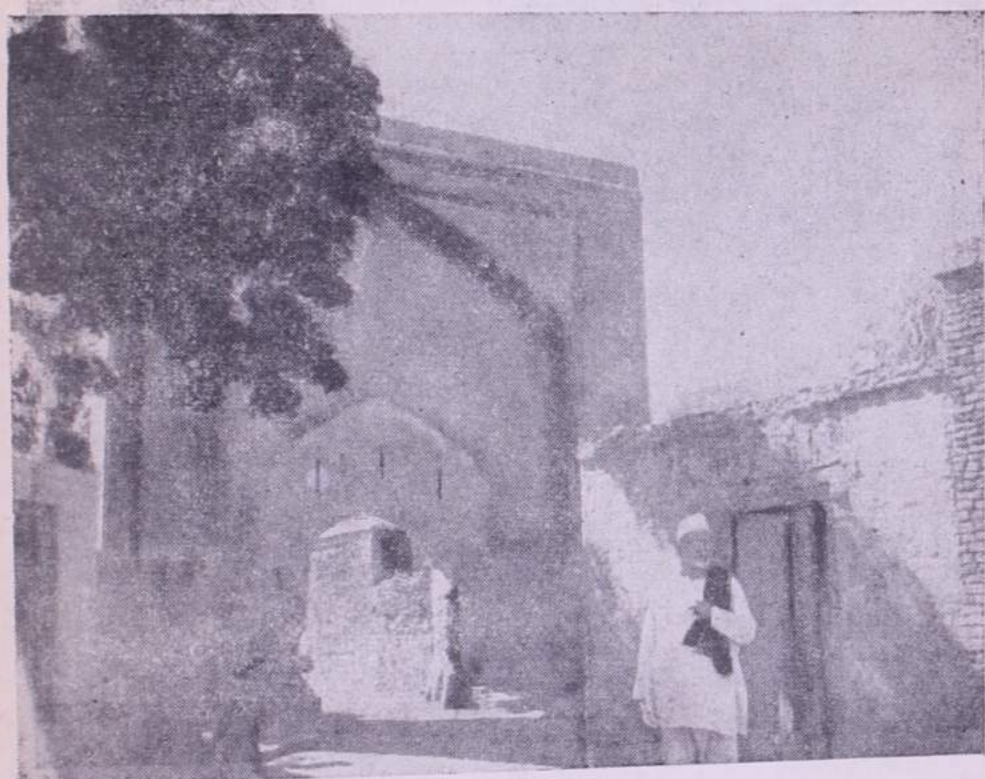
دربار دروازہ:۔ جہاں مولانا رحمت اللہ صاحب کا خاندان رہتا تھا

تعلیم و تدریس و ملازمت و تصنیف

مولانا رحمت اللہ صاحب جمادی الاول ۱۲۳۳ھ کو کیرانہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے آپ کی ولادت سے قبل آپ کی والدہ نے یہ خواب دیکھا تھا کہ وزیر النساء ہمشیرہ خورد مولوی صاحب یہ کہتی ہیں کہ بڈولی والی تیرے نام پر کیا چاند روشن نہیں ہوا۔ جس کی روشنی تمام عالم میں پھیلے گی۔[1] آغاز طفولیت ہی میں آپ کی صلاحیت کا اظہار ہونے لگا تھا اور بارہ برس کی عمر میں آپنے فارسی کی درسی کتابیں پڑھ لی تھیں بعدہ علم حاصل کرنے کے لئے اپنے خالہ زاد بھائی شیخ فریدین ساکن قصبہ بڈولی ضلع مظفر نگر اور مولوی احمد علی کیرانوی کے ہمراہ شاہجہاں آباد گئے۔ مدرسہ مولوی حیات میں مقیم ہوئے اور مولانا حیات سے تعلیم حاصل کرنی شروع کی ۱۲۵۰ھ میں آپ کے والد ماجد راجہ ہندو راؤ بہادر مرہٹہ دہلی کے ہاں پیشکاری پر ملازم ہوئے اور ترولین گنج بیرون لاہوری گیٹ جانب غرب متصل پہاڑی دھیرج میں مقیم ہوئے۔ جب مولانا کے والد ماجد دہلی میں اس جگہ پر آگئے تو مولانا رحمت اللہ صاحب انہیں کے ساتھ رہنے لگے۔ دن میں مدرسہ مولانا محمد حیات میں تعلیم پاتے اور رات کو اکبر نامہ راجہ موصوف کو سناتے تھے اور والد کا ہاتھ بٹانے کے لئے خطوط نویسی کی بھی ذمہ داری لے لی تھی۔ اس کو انتہائی خوبی و لیاقت کے ساتھ انجام دیا۔ جس پر راجہ صاحب نے ان کی بھی تنخواہ مقرر کر دی۔ چند ماہ کے بعد راجہ صاحب نے

---

[1] تذکرہ اولیاء ہند جلد دوم ص ۱۶۷

مولانا کے والد کو موقوف کر دیا اور ان کی جگہ مولانا صاحب کو خطوط نویسی کے لئے رکھ لیا اور تین چار ماہ بعد ان کو بھی ملازمت سے سبکدوش کر دیا۔

لکھنو کی علمی شہرت آپ سن چکے تھے۔ ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد چند طلبہ کے ساتھ تحصیل علم کے لئے لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ وہاں مفتی سعد اللہ صاحب مراد آبادی سے مسلم الثبوت اور میر زاہد پڑھی۔ اس کے بعد اپنے وطن کیرانہ چلے آئے اور حسب ذیل اساتذہ سے مختلف علوم کی تکمیل کی۔

مولانا علی احمد صاحب بڈولی ضلع مظفر نگر اور مولانا حافظ عبد الرحمن صاحب چشتی سے ابتدائی علوم عربی۔ مولانا امام بخش صاحب سے فارسی۔ مصنف لوکارتم سے ریاضی۔ حکیم فیض محمد صاحب سے طب۔ شاہ عبد الغنی صاحب سے دورہ حدیث پڑھا۔

ان اساتذہ کا اپنے دور میں اور علمی دنیا میں کیا درجہ تھا اور کس حیثیت قابلیت کے لوگ تھے۔ اس کا اندازہ ان کے مختصر سے حالات زندگی سے ہو سکتا ہے۔

مولانا محمد حیات صاحب

سرسید مرحوم نے مولانا حیات کے حالات زندگی اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید میں لکھے ہیں۔ جو یہ ہیں۔

"وطن اصلی آپ کا پنجاب ہے۔ اسی نواح میں تحصیل علوم رسمی سے فراغ حاصل کر کے چندے اطراف ہندوستان میں بلباس طالب علمی بسر کی اور پھر شاہجہاں آباد (دہلی) میں وارد ہو کر اوائل حال میں شاہ سید صابر علی معروف بہ شاہ صابر بخش رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں فروکش ہو کر درس علم معقول اور منقول میں مصروف رہے۔ چونکہ علم و فضل آپ کا رشک اقران و امثال تھا۔ طلباء اطراف و جوانب سے تحصیل علم کے واسطے حاضر خدمت ہو کر آپ کی تعلیم کے فیض سے مرتبہ فضیلت کو پہنچتے اور آپ کے یہاں کا ادنیٰ طالب علم اور جگہ کے فضلاء سے بہتر گنا جاتا تھا۔ چند تلمیذ آپ کے فیض خدمت سے یکتائے عصر اور یگانہ دہر ہو گئے۔ خصوصاً حافظ عبد الرحمٰن کہ آپ کی تعریف و توصیف علم و فضل کی حیز مقال اور

حیطۂ گفتگو سے باہر ہے باوجودیکہ یہ بزرگوار بصارت سے معذور ہیں۔ کوئی علم عقلیہ اور نقلیہ سے ایسا نہیں کہ اس کو محققانہ نہ جانتے ہوں اور طرفہ تر یہ ہے کہ ہیئت اور ہندسہ باوجود بینائی نہ ہونے کے اس طرح بے تکلف پڑھاتے ہیں کہ اور ماہرین یعنی اس فن کے اگر ہزار چشم بمطالعہ شب و روز صرف کتاب کریں تو حیثیت خطوط و دوائر کی ویسی آپ نہ سمجھیں اور نہ دلنشیں تلمیذ کے کر سکیں از بسکہ حضرت موصوف کے مزاج تقدس امتزاج پر قدیم الایام سے ترک غالب تھا۔ جب ایسے تلامذہ باکمال کو فارغ التحصیل اور لائق درس و تدریس کے پایا۔ اپنی طبیعت کو اس طرف سے اٹھا کر ذکر و اشغال کی طرف مصروف کیا اور بکمل فقرا و عظمائے مشائخ سے فیض باطن کو کسب اور نعمائے معنوی کو حاصل کیا اور رنج سفر اپنی ذات موہبت آیات پر گوارا کر کے پاک پٹن میں جا کر حضرت شاہ سلیمان صاحب کی خدمت میں مشرف ہوئے اور ان کے فیض صحبت سے تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کو بکمال پہنچایا اور رخصت انصراف حاصل کر گے پھر وارد شاہجہاں آباد ہوئے۔ ان دنوں شاہ صابر بخش صاحب جہان فانی سے راہی عالم باقی ہو چکے تھے۔ ان کی خانقاہ کی بود و باش کو ترک فرما کر ایک مسجد میں کہ قریب قلعہ مبارک واقع ہے سکونت اختیار کی اور آج تک وہیں تشریف رکھتے ہیں۔ آپ کی برکت قدوم سے اس مسجد کی مرمت ہر سال ہوتی رہتی ہے اور ایسی آباد ہوگئی ہے کہ اب اس کو بہ اعتبار کثرت عباوات اور وفور طاعات خیر المساجد اور افضل المعابد کہنا چاہیئے۔ اب سن شریف آپ کا قریب ستر کے پہنچا ہے۔ خدائے عزوجل آپ کی عمر کی ترقی کرے کہ طالبان صادق کو آپ کے فیض باطن سے فوائد کثیر اور ہدایت موفور حاصل ہوتی رہے"! (۲۶)

مولانا مفتی سعد اللہ

مفتی صاحب کے والد مولوی نظام الدین صاحب تھے آپ مراد آباد کے باشندے تھے۔ محلہ کسرول مولسری والی مسجد کے عقب میں مکان تھا۔ ۱۷ رجب ۱۲۱۹ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کی عمر بہت چھوٹی تھی اس وقت ان کے والد کا انتقال ہوا۔ ان کے بڑے بھائی نے ان کی تربیت کی اور تعلیم

دلوائی شروع کی تو بھاوج کی معمولی سی شکایت پر بڑے بھائی نے کچھ ایسی سختی کی کہ آپ گھر سے نکل کر مفقود الخبر ہو گئے۔ شہر در شہر پھر کر علم حاصل کیا۔ رامپور کی فراش خانہ کی مسجد میں بھی مقیم ہوئے اور مولوی نور محمد خاں صاحب سے تعلیم حاصل کی۔ نجیب آباد پہنچے وہاں مولوی عبدالرحمن قہستانی سے شرح جامی اور دیگر کتب پڑھیں۔ ۱۲۳۹ھ میں اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی میں مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی، مولوی محمد اسحاق صاحب دہلوی، اخوند شیر محمد ولایتی مولوی صدر الدین خاں صاحب سے اکثر کتب درسیات پڑھیں۔ مرزا محمد ہاشم علی صاحب محدث لکھنوی۔ ملا حسن صاحب، مولوی محمد اسماعیل صاحب مراد آبادی۔ مولوی محمد ظہور اللہ صاحب لکھنوی، مرزا حسن علی صاحب محدث لکھنوی، شیخ جمال صاحب مکی، مولوی محمد حیات صاحب پنجابی دہلوی سے علوم فنون کی تکمیل کی۔ فارغ التحصیل ہو کر ۱۲۴۳ھ کو لکھنؤ پہنچے وہاں سے انہوں نے اپنی موجودگی کی اطلاع اپنے اقربا کو دی جو انہیں وہاں سے مراد آباد لے گئے۔ اس وقت ان کی شادی ہوئی۔ پھر مدرسہ شاہی لکھنؤ میں مدرس مقرر ہوئے۔ اس کے بعد تاج اللغات ترجمہ قاموس کے دفتر میں ملازم ہوئے۔ بعدہٗ مفتی کچہری کوتوالی کے عہدہ پر ترقی پائی۔ ملازمت میں انتیس سال گذارے سنہ ۱۲۶۰ھ میں مولوی محبوب علی صاحب مراد آبادی سے شاہ پیر محمد کے ٹیلہ والی مسجد میں تعدد جمعہ پر مناظرہ ہوا اور سنہ ۱۲۷۰ھ میں حج کے فریضہ سے فارغ ہوئے

سلطنت اودھ کے خاتمہ کے بعد ۱۸۵۷ء سے پہلے نواب یوسف علی خاں والی رامپور نے ان کو رامپور بلا کر عہدۂ قضا و افتا پر مامور کیا اور حاکم مرافعہ پر تقرر کیا۔ نواب یوسف علی خاں صاحب کے علاوہ آپ کے شاگرد بے شمار تھے۔ قابل ذکر نام یہ ہیں۔

ملا نواب صاحب مہاجر، ملا محمد نجف صاحب ولایتی، مولوی حکیم عبدالکریم خاں صاحب رامپوری۔ مولوی حکیم علی حسین خاں صاحب لکھنوی، مولوی رحمت اللہ صاحب کیرانوی، حکیم فرزند علی صاحب شاہجہانپوری، مولوی حکیم احمد سعید صاحب امروہوی، مولانا مفتی

دوست محمد صاحب ولایتی مفتی ریاست ٹونک، مولوی فریدالدین صاحب، مولانا شاہ عبدالحق صاحب کانپوری، حکیم محمد ابراہیم صاحب لکھنوی، مولانا شاہ عبدالغفار صاحب کانپوری مولوی انور علی صاحب لکھنوی، مولانا ہادی علی صاحب لکھنوی، حکیم شبیر علی صاحب امروہوی وغیرہ۔

مفتی سعد اللہ صاحب جیسے جامع اور کامل عالم بہت کم پیدا ہوئے ہیں۔ آپ عربی وفارسی زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں آشفتہ تخلص تھا۔ آپ کی تصانیف کثیر ہیں۔[1]

مولانا امام بخش صاحب صہبائی مولانا صہبائی صاحب ایسے جامع صفات عالم تھے جن کی نظیر نہیں ملتی ان کا باطن وظاہر، قول وفعل ایک تھا۔ باطنی اور ظاہری کمالات کی وجہ سے یہ مقبول عام اور پسندیدہ خلائق تھے۔ ان کا سلسلہ نسب والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک اور والدہ ماجدہ کی جانب سے حضرت محبوب سبحانی شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔

مولانا صہبائی نے علامہ عبداللہ خاں علوی سے عربی وفارسی پڑھی۔ استاد کا اثر شاگرد پر پڑا۔ مولانا صہبائی نے فارسی میں کمال حاصل کیا اور عربی میں معقول استعداد بہم پہنچائی۔ اور نوعمری میں مرزا قتیل فریدآبادی جیسے عالم سمجھے جانے لگے جس سے استاد کے نام کو چار چاند لگے۔

مولانا صہبائی ابتدا میں معلم تھے۔ مدت کے بعد جب ان کی لیاقت اور فارسی دانی کا چرچا دہلی میں ہوا۔ تو امیروں کے بچوں کو پڑھانے لگے۔ چنانچہ گڑھ والوں اور بعض متمول کشمیریوں اور متفرق مقامات کے طالب علموں کو پڑھا کر بسر اوقات کرتے تھے۔ اس کے بعد نواب حامد علی خاں کے لڑکوں کو تعلیم دینے لگے۔[2] ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے۔

دہلی کے علمی ادبی محفلوں اور علماء اور معززین کے طبقوں میں مولانا صہبائی صاحب کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ معزز اور بااثر لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

[1] تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۵۲ [2] طبقات الشعراء

تقریباً ہر ایک علمی سماجی، سیاسی معاملہ میں ان سے مشورہ لینا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اور آپ تقریباً ہر ایک معاملہ میں دلچسپی لیتے تھے۔

جب دہلی میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ابتدا ہوئی تو جہاں دہلی کے اور لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔ اس میں آپ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ جنگ کی ناکامی کے بعد سب سے زیادہ دہلی میں آپ کے محلے اور آپ کے خاندان پر ظلم ہوا اور آپ کے خاندان کے کافی افراد فرنگیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے

منشی ذکاراللہ صاحب نے اپنی تالیف تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند میں ان ظالمانہ واقعات کا ذکر کیا ہے۔

"مسلمانوں کا کوچہ چیلوں کا بالکل قتل ہوا۔ اس پر یہ آفت آئی کہ اس میں کوئی سپاہی انگریزی لشکر کا زخمی ہوا یا مارا گیا۔ سپاہی کو کسی نے گھائل کیا۔ اس کے باب میں روایات مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ نواب شبیر جنگ خاں کے بیٹے محمد علی خاں نے کوئی کہتا ہے حکیم فتح اللہ خاں نے ایک سپاہی کو اس لئے زخمی کیا تھا کہ ان کے زنانہ میں بدنیتی سے جانا چاہتا تھا۔ غرض اس قصور میں کہ اس محلہ میں ایک سپاہی زخمی یا قتل ہوا۔ حاکموں نے حکم دیا کہ اس کوچہ کے سارے مردوں کو مار ڈالو۔ پکڑ کے لے آؤ۔ بہت سے مردوں کو تو سپاہیوں نے ان کے گھروں میں مار ڈالا۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں کوئی نہ کوئی مرد مارا نہ گیا ہو۔ کچھ آدمی زندہ بھی گرفتار ہوئے جن کو حکم ہوا کہ جمنا کی ریتی میں قلعہ کے نیچے گولی سے مار دیئے جائیں۔ سپاہی ان کو ریتی میں لے گئے۔ ان پر سپاہیوں نے صرف گولیوں کی ایک باڑ ماری۔ ان میں سے دو آدمی مرزا مصطفٰے بیگ اور وزیر الدین زندہ بچے جو اس قتل کا حال بیان کرتے ہیں کہ ہم سب رسن بستہ جمنا کی ریتی میں گئے۔ گولیوں کی باڑ ہم پر سپاہیوں نے صرف ایک مرتبہ ماری پھر وہ چلے گئے۔ بہت سے تو گولیوں کے لگتے ہی سرد ہوئے۔ بعض ان میں سے دریا کی طرف بھاگے۔ آگ سے بچے مگر پانی میں ڈوب کر مرے۔ ان دو آدمیوں میں سے مرزا مصطفٰے بیگ

قلعہ کی طرف بھاگا۔ اس کے کوئی گولی نہیں لگی تھی۔ وزیرالدین مہابت خاں کی ریتی کی طرف بھاگا۔ اس کی ساق میں ضعیف سا گولی کا زخم لگا تھا۔ یہ دونوں بچ کر زندہ سلامت رہے مرزا رسالدار سواروں میں ہوا اور وزیرالدین کانپور کی ججی کا سررشتہ دار رہا۔ ان مقتولوں میں بے گناہ ایک صاحب کمال مولوی امام بخش صہبائی اور اس کے کنبے کے اکیس مرد تھے۔ جن میں سے صرف مولوی صاحب کا بھانجا جو داماد بھی تھا۔ وزیرالدین بچا۔ باقی سب فنا ہوئے۔ مولوی صہبائی دہلی کالج میں مدرس اول فارسی تھے۔ ہندوستان میں کوئی ان کی برابر فارسی زباں کا محقق نہ تھا۔ معمے وعروض وقوافی میں کمال تھا۔ ان کے ہندو مسلمان صدہا شاگرد تھے (۲۰۶)"

مولانا صہبائی کا درس وتدریس کے بعد تمام وقت تصنیف وتالیف میں گذرتا تھا فارسی میں کثرت سے کتابیں لکھیں۔ آپ ایک معلم ہی نہیں بلکہ ادیب اور مانے ہوئے شاعر تھے۔ اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ فارسی اور عربی میں شعر کہتے تھے۔

مولانا عبدالرحمن چشتی

آپ شاہ وقت کے استاد تھے۔ تمام علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان سے استفادہ کے زمانے میں حضرت مولانا کے رفقاء میں مولانا عبدالرحمن صاحب پنجابی اور مولانا سید محمد علی صاحب بھی تھے جو اپنے وقت کے فاضل اور صاحب فیض بزرگ تھے۔ مولانا شاہ عبدالرحمن صاحب چشتی اور ان کے استاد مولانا محمد حیات بستی حضرت نظام الدین اولیا دہلی میں مدفون ہیں۔

شاہ عبدالغنی صاحب سے آپ نے مدرسہ رحیمیہ میں تعلیم پائی تھی۔ یہ مدرسہ اپنے زمانہ میں ایشیا کی بڑی دینی درسگاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے والد ماجد نے قائم کیا تھا بقول مولانا مفتی عزیزالرحمن صاحب یہ مدرسہ اس جگہ تھا جس مقام پر شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا مزار ہے۔ جس کو آج کل مہندیوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے[1] یہ صحیح نہیں ہے کہ یہ مدرسہ مہندیوں میں تھا بلکہ کلاں محل کے

[1] تذکرہ مشائخ دیوبند

قریب تھا۔ چنانچہ وہاں کی ایک گلی کا نام مدرسہ شاہ عبدالعزیز ہے۔

اس مدرسہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب کی طرح حسب ذیل حضرات نے بھی تعلیم پائی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اس مدرسہ کی سرپرستی شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے تھے۔ اور درس وتدریس کی خدمات بھی آپ ہی انجام دیتے تھے۔

(۱) مولانا شاہ رفیع الدین صاحب (۲) مولانا شاہ عبدالقادر صاحب (۳) مولانا شاہ عبدالغنی صاحب (۴) مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب (۵) مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب (۶) مولانا شاہ عبدالحی صاحب (۷) مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید (۸) حضرت سید احمد شہید صاحب بریلوی (۹) مولانا رشیدالدین صاحب دہلوی (۱۰) مولانا مفتی صدرالدین صاحب (۱۱) مفتی الٰہی بخش صاحب (۱۲) حضرت شاہ غلام علی صاحب (۱۳) مولانا مخصوص اللہ صاحب (۱۴) مولانا کریم اللہ صاحب (۱۵) مولانا میر محبوب علی صاحب (۱۶) مولانا عبدالخالق صاحب (۱۷) مولانا حسن علی صاحب لکھنوی (۱۸) مولانا حسین احمد صاحب ملیح آبادی (۱۹) مولانا رحیم بخش صاحب (۲۰) مولانا فضل حق خیرآبادی (۲۱) مولانا مملوک علی صاحب (۲۲) مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی (۲۳) مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی (۲۴) مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی (۲۵) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (۲۶) مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی (۲۷) حافظ رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ ان حضرات نے دورۂ حدیث شاہ عبدالغنی صاحب سے پڑھا ہے اور شاہ عبدالغنی صاحب اسی میں پڑھاتے تھے[1]

۱۲۵۶ھ میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنی خالہ کی لڑکی سے شادی کی۔ ۱۲۵۷ھ میں پھر مہاراجہ ہندو راؤ نے آپ کو اور آپ کے والد صاحب کو اپنے پاس دہلی باڑہ ہندوراؤ میں بلالیا اور مولانا کو اپنا میر منشی مقرر کیا اور ان کے والد ماجد کے ذمہ

[1] تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۳۸

جائداد کی نگرانی اور دیکھ بھال کا کام سپرد ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ان کے والد مولوی خلیل اللہ صاحب فوت ہو گئے اور بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے مولانا رحمت اللہ صاحب نے مہاراجہ ہندو راؤ کے یہاں اپنی جگہ پر اپنے چھوٹے بھائی محمد جلیل صاحب کو ملازم رکھ کر علیحدگی اختیار کر لی اور کیرانہ پہنچکر درس و تدریس کا کام شروع کر دیا۔ مولانا کا یہ علمی کا زمانہ بہت محدود ہے۔ زمانے کے ناساز گار حالات اور خاص طور پر ہندوستان میں نصاریٰ کے بڑھتے ہوئے اثر و اقتدار کو روکنے کی فکر نے آپ کو اس کا موقع نہیں دیا کہ اطمینان کے ساتھ تعلیم و تدریس کا فیض عام جاری رکھتے۔ تکمیل تعلیم اور اکبر آباد کے یادگار زمانہ مناظرہ کے درمیانی عرصہ میں چند سال تک دربار کیرانہ کی مسجد میں مولانا نے ایک دینی مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس مدرسہ کے فیضیاب طلبہ میں سے بعض اصحاب نے مکہ معظمہ میں بھی پہنچکر حضرت مولانا سے شرف تلمذ حاصل کیا اور اسباق میں شرکت کی جن میں کے قابل ذکر اسماء یہ ہیں۔

(۱) مولانا عبدالسمیع صاحب رامپوری مصنف حمد باری

(۲) مولانا احمد الدین صاحب چکوالی

(۳) مولانا نور احمد صاحب امرتسری

(۴) مولانا شاہ ابوالخیر صاحب

(۵) علامہ مولانا شرف الحق صاحب صدیقی

(۶) مولوی قاری شہاب الدین صاحب عثمانی کیرانوی

(۷) مولانا حافظ الدین صاحب دجانوی

(۸) مولانا عبدالوہاب صاحب ویلوی بانی مدرسہ باقیات الصالحات۔ مدراس

(۹) مولانا امام علی صاحب عثمانی

(۱۰) مولانا بدر الاسلام صاحب عثمانی کیرانوی مہتمم حمیدیہ کتب خانہ شاہی قسطنطنیہ

تصنیف و تالیف انگریز ہندوستان میں جہاں اور جس جگہ اپنے قدم جماتا وہ امریکہ

برطانیہ، جرمنی اور فرانس کی نصرانیت کی تبلیغی جماعتوں کے ٹڈی دل مشنریوں اور پادریوں کو شہروں کے گلی کوچوں بازاروں، دیہاتوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں اسلام اور بانیٔ اسلام جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رکیک الزامات لگانے کے لئے بھیجتا تھا وہ قرآن مجید کی توہین، وتضحیک کرتے اور ازواج مطہرات پر شرمناک الزام لگاتے اور اسی قسم کی کتابیں بھی شائع کرتے تھے اور ہندوستانیوں کو مرعوب کر کے ان کو معاشی پریشانیوں میں مبتلا کر کے عیسائی مذہب میں داخل کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی خطرناک حرکتوں کا جواب دینے کے لئے علماء نے قلم بھی اٹھایا اور قدم بھی، زبان بھی کھولی اور ردِ نصاریٰ میں مستغرق ہوئے اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ عیسائیوں کی اسلام کے خلاف کتابوں کی جواب میں کتابیں طبع کرانے لگے۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے ردِ نصاریٰ میں کتابیں لکھنے کی حسب ذیل وجوہات تحریر فرمائی ہیں۔

"جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کرلی اور مکمل انتظام کرلیا تو اس ۳۳ سال کے عرصہ میں ان کے علماء (پادریوں) کی طرف سے کوئی تبلیغی دعوت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے رسالے کتابیں اسلام کی تردید میں لکھنے شروع کئے اور ان کو ہندوستان کے مختلف شہروں اور عوام الناس میں تقسیم کرنا شروع کر دیا اور بازاروں اور لوگوں کے مجمعوں میں اور عام گذرگاہوں پر وعظ کہنے لگے۔ مسلم عوام ایک مدت تک ان کی باتیں اور مواعظ سننے سے پرہیز کرتے رہے اور ان کی کتابوں اور ان کے رسالوں کے دیکھنے سے متنفر رہے۔ اس لئے ہندوستانی علماء نے ان رسالوں کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن کچھ مدت کے بعد بعض عوام الناس اور جہلا ان کی باتوں پر راغب ہوئے اس وقت خوف پیدا ہوا کہ بے علم مسلمان ان کے پھندوں میں نہ پھنس جائیں۔ اس لئے

علمار اسلام نے ان کی تردید شروع کی ہیں اگرچہ گمنامی کے گوشہ میں تھا اور
علمار کے زمرہ میں میرا شمار نہ تھا۔ لیکن جب میں نے ان کی تقریروں اور
تحریروں کو دیکھا اور بہت سے مطبوعہ رسالے میرے پاس پہنچے تو میں نے
چاہا اپنی حیثیت قابلیت کے مطابق ان کی تردید کرنے کی کوشش کروں
لہذا میں نے چند کتابیں اور چند رسالے حقیقت حال کے اظہار کے لئے
لکھے "

مولانا رحمت اللہ صاحب نے ان ہی حالات کے پیش نظر اپنے استاد شاہ عبدالغنی
سکنہ خانقاہ غلام علی شاہ کی فرمائش پر ازالۃ الاوہام کی ترتیب شروع کر دی۔ ابھی یہ کتاب
مکمل نہیں ہوئی تھی کہ آپ تپ ولرزہ کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ مسہلات دینے کے باوجود
مرض میں افاقہ نہیں ہوا۔ اکثر طبیبوں کی رائے سے دق کا مرض تجویز ہوا۔ چونکہ حکیم علی اکبر
صاحب کا علاج ان طبیبوں کی رائے کے برخلاف تھا اور اس بیماری سے تمام خاندان
میں تشویش پیدا ہو گئی تھی اس لئے ان کی والدہ سے عم کلاں اور ہر دو عم خورد اور دیگر اعزا
نے کہا۔ مولانا کی ذات فخر خاندان ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کا علاج کوئی اور طبیب
کرے۔ لیکن والدہ نے ان لوگوں کی رائے سے اتفاق نہیں کیا بلکہ ان کے بھائی
کے علاج کو ہی قابل اعتبار سمجھا۔ مولانا صاحب بیماری سے اس قدر کمزور ہو گئے تھے
کہ بیٹھنے سے معذور ہو گئے تھے اور چارپائی پر لیٹے ہوئے نماز ادا کرتے تھے۔ اسی حالت
میں ایک روز آپ نے فرمایا کہ دیکھو میں نماز ظہر پڑھتا ہوں۔ کوئی آگے سے نہ نکلے۔ نماز ہی میں
آپ بیہوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آئے تو رو رہے تھے۔ ان کے بھائی
حکیم علی اکبر صاحب نے یہ سمجھا کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے ہیں۔ اس لئے رو رہے ہیں
اس پر مولوی صاحب نے اپنے بھائی سے کہا۔ خدا کی قسم اگرچہ صحت کی کوئی علامت
نہیں ہے لیکن انشاء اللہ میں تندرست ہو جاؤں گا۔ میرے رونے کی وجہ زندگی سے

مایوسی نہیں بلکہ یہ ہے کہ میں نے اس وقت خواب میں دیکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معہ شیخین رضی اللہ عنہما تشریف لائے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا رئیس المجاہدین یا رئیس المعاندین اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا بدحی لاث بافتی رسول اللہ قال کنا اکتا
یعنی اے جوان خوشخبری ہو کہ تیرے حق میں رسول اللہ ؐ نے ایسا کہا۔ اگرچہ تالیف ازالۃ الاوہام مرض کا باعث بنی لیکن یقین ہے کہ یہی شفا کا باعث بنے گی چنانچہ اس خواب کے بعد آپ روبصحت ہو گئے اور ازالۃ الاوہام کے جو اوراق منتشر ہو گئے تھے۔ سات ماہ کے عرصہ میں آپ نے ان کو درست کیا[۱]

ازالۃ الاوہام کے طبع ہونے سے قبل ہی دہلی میں کافی شہرت ہو گئی تھی اور اس کی تردید کرنے اور جواب لکھنے کی ماسٹر رام چندر جیسے لوگ تیاریاں کرنے لگے تھے۔ اس پر مولانا نے یہ طے کیا کہ اس کتاب کا مسودہ کسی لائق و فاضل عالم کو دکھا لیا جائے تاکہ اس میں جو سقم ہوں وہ دور ہو جائیں۔ نظرِ انتخاب حضرت مولانا نورالحسن صاحب بن انوارالحسن صاحب بن مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی پر پڑی۔ چنانچہ آپ نے اس کتاب کے جتنے مسودہ پر نظرثانی کر لی تھی اتنا ہی حصہ معہ حسب ذیل خط کے مولانا نورالحسن صاحب کو روانہ کر دیا تھا۔ یہ خط فارسی میں تھا۔ عبارت ملاحظہ ہو[۲]

کشاف دقائق مشکلہ حلال عقد نکات	مشکل دقیقوں کو واضح کرنے والے اور دشوار
منفصلہ مقدام المتاخرین تذکرہ علماء المتقدمین	نکات کی گرہ کھولنے والے متاخرین کے پیشرو
ثالث شیخین بل ثالث معلمین آیتے از آیات	اور علماء متقدمین کی یادگار، شیخین کے تیسرے
رب ذوالمنن مولانا واجدنا مولوی محمد نورالحسن	بلکہ معلمین کے تیسرے پروردگار ذوالمنن
صاحب لازال شموس فضلہ بازغۃ الی یوم	کی نشانیوں میں سے ایک نشانی مولانا واجدنا
یوم القیام ولا یبرح مستفیدۃ رضی البال و	مولوی محمد نورالحسن صاحب ان کے فیوض کے
مقتضی المرام ان اظہار شوق ملازمت	آفتاب قیامت تک ہمیشہ درخشاں رہیں

[۱] تذکرۃ الاولیاء ہند جلد دوئم صـ ۳۲۱ [۲] حالات مشائخ کاندھلہ صـ ۱۵۳

کثیر الافادت کہ لحاظ کثرت تش اغماض را
از انتا خواستگار و اظہار آن گو موافق نفس
الامر باشد منہی از ارتکاب رویہ ظاہر
پرستاں نزد اہل روزگار است طی الکشح
نمودہ مکلف خدمت بندگان والامی گرداند
کہ سمع خبر ہائے فروکشیدن آں جناب بہ دولت خانہ
اگرچہ دل نحیف را برآں می آرد کہ دراں جا
رسیدہ رفع تعطش شوق بآب زلال
قدمبوسی اشرف گرداند مگر تقاضائے بخت
وندان خامی بعکس آن بظہور می گراید و آں
اینکہ از پنج و شش روز بواسطہ عارضہ
بخار و تبور فاقد نقد صحت می باشد بعد حصول
آں اگر خواستہ خدا است اغلب کہ دست
یابی بریں مراد شود و خدام جناب حضرت
مولانا مملوک علی صاحب بذریعہ عنایت
نامہ و ہم بوساطت زبانی آیندگان آں صوب
رسالہ ازالۃ الاوہام را کہ از تالیفیات
کمترین خلائق است بارادہ طبع او طلب
می فرمایند و خشک بیانی و بے جوہری
احقر را اگرچہ بعض اولی الابصار بخوبی
واقف اند لیکن بندگان مولینا مفخم بہ سبب

اور فارغ البالی اور مقصد وری سے مستفید رہیں
اس ذات کثیر الافادہ خدمت گذاری کے شوق
کے اظہار سے کہ اسکی زیادتی کا لحاظ اس سے
چشم پوشی کا مقتضی ہے اور اس سے درگذر
کرنا اگرچہ واقعہ کے مطابق ہو اہل زمانہ کے
نزدیک ظاہر پرستوں کے رویہ کا بے جا
ارتکاب ہے۔ پہلو تہی کر کے بندگان عالی
کی خدمت میں معروض کرتا ہے کہ آنجناب
کے دولت خانہ میں پاؤں پھسل کر گرنے کی خبر کو
سنا۔ اگرچہ دل نحیف کو اس پر برانگیختہ کرتا ہے
کہ وہاں پہنچکر شوق کی پیاس کو قدمبوسی اقدس
کے آب زلال سے رفع کرے۔ مگر بخت
ناساز گار کا تقاضا اس کے برعکس ظاہر
ہو رہا ہے۔ پانچ چھ روز بخار وغیرہ عوارض
کی وجہ سے صحت کی پونجی سے محروم ہوں۔
صحت حاصل ہونے کے بعد اگر خدا نے چاہا
تو اغلب گمان ہے کہ اس مراد پر کامیابی
ہوگی۔ جناب کے خادم حضرت مولانا
مملوک علی صاحب بذریعہ عنایت نامہ اور
اس طرف سے آنے والوں کے زبانی پیام
سے رسالہ "ازالۃ الاوہام" کو جو اس کمترین خلائق

این که ایں بے نصیب گاہی در محفل فیض مشاکل
شاں استفادہ نہ برداشتہ وقوف کما ینبغی
از کم استعدادی این ہیچ میرز ندارند ازیں جہت
ازارسال آں توقفے بکار رفت کہ مبادا جناب
مولانا پس ملاحظہ اش خیال طلب کردہ وسجیہ
رضیہ بزرگان اکار فرمودہ خطاہا را پوشیدہ
بقالب طبع درآرند و بعدش زلات وخطایا
ایں سراپا خطا دست آویز بر مخالف عنید
گردد واز اکثر اشخاص مرا وسیلہ چشم پیش
داشتن شود ایں کار خوردن بہر حال شیوہ
محمود علاوہ ازیں چند متنفراں را مثل ماسٹر
رامچندر وغیرہ را ارادہ رد آن بعد دستیابی
نسخہ اش در دل موجود - زیادہ تر احتیاط بکار
بردن را واجب می سازد و دریں ضلع سوائے
ذات مصدر حسنات دیگر کدامی نیست کہ دریں
باب از ذاتش استصلاح استفسار کرد دریں باب
بعمیل آید - لہذا اکثر اجزا ئیش کہ بمقابلہ نظر ثانی
شوند بشرط فرصت للہ و لرسولہ نظر بر آن فرمائید
و جائیکہ بجہت کوتہی استعدادم خطائے سرزد شدہ
اصلاح نمایند و اگر شومی طالع ام کل قابل محو
باشد و بہ فحوائے لن یصلح العطار ما افسدۃ الدہر

کی تالیفات سے ہے طباعت کے لئے
طلب فرما رہے ہیں اور راحقر کی خشک جانی
اور بے جوہری سے اگرچہ بعض اہل بصیرت
بخوبی واقف ہیں لیکن مولانا مفخم کی عالی
ذات (چونکہ اس بے نصیب کو کبھی ان
فیض مآب مجلس میں استفادہ کا موقع نہیں
ملا) پورے طور پر اس انجان کی کم استعدادی
سے واقفیت نہیں - اس وجہ سے اس
رسالہ کو بھیجنے میں توقف رہا ہے کہ مبادا
حضرت مولانا اس کو ملاحظہ کے بعد محض اپنی
طلب کی بنا پر بزرگوں کی پسندیدہ عادت
کے موافق خطاؤں کو نظر انداز فرما کر طبع کرا دیں
اور بعد میں اس سراپا خطا کی خطائیں اور
لغزشیں مخالف دشمن کے لئے دستاویز
بن جائیں اور بیشتر لوگوں سے مجھے نگاہ
نیچی کرنے کا ذریعہ نہ بنے - یہ ذلت اٹھانا بھی
بہر حال پسندیدہ شیوہ ہے، لیکن اس کے
علاوہ چند نصرانی ماسٹر رامچندر وغیرہ اسکے
نسخہ کی دستیابی کے بعد اس کی تردید کا ارادہ
دل میں رکھتے ہیں جس کی وجہ سے بہت
زیادہ احتیاط برتنا انتہائی ضروری ہے .

اصلاحش لغایت شاق بر ذات مقدس باشد
تاہم شرف اطلاع می رود کہ آنچناں اور اگم کنم کہ
مانند عنقا احدے بعدش خبر نامش نشود و
از پوستین کردن خلائق امینتی بدست آید و خدا
و رسول شاہد است کہ ہر قدر اصلاحی و تکمیلی
کہ از بندگان حضرت روخواہد داد۔ برائے
مستہام ہمال قدر چار گامہ عشرت خواہد گشت
اگرچہ جاہلاں بہت بل عالماں ایں زماں ہم
ازیں امر رنجیدہ می شوند مگر بانہ از زمرہ علما
ایں زمانم وحاشا اللہ نہ جاہل بقدر مسطور بلکہ خود را
بمنزلہ کمترین مستفیداں از مستفید آنحضرت
می دانم گو بظاہر تا الآں ازیں دولت
مشرف نگشتہ

اس ضلع میں سوائے ذات مصدر حسنات کے
دوسرا شخص ایسا نہیں ہے اس کی ذات سے
اصلاح طلب کی جائے اور اس بارے میں
استفسار کیا جائے۔ لہذا کتاب کا جس قدر
حصہ مقابلہ اور نظر ثانی ہو چکا ہے خدمت
والا میں روانہ کیا جاتا ہے بشرط فرصت اللہ
و رسول کے لئے اس کو ملاحظہ فرمائیں اور
جہاں میری کم استعدادی کی وجہ سے کوئی خطا
سرزد ہوگئی ہو اصلاح فرماویں اور اگر میری
بدبختی سے سب قابل محو ہو اور موافق لن یصلح
العطار ما افسد الدہر کے اس کی اصلاح ذات
مقدس کے لئے انتہائی دشوار ہو تب بھی مجھے
اطلاع سے مشرف فرماویں تاکہ پھر اس کو
ایسی طرح غائب کردوں کہ عنقا کی طرح کوئی
اسکے بعد اس کے نام کے علاوہ نہ سنے اور
مخلوق کی چیرہ دستی سے نجات ملے اور خدا
اور رسول گواہ ہے کہ جس قدر بھی اصلاح
اور ترمیم حضرت عالی کی جانب سے صادر ہوگی
مجھ پریشان حال مشتاق کے لئے وہی سامان
نشاط و عشرت ہوگی اگرچہ جہلا محض بلکہ اس
زمانہ کے علما بھی اس بات سے رنجیدہ خاطر

ہوں مگر میرے مکرم نہ میں اس زمانہ کے گروہ
علمار میں ہوں اور بحمد اللہ نہ جاہل محض ہوں
بلکہ اپنے کو آنحضرت کے شاگردوں میں سے
ادنیٰ شاگردگی برابر جانتا ہوں - اگرچہ بظاہر
اب تک اس دولت سے مشرف نہیں
ہوا ہوں ۔

ازالۃ الاوہام ۵۶۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ بکم رمضان ۱۲۶۹ھ میں سید المطابع ، دارالسلطنت شاہجہاں آباد (دہلی) کوچہ بلاقی بیگم میں سید قوام الدین کے اہتمام طبع ہوئی ۔ اس کے حاشیہ پر کتاب استفسار مصنفہ مولانا آل حسن موہانی چھپی ہے[1] ۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے ۔

" یہ کتاب میں نے پہلے اردو میں لکھی تھی لیکن اہل اسلام کے اہل علم فارسی زبان سے زیادہ رغبت رکھتے تھے ۔ اس لئے مجبوراً ان کے اصرار پر اس کو فارسی زبان میں تبدیل کیا ۔"

اس کتاب میں پادری فنڈر کے "میزان الحق" کے اعتراضات کے دندان شکن جوابات ہیں اور رد نصاریٰ کے اکثر مباحث کا مسکت جواب بھی ہے ۔

اس کتاب کے بارے میں مولانا محمد علی مونگیری تحریر فرماتے ہیں ۔

" باوجودیکہ اس کو چھپے ہوئے سینتیس برس ہو چکے مگر کسی نے ایک مبحث کا بھی پورے طور پر جواب نہیں دیا ۔"

[1] پیغام محمدی ص ۳۰

تاریخی مناظرہ

ہندوستان میں پادریوں کی یک طرفہ کوشش اور بے پناہ تبلیغی جدوجہد اور خاص طور پر علماء کرام اور اہل علم کی خاموشی سے مشنریوں کے کام کا تقریباً ہر ہندوستانی پر اور خاص طور پر جہلاء کے طبقہ پر کافی اثر ہونے لگا تھا۔ پادری علماء کی خاموشی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ اور عوام میں پروپیگنڈہ کرتے پھرتے تھے کہ ہمارے مذہب کی حقانیت کا رعب اور اثر اتنا ہے کہ ہندوستانی عالم ہمارے اعتراضوں کا جواب۔ اور اپنے مذہب کی صداقت ثابت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مولوی محمد سعید صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ لکھتے ہیں۔

"یہ وہ وقت تھا جبکہ ہندوستان میں اسلامی شان و شوکت و سلطنت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور شاہان مغلیہ کی آخری یادگار بہادر شاہ مرحوم زوال سلطنت کا پرحسرت منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جمنا کے پرسکون بہاؤ میں انقلاب زمانہ کی نیرنگیوں کو بہتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ مگر اغیار کی ان ریشہ دوانیوں کی کوئی تدبیر ان کے پاس نہ تھی اور انگریزی رسوخ و اقتدار کا سیلاب قلعہ کی سنگین دیواروں سے ٹکرا رہا تھا جس کی پرآشوب آواز سے بادشاہ مرحوم خوفزدہ تھے۔ اس پرآشوب زمانہ میں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر عصر و مغرب کے درمیان ایک مسیحی فاضل پادری

فانڈر عوام الناس کے سامنے عیسائی مذہب کی خوبیوں اور بزعم خود اسلامی کمزوریوں پر تقریر کیا کرتا تھا۔ پادری فاؤنڈر خود تنہا نہ تھا بلکہ انگلینڈ سے اس کے ساتھ مسیحی مشنری اور پادریوں کی ایک بڑی جماعت تھی جو اس امر کا بیڑا اٹھا کر ہندوستان آئی تھی کہ مسیحیت کی تبلیغ واشاعت ہندوستان میں اس طرح کرے کہ اسلامی سلطنت کے زوال اور مغلوبی کے ساتھ اسلام بھی مغلوب ہو۔ اور عیسائیوں کے غلبے اور اقتدار کے ہمدوش عیسائی مذہب بھی ہندوستان کی نرم واثر پذیر زمین میں جڑیں چھوڑ دے۔ گو اسلامی حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا مگر اس سیاسی اضمحلال کے باوجود زوال رسیدہ دہلی باکمال مشاہیر اور اہل علم اور اہل فن سے خالی نہ تھی لیکن اس دور کے علماء کو اگرچہ اپنی دینی و مذہبی علوم میں کامل دستگاہ و تبحر تھا مگر دوسرے مذاہب کی مذہبی کتابوں پر نہ ان کی نظر تھی اور نہ ان کو اس کی چنداں ضرورت۔ معلوم نہیں کن وجوہ سے اس مسیحی فاضل کی طرف علماء نے توجہ نہیں کی اور علماء اسلام کے اس سکوت نے پادری فاؤنڈر کے حوصلے اس قدر بڑھائے کہ اس نے جسارت و دلیری کے ساتھ صداقت وحقانیت اسلام پر زبردست حملے اور اعتراض شروع کردیئے اور ببانگ دہل علماء اسلام کو مناظرہ کی دعوت دی۔ (ندائے عام ۱۳۵۴ھ)

انہی ایام میں مولانا رحمت اللہ صاحب دہلی میں ازالۃ الاوہام کی طباعت کے لئے پہنچے۔ اس وقت آپ کی ڈاکٹر وزیر خاں سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر خاں نے آپ کو آگرے مدعو کیا۔ آپ آگرے پہنچے اور سرائے جھلی میں مقیم ہوئے آگرے میں پادری فاؤنڈر بھی رہتے تھے۔ انہوں نے شہر والوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ علی الاعلان کہتے پھرتے تھے کہ کوئی ہماری میزان الحق کا جواب دے اور ہم نے جو اسلام پر اعتراضات کئے ہیں

اس کا رد کرے۔

جب شہر میں مولانا صاحب کی آمد کی اطلاع ہوئی تو شہر کے اکثر وکلاء اور رئیس آپ سے ملاقات کرنے کے لئے آئے۔ انہوں نے آپ سے التجا کی کہ آپ پادریوں سے مقابلہ کریں۔ مولانا صاحب کی بھی پرانی خواہش تھی لیکن اجنبی شہر ہونے کی وجہ سے مولانا صاحب نے غریب الوطنی کا اظہار کیا۔ جس پر ان لوگوں نے آپ سے مکمل تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ اور ڈاکٹر وزیر خاں نے بھی مناظرہ کی تیاری کرنے کی آمادگی کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر وزیر خاں انگریزی زبان سے بہت اچھی واقفیت رکھتے تھے اور جب یہ ڈاکٹری کی ڈگری انگلینڈ لینے گئے تھے اس وقت وہاں سے نصرانیوں کی کتابیں لائے تھے۔ ان کو نصاریٰ کے انگریزی لٹریچر سے کافی واقفیت تھی۔ چنانچہ آپ نے مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مناظرہ کی تیاری شروع کر دی اور فیصلہ کیا کہ عیسائیوں سے مناظرہ کیا جائے۔

چھوٹا مناظرہ اکبر آباد

مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں نے دو مناظرہ ۱۸۵۴ء میں کئے۔ پہلا مناظرہ جس کو مولانا رحمت اللہ صاحب نے چھوٹا مناظرہ لکھا ہے وہ ربیع الآخر ۱۲۷۰ھ میں پادری فرنچ کے بنگلہ میں پادری فرنچ اور پادری کئی سے مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر محمد وزیر خانصاحب کا ہوا۔ اس چھوٹے مناظرہ کے بارے میں" پہلا مباحثہ مذہبی کے، ۲۹ صفحہ کے حاشیہ پر یہ عبارت تحریر ہے۔

"جاننا چاہیئے کہ گفتگوئے سابق سے وہ گفتگو مراد ہے جو پادری فرنچ صاحب کے بنگلہ پر پادری صاحب موصوف اور پادری کئی اور مولوی رحمت اللہ صاحب کے ساتھ میرے اور جناب محمد وزیر خاں صاحب کے سامنے ہوئی تھی اور میں نے اس گفتگو کا ایک جدا رسالہ چھپوایا ہے"

اس چھوٹے مناظرہ کا مطبوعہ رسالہ ناپید ہو گیا ہے جو کہیں بھی نظر نہیں آتا اور

اگر مناظرہ کا ذکر مذکورہ کتاب کے حاشیہ پر نہ ہوتا اور مولانا رحمت اللہ صاحب ازالۃ الشکوک جلد دوم میں اس مناظرہ کی کارروائی نہ چھاپتے تو اس کا نام بھی باقی نہ رہتا۔ چونکہ اس چھوٹے مناظرہ کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ہے اس لئے اس کے ضروری اقتباس نقل کئے جاتے ہیں۔

"دونوں پادری صاحبان یہ جانتے تھے کہ کوئی ہم میں سے انگریزی زبان نہیں سمجھتا، اس وجہ سے پادری کئی صاحب نے پادری فرنچ صاحب کو انگریزی میں کہا۔ اس امر میں ان کو مدعی رکھیو اور تم معترض بنو اور تحریف کا ثبوت ان سے طلب کرو۔ ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب نے کہا۔ کوئی قاعدہ مقرر کیا جائے تاکہ اسکو دونوں فریق تسلیم کرلیں اور اسی کے مطابق تحریف کا ثبوت پیش کیا جاتے۔ پادری صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر یہی کہا کہ تحریف ممکن نہیں تھی۔ کیونکہ توریت کا نسخہ موسیٰ کا لکھا ہوا بخت نصر کے عہد تک محفوظ تھا اور بڑی احتیاط کے ساتھ صندوق میں رکھا گیا تھا۔ جو بھی بادشاہ تخت نشین ہوتا وہ اس کو اپنا دستور العمل ٹھیراتا تھا۔ ایسی حالت میں تحریف کیونکر ہوتی۔ میں نے کہا۔ وہ کونسے صندوق میں تھا کیا اسی صندوق میں تھا جس میں دو لوحیں رکھی ہوئی تھیں۔ پادری نے کہا ہاں! میں نے کہا۔ اس میں تو حضرت سلیمان کے عہد میں بھی نہ تھا۔ اس پر سن کر دونوں صاحبوں نے تعجب کے طور پر دریافت کیا کہ کس دلیل سے کہتے ہو۔ میں نے کہا۔ کتاب اول سلاطین کے اٹھویں باب میں ہے۔ بولے کس جگہ۔ میں نے کہا۔ اس باب کا ۹ درس نکال کر دکھلایا۔ جس کی عبارت یہ ہے۔

"اور صندوق شہادت کے اندر ان دو لوحوں کے سوا کچھ نہ تھا جنہیں موسیٰ نے دریب پر اس میں رکھا۔ الخ

اس عبارت کو پڑھ دونوں پادری خاموش ہو گئے۔ پھر فرنچ صاحب نے کہا کہ خیر یہ ایک ہلکی سی بات ہے اور اس سے تحریف ثابت نہیں ہوتی۔ میں نے کہا میں نے بھی اس کو اثبات تحریف کے لئے پیش نہیں کیا۔ بلکہ آپ کے کہنے پر یہ عبارت پڑھی تھی کہ

وہ نسخہ موسیٰ والا بخت نصر کے عہد تک تھا تحریف کی دلیلیں تو اور ہیں۔

پادری فرنچ نے کہا۔ سلیمان کے باپ داؤد نے گواہی دی ہے کہ ان کے پاس خدا کا کلام تھا اور اس کو پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کس جگہ ان کے کلام میں ہے کہ یہ سارا مجموعہ توریت کا جواب پایا جاتا ہے۔ ان کے پاس تھا۔ ہم تو اس مجموعہ کے متعلق کلام کرتے ہیں اور کہتے ہیں اولاً عہد عتیق اور جدید کی کتابوں کی سند متصل نہیں ملتی۔ ثانیاً الحاق بھی ان میں یقیناً ہوا ہے۔ ثالثاً ان میں غلط روایات بھی ہیں اور اکثر روایات مختلف بھی پائی جاتی ہیں۔ مثل روایات اعداد کے۔ پادری صاحب نے کہا۔ ان کی سند کتب اسناد میں لکھی ہوئی ہے۔ میں نے کہا زیادہ تو نہیں آپ اس وقت مجھ کو کتاب ایوب اور کتاب نشید الانشاد کی سند دکھلائیے۔ اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹال مٹول کی اور عہد جدید کا ذکر کرنے لگے اور کہا برابر مشائخ کے کلام سے اس کی سند ملتی ہے۔ میں نے کہا "یوسی بیئس" اپنی تاریخ کلیسا میں لکھتا ہے کہ نامہ یعقوب، نامہ یہود، نامہ پطرس دوم نامہ دوم سوم یوحنا اور مشاہدات پر قدما کو گفتگو تھی اور بعضوں نے "سرن تھیس" ملحد کی تصنیف بتلایا ہے۔

پادری صاحب نے کہا کہ تاریخ یوسی بیئس کو جانے دیجیے اور مشاہدات کی سند لاتے۔ دونوں پادری آپس میں انگریزی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔ اس کے بعد بولے سب کلیسا نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر خان صاحب نے کہا۔ کلیسا آپ کے نزدیک کس چیز سے عبارت ہے اگر تمام قدما عیسائیوں سے ہے تو غلط ہے اور اگر کونسل کار تھیج سے ہے تو تسلیم ہے مگر وہ اس کو الہامی کتاب نہیں مانتے تھے اور قطع نظر اس سے کونسل والوں نے تو کتاب جوڈتھ، کتاب وزڈم اور مقابیس کی دونوں کتابوں کو اور کتاب ٹوبیاس اور کتاب ایکلیزیاسٹیکس اور کتاب باروق کو بھی الہامی مانا تھا اور تم ان کو الہامی نہیں مانتے۔ پادری صاحب نے کہا کہ اس کونسل سے آگے نسل نائس

میں بھی اس کو الہامی مانا گیا تھا۔

ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے کہا کونسلِ نائس میں اس کا ذکر بھی نہیں آیا تھا۔ بلکہ اس کے بارے میں تین قول ہیں۔ صاحب اکیسہومو لکھتا ہے کہ کونسل والے سب جھوٹی اور سچی کتابیں ایک مذبح پر رکھ کر نماز اور دعا میں مشغول ہوئے کہ جو سچی ہیں مذبح پر رہ جاویں اور جھوٹی گر جائیں سو جو رہ گئیں سچی اور جو گر پڑیں جھوٹی مانی گئیں اور تمہارے علماء نے مثل لارڈنر کے نے لکھا ہے کہ اس کونسل میں ان کتابوں کا ذکر نہیں آیا اور جو تھیوڈ ورٹ کی قول کی سند لاتے ہیں کہ کتابیں میز پر لا کر رکھی گئی تھیں اس کی کوئی سند نہیں۔ اور رومن کیتھولک کہتے ہیں کہ اس کونسل میں کتاب جوڈتھ الہامی ٹھہرائی گئی تھی۔ آپ ان تینوں قولوں میں کس کو مانتے ہیں۔ اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ یہ بولے ہم دکھلاتے ہیں اور دونوں صاحب اٹھے اور کتاب ڈھونڈنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا اگر تکلیف ہو تو جانے دیجئے پھر بیٹھ گئے۔ کہا نہیں ہم ابھی دکھا دیتے ہیں۔ کئی صاحب تلاش کے بعد ہیلی کی کتاب لائے۔ مگر کونسل نائس کی جگہ کونسل لوڈیسیا کا حال نکال کر پیش کیا اور تماشا یہ ہے کہ اس میں لکھا تھا کہ اس کونسل میں مشاہدات خارج رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا یہ تو ہمارا عین قول ہے۔ اس پر شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئے۔ پھر کہا اور مشائخ کے کلام میں اس کی سند پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا پہلے کس نے لکھا ہے۔ پادری صاحب نے کسی صاحب سے انگریزی میں دریافت کیا۔ اور کلیمنٹ کا نام لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ لارڈنر کے لکھنے کے مطابق کلیمنٹ کی ایک چٹھی پائی جاتی ہے اور اس چٹھی میں کئی جگہ مضمون انجیل سے ملتا ہے جس کو عیسائی کہتے ہیں کہ اس نے انجیل سے ان مضمونوں کو نقل کیا ہوگا۔ اولاً ہم اسی کو نہیں مانتے کہ اس نے انجیل سے نقل کیا ہو کیونکہ اس میں صریح حوالہ نہیں۔ جائز ہے کہ وہ مضمون بطور روایات زبانی کے کلیمنٹ تک پہنچے ہوں۔ اور اگر بہ تقدیر مان لیں تو پھر اس میں انجیل کا حوالہ نہیں اور اس قدر سے اس کا تواتر لفظی ثابت نہیں

ہوتا۔ پادری نے کہا تمہارے قرآن کا کیا حال ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا قرآن کے لفظوں کا تو کیا ذکر اس کے حرکات بھی بتواتر منقول ہیں۔ دونوں پادریوں نے کہا۔ قرآن کے بارے میں ہم کلام نہیں کرتے اور سند کے متعلق کلام منقطع ہوا۔ ہارن صاحب کی تفسیر جلد دوئیم نسخہ سنہ ۱۸۲۲ء کے صفحہ ۲۹۹ میں جو عبارت درج ہے اس کو ان دونوں نے دکھایا جس کا مضمون یہ ہے کہ ان فقروں میں معلوم ہوتا ہے کہ عبری محرف ہے۔ ملاکیا کتاب کے ۳ باب کا پہلا درس، میکائی کتاب کے ۵ باب کا دوسرا درس، ۱۶ زبور کا ۸ درس سے ۱۱۔ درس تک کتاب غاموص کے ۹ باب کا ۱۱ اور ۱۲ درس۔ ۴۰ زبور کا ۶ درس سے ۸ درس تک۔ ۱۱۰ زبور کا ۴ درس، کئی صاحب نے دیکھ کر کہا ہاں ہارن لکھتا ہے عبری ان مواضع میں خراب کی گئی ہے۔ فرنچ صاحب نے کہا ہارن صاحب گو اپنے وقت میں بہت اچھے تھے۔ مگر ان کو عبری نہیں آتی اور کئی صاحب عبری خوب جانتے ہیں۔ اور ہارن صاحب کے بعد اور لوگ بھی ان سے زائد ہوئے ہیں۔ اس پر میں نے تفسیر ہنری واسکاٹ سے دو موضع کا نشان دیا کہ ان میں عبری کی تحریف کا اقرار ہے۔ فرنچ صاحب نے کہا۔ ہنری واسکاٹ گو بڑے مفسر تھے۔ مگر اب معلوم ہوا ہے کہ ان کو عبری نہیں آتی تھی میں نے کہا اگر ان مفسروں کا قول آپ کے نزدیک سند نہیں تو ان کے اقرار کے سوا اور مواضع ظاہر کرتا ہوں۔ میں نے کتاب اول اخبار الایام کے ۱۲ باب کا ۱۲ درس کو جو کتاب ۲ سموئیل کے ۲۴ باب کے ۱۳ درس کے صریح مخالف ہے پیش کیا۔ اس کو سنتے ہی کئی صاحب نے مباحثہ ختم کیا اور دعائیہ جملوں پر ختم کیا اور فرنچ صاحب سے انگریزی میں کہا۔ صاحب فرماتے ہیں۔ ہم تمہاری ملاقات سے بہت خوش ہوئے اور یہ بھی کہا کہ ہم نے توریت اور انجیل اور زبور اور قرآن کو بڑے غور سے دیکھا اور تینوں کے شروع میں خدا کی صفتیں ایک ہی طرح کی پائی جاتی ہیں مگر قرآن میں وہ بات نہیں۔ ڈاکٹر صاحب بیٹھ گئے اور فرمایا۔ قرآن کا جواب ذکر کرتے ہیں تو سنئے انجیل میں خدا کی پاکی کا وہ حال جو قرآن میں نہیں ہے یہ ہے کہ تین خدا ہیں۔ ایک آسمان پر رہا، دوسرا مریم کے رحم میں نو مہینے رہ کر مکان مخصوص سے نکلا

اور زندگی بھر کھاتا پیتا رہا اور تیسرا خدا کبوتر کی شکل میں اس دوسرے خدا پر اترا۔ اس کے بعد کئی صاحب رخصت ہو گئے۔ میرا ارادہ بھی رخصت ہونے کا تھا۔ فرنچ صاحب نے کہا ٹھہرو۔ میں آتا ہوں۔ وہ آئے تو بات چیت کے بعد مذہب کا ذکر آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سامنے سے انجیل اٹھا کر متی کی انجیل کے پہلے باب کا ۱۷ درس پیش کیا کہ اس کو دیکھئے۔ فرنچ صاحب نے دیکھ کر فرمایا۔ دین عیسوی کے منکر اسی کو بہت پیش کیا کرتے ہیں اور اس میں البتہ کچھ مشکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اس کی توجیہہ فرمائیے۔ پادری صاحب نے کہا ممکن ہے کاتب سے عدد میں غلطی ہو گئی ہو گی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اور سنئے متی عوزیادہ کو یورام کا بیٹا لکھتا ہے۔ حالانکہ تین پشتیں ان کی بیچ میں گذری ہیں ۔ا خذیاہ[۱]، بواس[۲]، امصیا[۳] اور لکھتا ہے۔ یوکینیا یوشیا کا بیٹا ہے۔ حالانکہ وہ پوتا ہے۔ مزید لکھتا ہے۔ یوکینیا کے بھائی ہیں۔ حالانکہ عہد عتیق میں اس کا ایک بھی بھائی مذکور نہیں اور تحریر کرتا ہے کہ زوربابل شلتائین کا بیٹا ہے۔ حالانکہ وہ اس کا بھتیجا ہے۔ نہ بیٹا بلکہ وہ تو خدایا کا بیٹا ہے۔ جو شلتائین کا بھائی تھا۔ پادری صاحب نے کہا کہ جائز ہے ان لوگوں نے ان کی میراث پائی ہو جن کے بیٹے لکھے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اخذیا بواس اور امصیا تینوں بادشاہ گذرے ہیں اور انہوں نے کئی کئی سال سلطنت [illegible] ہے سو یہ توجیہ اس میں جاری نہیں ہو سکتی اور جب ایک نسب نامہ میں اتنی غلطیاں ہوں ساری کتاب کو کیا قیاس کیا جاوے گا۔ شاید متی نے عہد عتیق نہ پڑھا ہو گا جو ایک نسب نامہ میں اتنی غلطیاں کر گیا۔ . . . .

جب ہم چلنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ کا نام کیا ہے۔ پادری صاحب نے کہا فرنچ۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اگر میں یہ کہوں کہ فرنچ صاحب کی عمر جو یہاں کھڑے ہیں اس وقت ۲۲ برس کی ہے اور مولوی صاحب کہیں ۴۴ برس کی ہے تو یہ دونوں باتیں کیا سچی ہوں گی یا جھوٹی۔ پادری صاحب نے کہا۔ ہم ایمان نہ

کھوئیں گے ایسی بات تو بہت مشکل ہے، ڈاکٹر صاحب نے کہا اگر ایسی بات کتاب مقدس میں نکل آئے تو آپ اس کو کیا کہئے گا۔ پادری صاحب بولے کہاں کہاں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے میری طرف اشارہ کیا۔ میں نے کتاب دوم اخبار الایام کے ۲۲ باب کے ۲ درس اور کتاب دوم سلاطین کے ۸ باب کے ۲۶ درس کی عبارت دکھائی اول میں جلوس کے وقت اخزیا کی عمر ۴۲ برس کی اور دوسری میں ۲۲ برس کی لکھی ہے۔ اس پر پادری صاحب نے انگریزی بائیبل میں دیکھا اور کہا یہ غلطی عدد میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ جب بہت سی غلطیاں اس میں ثابت ہوگئیں تو پھر کونسی دلیل ہے کہ اس ایک مقصود میں غلطی نہ ہو اور ہم نے کتب مقدسہ میں سو سے زائد غلطیاں نکال دی ہیں اور آپ سے قرآن میں پانچ جگہ بھی ایسی نہیں نکل سکتیں۔ پھر آپ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ پادری صاحب نے کہا۔ یہ بڑی بات ہے اور اسی پر گفتگو ختم ہوئی۔ چونکہ عصر کا وقت تنگ ہو گیا تھا۔ میں رخصت ہوا۔ (ازالۃ الشکوک جلد دوم ۱۴۲ تا ۱۴۷)

بڑا مناظرہ اکبر آباد

اس زبانی مناظرہ میں پادریوں کو شکست تو ہو گئی تھی اور انہوں نے اپنے طریقوں اور جوابوں سے شکست تسلیم بھی کر لی تھی۔ لیکن یہ بات گھر تک رہی۔ عوام میں نہیں پھیلی۔ عوام میں کیسے پھیلے اور وہ کیسے یقین کریں کہ پادری لوگ مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر خان کی بحث سے زچ ہو گئے تھے۔ اس لئے مولانا رحمت اللہ صاحب نے کوشش کی کہ آئندہ مناظرہ منظر عام پر پبلک میں ہو۔ تاکہ دنیا دیکھے اور سنے۔ چنانچہ مولانا صاحب ایسے مناظرہ پر آمادہ و تیار کرانے کے لئے مولوی امیر اللہ صاحب کے ہمراہ جو پادری فانڈر کے اچھے شناسائی تھے۔ پادری فانڈر کے مکان پر گئے۔ جب وہ مکان میں نہیں ملا تو آپ نے اس سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری کیا۔ چپندرہ روز تک ۲۳ مارچ سے ۸ اپریل ۱۸۵۴ء تک جاری رہا۔ اس خط و کتابت میں ہر دو فریق کے دو اشخاص یعنی عیسائیوں کی طرف سے

پادری فانڈر، پادری فرنچ، اور مسلمانوں کی جانب سے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں کے نام مناظرہ کے لئے منظور ہوئے۔ ۱۰، ۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء کی تاریخ اور وقت علی الصباح طے ہوا۔ مناظرہ کے عنوانات نسخ و تحریف، الوہیت مسیح تثلیث۔ رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور حقیقت قرآن مجید مقرر ہوئے۔ اجلاس کے چیرمین کی تجویز پادری فانڈر نے رکھی جس پر مولانا رحمت اللہ صاحب نے یہ اعتراض فرمایا اگر عیسائی چیرمین ہوگا تو مسلمان شک کریں گے۔ اگر مسلمان چیرمین مقرر ہوا تو عیسائیوں کو شبہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اس لئے چیرمین مقرر نہ ہو تو بہتر ہے۔ اس اعتراض کو پادری فانڈر نے تسلیم کیا۔

یہ خط و کتابت جاری تھی کہ مشنریوں میں اس مناظرہ کے ہونے سے کھلبلی مچ گئی تھی۔ مناظرہ کے اسباب کیا تھے اور مناظرہ سے قبل عیسائیوں کو اپنی کتاب میزان الحق پر کیسا گھمنڈ تھا اور اس وقت کے مسلمانوں کے خیالات کی پستی اور عیسائیوں سے مرعوبیت کی کیا حالت تھی۔ اس کا نقشہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے ازالۃ الشکوک میں کھینچا ہے۔

"اب ان وجوہات کا بیان کرتا ہوں کہ جس کے سبب یہ مباحثہ واقع ہوا۔

اول یہ کہ روز بروز شور و غل پادریوں کا بڑھتا چلا جاتا تھا اور زبانی فریاد کرتے تھے کہ مسلمانوں سے ہمارا جواب نہیں بن پڑتا اور اپنے رسالوں کے آخر میں ایسی ایسی باتیں بھی چھاپنے لگے تھے۔ اس پر میں نے چاہا کہ اپنے مقدور کے موافق میں بھی ہاتھ ہلاؤں۔ شاید اللہ کچھ ثمرہ نیک دیوے۔"

"دوم یہ کہ جس عیسائی سے ملاقات ہوئی اور اس سے کچھ تذکرہ آیا اس کی تقریر سے یہی معلوم ہوا کہ میزان ان کے گمان میں ایسی ہے کہ گویا الہام سے لکھی گئی ہے اور مسلمان اس کے جواب سے عاجز ہیں اور

اگران کو کہا جاتا کہ یہ بات غلط ہے۔ میزان الحق کا کیا ذکر اس کے مصنف سے بھی مسلمانوں کو کچھ خوف نہیں۔ سو وہ کہتے تھے کہ جب تم کو اس سے پالا پڑے، تب تم جانو۔"

"سوئم۔ یہ کہ جب میں ایک تقریب سے اکبر آباد کا اول اول عازم ہوا تو چلتے وقت ماسٹر رامچندر صاحب کے کہ مجھ سے محبت رکھتے تھے اور کچھ عرصہ سے عیسائیت کا دم بھر کے پادریوں سے بھی زائد تعصب میں قدم بڑھا بڑھا کر رکھتے تھے۔ اور میزان الحق کے بڑے معتقد تھے۔ کہا اگر اتفاق ہو تو آپ پادری فانڈر صاحب سے ملئے گا۔ سوان کی تقریر سے بھی وہی بات سمجھی گئی۔ شاید انہیں یہ بھی گمان ہو کہ پادری صاحب سے کچھ اس کو بھی ہدایت ہو جائے گی۔"

"چہارم۔ یہ کہ جب میں اکبر آباد پہنچا تو بعض بعض کو مذبذب پایا۔ اگر ان کو سمجھایا گیا تو انہوں نے یہی کہا۔ اگر تمہارے پاس ہوتے ہیں تو تم ہم کو قائل معقول کر دیتے ہو۔ اور اگر کسی اچھے پادری کے پاس جاتے ہیں تو وہ بھی ہم کو لاجواب کر دیتا ہے تو اب ہم کس طرح سمجھیں کہ تم ہی حق پر ہو اور وہ باطل پر یا بالعکس۔ بلکہ ہم تو حیرت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہاں اگر مقابلہ منہ در منہ ہو جائے تو ہماری یہ حیرانی کچھ رفع ہو جائے۔"[1]

اس مناظرہ سے قبل جو زبانی چھوٹا سا مناظرہ ہوا تھا۔ اس سے مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں صاحب کی عیسائیوں میں دھاک بیٹھ گئی تھی اور اس سے یہ لوگ بہت متاثر و خوف زدہ ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے تقریری مناظرہ کی تیاری

---

[1] ازالۃ الشکوک جلد دوئم ص ۴۹۲

بڑے زور شور سے کی اور اس کو کامیاب کرنے کے لئے تمام ذرائع استعمال کئے جن کا ذکر مولانا رحمت اللہ صاحب نے ازالۃ الشکوک کے متن اور حاشیہ پر کیا ہے

متن کی عبارت یہ ہے۔

"اول خط کی تحریر کے دن سے مباحثہ کے جلسے اول کے دن تک ۱۸ دن کی مدت گذر گئی اور جو وہ مسائل جن میں بحث ہونے والی تھی پہلے ہی دن پادری صاحب کو معلوم ہو گئے تھے اور پہلے مباحثہ چھوٹے کا نسخہ چھپا ہوا بھی پادری صاحب کی نظر سے گذر گیا تھا اور اس سے اور اسی طرح اپنے تحریک سے ان کو نسخ اور تحریف کے مقدمہ میں ہماری اکثر باتیں معلوم بھی ہو گئی تھیں۔ سو انہوں نے اٹھارہ دن کی مدت میں اکبرآباد کے سب پادریوں اور اہل علم اپنے ہم مذہب کے اتفاق سے اپنے نزدیک خوب ہی اس امر کو منقح کر لیا تھا اور جوڑ توڑ کرنا تھا سو سب کر رکھا تھا"۔[1]

حاشیہ پر مولانا رحمت اللہ صاحب نے پادری فانڈر کے ایک ملازم کی گفتگو جو پادری صاحب اور ان کے ساتھی مناظرہ کی تیاری کے سلسلہ میں کر رہے تھے دہرائی۔

"ایک مسلمان پادری صاحب کا نوکر تھا۔ وہ ہر روز مجھ سے آکر اطلاع دیتا تھا۔ رات دن پادری صاحب کی کوٹھی پہ پادریوں کا مجمع رہتا ہے اور یہ صورت رہتی ہے کہ اگر ایک گیا۔ دوسرا آیا اور کتابوں کو بہت دیکھتے ہیں اور آپس میں گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ لیکن جو انگریزی میں ہوتی ہے سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر اس بات سے اکثر اس میں لفظ محمدیوں کا یا محمدؐ یا تمہارا نام سنتے ہیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً اسی بات کا چرچا

[1] ازالۃ الشکوک جلد دوم صفحہ ۴۴۶

ہے اور کہتا تھا کہ پادری صاحب کی میم بھی اکثر مجھ سے پوچھا کرتی ہے کہ تم کو معلوم ہے کہ یہ مولوی کہاں سے آیا ہے کہ پادری صاحب کو بڑا فکر ہے اور بڑی محنت میں پڑ گئے ہیں اور رات دن یہی مشورہ اور کانسل ہے اور اسی نیت سے انہوں نے حکام کو اس مجلس میں شریک کیا تھا کہ ان کا رعب ہے ۔"

پہلے روز کے مناظرہ کی کارروائی

علی الصباح پیر کے روز ۱۱ر اپریل ۱۸۵۴ء مطابق ۱۱ر رجب ۱۲۷۰ھ کو مناظرہ کا پہلا اجلاس شروع ہوا ۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھی ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور پادری کے ساتھی فرنچ صاحب تھے ۔ دوران جلسہ مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی کرسچین سکرٹری صدر بورڈ مسٹر ولیم مجسٹریٹ علاقہ فوج مسٹر لیدلی، پادری ولیم گلبن صاحب، مفتی حافظ ریاض الدین صاحب، مولوی محمد عبد الشہید کولوی ، مولوی فیض احمد صاحب سر رشتہ دار صدر بورڈ جناب مولوی حضور احمد، مولوی امیر اللہ صاحب مختار راجہ صاحب بنارس جناب سید حافظ فضل حسین صاحب، مولوی قمر الاسلام امام جامع مسجد اکبر آباد ۔ حافظ ولی حسن صاحب، محمد امجد علی وکیل سرکار ۔ جناب منشی خادم علی مہتمم مطبع الاخبار، سراج الحق صاحب محمد جعفر قادری صاحب تشریف فرما ہوئے ۔

پہلے پادری فانڈر اٹھا ۔ اس نے کہا کہ یہ جاننا ضروری ہے کہ مناظرہ کیونکر منعقد ہوا ۔ یہ مولانا رحمت اللہ صاحب کی سعی وکوشش اور خواہش کا نتیجہ ہے ۔ میرے نزدیک اس سے فائدہ کی صورت نظر نہیں آتی ۔ اگرچہ میری تمنا یہی ہے کہ دین عیسوی کی حقیقت اہل اسلام کے سامنے رکھوں ۔ مباحثہ کے عنوان نسخ تحریف، الوہیت حیات مسیح وتثلیث اور رسالت محمد طے ہوتے ہیں ۔ اس تشریح کے بعد

پادری فانڈر بیٹھ گئے

بحث نسخ

مولانا رحمت اللہ صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے میزان الحق کی فصل سوم باب اول کی عبارت جو صفحہ ۱۴۳ میں ہے۔ پڑھی۔ قرآن اور اس کے مفسر دعویٰ کرتے ہیں کہ جس طرح زبور کے آنے سے توریت اور انجیل کے نازل ہونے سے زبور منسوخ ہوئی۔ اسی طرح انجیل بھی قرآن کے نزول ہونے سے منسوخ ہو گئی۔

مولانا صاحب نے مزید فرمایا کہ قرآن مجید اور مفسرین سے جو یہ دعویٰ منسوب کیا گیا ہے غلط ہے۔ قرآن مجید میں اور نہ تفسیروں میں ایسا کوئی ذکر ہے۔ بلکہ اس کے برعکس سورہ بقر کی ۸۱ آیت وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ الآیۃ کی تفسیر کے نیچے فتح العزیز میں اس طرح مرقوم ہے:۔

"اور حضرت موسیٰ کے بعد یکے بعد دیگرے ہم نے اور رسولوں کو بھیجا۔ جو حضرت یوشع، حضرت الیاس، حضرت یسع، حضرت شموئیل، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت شعیا، حضرت ارمیا، حضرت یونس، حضرت عزیر، حضرت حزقیل، حضرت ذکریا اور حضرت یحییٰ وغیرہ چار ہزار آدمی تھے اور یہ سب موسیٰ کی شریعت پر گذرے ہیں اور ان کے بھیجنے کا مقصد موسیٰ کی شریعت کے احکام جاری کرانا تھا جس میں بنی اسرائیل کی سستی اور کاہلی کی وجہ سے مندرس اور علماء بد تحریفوں کی وجہ سے متغیر ہو چلے تھے"۔

سورۂ نساء کی ۱۶۱ آیت وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا کی شرح تفسیر حسینی میں اس طرح کی گئی ہے۔

"ہم نے داؤد کو کتاب دی جس کا نام زبور رکھا۔ وہ کتاب جو جناب الٰہی کی حمد و ثنا پر مشتمل اور امر و نواہی سے خالی تھی بلکہ داؤد کی شریعت وہی توریت کی شریعت تھی"۔ انتہی

اسی طرح مسلمانوں کی دوسری کتابوں میں بصراحت لکھا ہے۔ پادری فانڈر نے

کہا تم انجیل کو منسوخ سمجھتے ہو یا نہیں ۔مولانا صاحب نے فرمایا بلاشبہ ہم انجیل کو ان معنوں سے جن کا اظہار کیا جاوے گا منسوخ جانتے ہیں مگر آپ کا یہ دعویٰ دونوں جگہ غلط ہے ۔پادری نے کہا۔میں نے یہ بات مسلمانوں سے سنی ہے ۔مولوی صاحب نے فرمایا۔یہ انصاف کے خلاف ہے کہ کسی مسلمان کی سنی ہوئی بات قرآن مجید اور مفسرین کے ذمہ ڈالدیں۔پادری صاحب نے کہا خیر! اس کے بعد مولانا صاحب نے کہا۔نسخ کے وہ معنی جو اسلامی اصلاح میں رائج ہیں اور اس کے محل کو (یعنی اس بات کو کہ نسخ کہاں کہاں واقع ہوتا ہے) آپ نے اسلامی کتاب دیکھی ہے یا نہیں ۔ پادری نے کہا ۔آپ فرمائیے ۔مولانا صاحب نے کہا۔میرے نزدیک نسخ صرف اوامر و نواہی کے لئے ہے ۔چنانچہ تفسیر معالم التنزیل میں ہے ۔والنسخ انما یعترض علی الاوامر والنواھی دون الاخبار جس کا حاصل یہ ہے کہ نسخ قصص واخبار میں نہیں ہوتا بلکہ صرف اوامر اور نواہی میں آیا کرتا ہے سو ہم لوگ خبروں اور قصوں میں ہرگز نسخ کے قائل نہیں ہیں اور نہ امور عقلیہ قطعیہ میں جیسا یہ کہ خدا موجود ہے نسخ جائز جانتے ہیں۔

مولانا صاحب نے عالمانہ و فاضلانہ طریقہ سے نسخ کی تشریح تمثیلات کے ساتھ پیش کی پادری غور سے سنتا رہا۔آپ نے اچھی طرح ذہن نشین کرادیا۔تو پادری صاحب نے کہا۔آپ کے نزدیک تمام انجیل منسوخ ہے ۔مولانا نے فرمایا ذیل کے حکم کی موجودگی میں تمام انجیل کو منسوخ نہیں کہہ سکتا۔کیونکہ مرقس کے ۱۲ باب کے ۳۰، ۳۱ درس یہ ہے" اور تو خداوند کو جو تیرا خدا ہے اپنے سارے دل سے اور اپنی ساری جان سے اور اپنی ساری عقل سے اور اپنے سارے زور سے پیار کر اول حکم یہی ہے اور دوسرا جو اس کی مانند ہے یہ ہے کہ تو اپنے پڑوسی کو اپنے برابر پیار کر ان سے بڑا اور کوئی حکم نہیں ہے"۔ پادری صاحب بولے کہ انجیل ہرگز منسوخ نہیں ہو سکتی کیونکہ لوقا کے اکتیسویں باب کی ۳۳ آیت میں مسیح کا یہ قول ہے کہ آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن میری باتیں نہ ٹلیں گی"۔ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے فرمایا۔ یہ حکم عام نہیں ہے بلکہ پیشگوئی کے بارے میں ہے جسکا ذکر سابقہ آیت میں جناب مسیح نے فرمایا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر بالفرض آسمان و زمین ضائع ہو جائیں پر میری باتیں اس پیشگوئی کی بابت ہرگز زائل نہ ہونگی۔ پادری صاحب نے فرمایا۔ نہیں عام ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے ڈوالی اور رچرڈ مینٹ کی تفسیر کی وہ عبارت جو متی کے ۲۴ باب کے ۳۵ درس کی شرح کے ذیل میں لکھی ہے۔ دکھلائی کیونکہ درس مذکور لوقا کے ۲۱ باب کے ۳۳ درس کے مطابق ہے۔ اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔

بشپ پیرس کہتا ہے کہ اس کی مراد یہ ہے کہ میری یہ پیشگوئیاں یقیناً پوری ہوں گی اور ڈین اسٹاین ہوپ یہ کہتا ہے کہ اگرچہ آسمان اور زمین اور سب چیزوں کی نسبت تبدیل کے قائل نہیں ہیں تو یہ ایسی استوار نہیں ہیں جیسی میری پیشگوئیاں، ان چیزوں کی بابت استوار ہیں وہ سب مٹ جائیں گی۔ پر میری باتیں ان پیشین گوئیوں کی بابت ہرگز نہ بدلیں گی اور جو بات کہ اب میں نے بیان کی ہے اس کا ایک گوشہ مطلب سے متجاوز نہ ہوگا۔

پادری صاحب نے کہا کہ ان مفسرین کی تحریریں میرے دعوے کے خلاف نہیں ہیں۔ کیونکہ مفسر یہ نہیں کہتے کہ یہ پیشین گوئیاں زائل نہیں ہوں گی اور باقی اور سب زائل ہو جائیگا ڈاکٹر وزیر خاں نے جواب دیا کہ یہاں اس بات کا لکھنا درس سے کیا علاقہ رکھتا تھا۔ جو مفسر اس کی تصریح کرتا پادری صاحب یہی کہتے رہے کہ یہ عام ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ہم اپنے دعوے کے ساتھ گواہ پیش کر رہے ہیں اور آپ بغیر گواہ کے مدعی ہیں۔ پادری صاحب نے اس کا بھی جواب نہیں دیا بلکہ فرمایا کہ پطرس کے پہلے خط کی ۲۳ فصل میں لکھا ہے

"تم نہ تخم فانی سے بلکہ اس سے جو غیر فانی ہے یعنی خدا کے کلام سے جو ہمیشہ زندہ اور باقی ہے سرنو پیدا ہوئے"

اس آیت کے مطابق خدا کا کلام دائمی ہے منسوخ نہیں ہوتا۔ مولانا نے فرمایا ایسی ہی کچھ اشعیا کے ۴۰ باب کے ۸ درس میں بھی ہے اور آپ نے اس کو بھی میزان الحق میں

جناب پطرس کی عبارت کے ساتھ نقل کیا ہے ۔ اس کی عبارت یہ ہے ۔

"گھانس پژمردہ اور پھول افسردہ ہو سکتا ہے ۔ لیکن ہمارے خدا کا کلام
ابد تک قائم ہے ۔"

اس آیت کے بعد آپ پر لازم ہو جاتا ہے کہ کسی بھی امر و نہی کو منسوخ نہ سمجھیں ۔
حالانکہ توریت کے سینکڑوں حکم عیسائی مذہب میں منسوخ ہو گئے ہیں ۔ پادری نے کہا توریت
تو منسوخ ہے لیکن ہم توریت کے بارے میں اس وقت بحث نہیں کر رہے ہیں ۔ مولانا نے
فرمایا کہ متی کے پانچویں باب اٹھارویں ورس میں اس قول کے مطابق جناب مسیح نے
توریت کے حق میں یہی فرمایا ہے ۔

"کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین نہ ٹل جائے
ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت کا ہرگز نہ مٹے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو۔"

اس کے باوجود توریت کے احکام منسوخ ہو گئے ۔ پادری صاحب نے کہا اب
میری بحث توریت کے بارے میں نہیں ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کیوں آپ کی بحث
کا تعلق توریت سے نہیں حالانکہ ہم توریت و انجیل کو ایک سمجھتے ہیں اور جناب کے میزان الحق
کے فصل دوئم میں اس طرح لکھا ہے کہ

"انجیل و عہد عتیق کی کتابیں کسی وقت بھی منسوخ نہیں ہوئی ہیں ۔"

پادری صاحب نے کہا ہاں اس جگہ تو میں نے لکھا ہے ۔ مگر اس وقت ہماری
بحث صرف انجیل پر ہے ۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ۔ حواریوں کے عہد میں احکام توریت کے منسوخ ہونے کے
بعد چار چیزوں کو حرام کیا تھا ۔ بتوں کی قربانیاں[۱] ، اور خون[۲] ، جانوروں[۳] کا گلا گھونٹنا اور
زنا[۴] ۔ اور اب زنا کے سوا ان چیزوں کی حرمت بھی باقی نہیں رہی ۔ بس انجیل بھی منسوخ ہوا ہے ۔
پادری صاحب نے کہا ان چیزوں کی حرمت ہمارے علماء میں مختلف فیہ ہے بعض عالم

ان چیزوں کی حرمت کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں اور بعض نہیں اور ہم ہنوں کی قربانیوں کو اب تک حرام جانتے ہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔ پولوس مقدس رومیوں کے ۱۴ باب کے ۱۴ ورس میں یوں فرماتے ہیں۔

"مجھے خداوند یسوع سے معلوم ہوا۔ میں نے یقین جانا کہ کوئی چیز آپ ناپاک نہیں۔ لیکن جو اس کو ناپاک جانتا ہو، اس کے لئے ناپاک ہے۔"

پھر طیطس کے ۱ باب کے ۱۵ ورس میں لکھا ہے۔ پاک لوگوں کے لئے سب کچھ پاک ہے۔ پر ناپاک اور بے ایمانوں کے لئے کچھ پاک نہیں۔ اور ان سب باتوں سے ان چیزوں کا حلال ہونا معلوم ہوتا ہے۔ پادری صاحب بولے کہ انہیں آیات کی وجہ سے بعض علماء ان اشیاء کے حلال ہونے کا فتوی دیتے ہیں۔ مولانا صاحب نے کہا۔ جناب مسیح کا حکم اوّل متی کے ۱۰ باب کے ۵۔ ۶ ورس میں حواریوں کی بابت یوں ہے۔ ان بارہ کو یسوع نے یہ فرما کر بھیجا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں نہ جانا بلکہ پہلے اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ۔ اور پھر ان لوگوں کے حق میں مرقس کے ۱۶ باب کے ۱۵ ورس میں یہ حکم لکھا ہے کہ تمام دنیا میں جا کر ہر ایک مخلوق کے سامنے انجیل کی منادی کرو۔

گویا دوئم حکم نے اول کو ناسخ قرار دیا۔ پادری صاحب نے فرمایا کہ خود مسیح نے حکم اول کو منسوخ فرمایا۔ مولانا صاحب نے فرمایا یہ صحیح ہے کہ مسیح نے موقوف کیا۔ مگر یہ تو ثابت ہوا کہ نسخ کلام مسیح میں جائز ہے مولانا صاحب نے اس موقع پر پادری فانڈر کی ایک اور عبارت کا جو میزان الحق میں تھی ذکر کیا جس میں مسلمانوں سے مہمل خیالات منسوب کئے گئے تھے۔ وہ عبارت یہ تھی

"اس دعوی کا باطل ہونا کہ گویا قرآن کے ظاہر ہونے سے انجیل اور پرانے عہد کی کتابیں منسوخ ہو گئیں دو وجہ سے ثابت ہے۔"

اول وجہ یہ کہ نسخ مان لینے سے دو نقص لازم آتے ہیں۔ اول یہ کہ گویا خدا کا ارادہ یہ ہوا کہ توریت کو دے کر ایک اچھا اور فائدہ مند کام کرے پر نہ ہو سکا۔ پھر اس کے بعد اس سے بہتر زبور دی جب اس سے بھی مطلب نہ نکلا تو اس کو بھی منسوخ کر کے انجیل دی۔ جب اس سے بھی فائدہ نہ ہوا آخر قرآن سے مقصد پورا کیا۔ خدا کی پناہ جب کبھی ایسا خیال دل میں لایا جائے تو خدا کی حکمت و قدرت باطل ہو گئی۔ بلکہ خدا ایک بادشاہ اور ناسمجھ اور ناتواں آدمی کے مانند ہو گا۔ کیونکہ ایسا امر صرف آدمی کی ناقص ذات میں ہو سکتا ہے۔ نہ خدا کی کامل ذات میں ثانیاً اگر وہ بات نہیں کہہ سکتے تو منسوخ ہونے کے قاعدے سے یہ خیال لازم آتا ہے کہ خدا نے چاہا کہ ناقص چیز جو مطلب کو نہ پہنچاوے۔ دیوے اور بیان کرے۔ پھر کیونکر ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسے جھوٹے اور ناکارہ خیال خدا کی قدیم ذات و کامل صفات کے حق میں کرے۔

مولانا موصوف نے فرمایا کہ یہ دونوں نقص نسخ کے معنی اصلاحی رو سے مسلمانوں پر نہیں بلکہ عیسائیوں اور پولوس مقدس پر ہیں کیونکہ وہ عبرانیوں میں فرماتے ہیں۔

بس اگلا حکم اس لئے کہ کمزور اور بے فائدہ تھا اٹھ گیا عبرانیوں باب آیت

اس عبرانیوں کے خط آٹھ باب ۷، و ۱۳ درس میں یہ لکھا ہے۔

"کیونکہ اگر وہ پہلا عہد بے عیب ہوتا تو دوسرے کیلئے جگہ کی تلاش نہ ہوتی اور جب اس نے نیا کہا تو پہلے کو پرانا ٹھیرایا۔ پر وہ جو پرانا اور دنی ہے مٹنے کے نزدیک ہے۔"

پس یہاں مقدس پولوس احکام توریت کو ضعیف، بے مصرف اور منسوخ فرماتے ہیں اور توریت کو پرانا عیب دار بتلاتے ہیں

پادری صاحب نے سنا اور خاموش ہو گئے۔ جواب کچھ نہیں دیا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے فرمایا۔ یہ چند صفحات نسخ کے بارے میں جو میزان الحق میں لکھے ہیں وہ اس قابل ہیں ان کو اپنی اس کتاب سے نکال دیں۔

پادری فرنچ نے کہا ہم سابقہ گفتگو میں کہہ چکے ہیں کہ توریت کے وہی احکام جس کا تعلق حضرت مسیح کی نشانیوں سے تھا۔ منسوخ ہو گئے ہیں اور اس کا نسخ مناسب تھا۔ کیونکہ مسیح نے ان کو کامل کر دیا تھا۔ البتہ مسیح کے حق میں جو پیشین گوئیاں تھیں وہ منسوخ نہیں ہوئیں یہ کہہ کر پادری فرنچ نے انجیل اٹھا کر عبرانیوں کے دس باب کی یہ عبارت پڑھی۔

"شریعت جو آنے والی نعمتوں کی پرچھائیں ہے اور اُن چیزوں کی حقیقی صورت نہیں۔ ان قربانیوں سے جو وہ ہر سال ہمیشہ گذرانتے ان کو جو وہاں آتے ہیں کبھی کامل نہیں کر سکتی نہیں تو وہ قربانی گذراننے سے باز آتے کیونکہ عبادت کرنے والے ایک بار پاک ہو کے آگے کو اپنے تئیں گنہگار نہ جانتے پر قربانیاں ہر سال گناہوں کی یاد دلاتی ہیں۔ کیونکہ ہو نہیں سکتا کہ بیلوں اور بکریوں کا لہو گناہوں کو مٹا دے اس لئے وہ دنیا میں آتے ہوئے کہتا ہے کہ قربانی اور نذر کو تو نے نہ چاہا۔ پر میرے لئے ایک بدن تیار کیا سوختنی قربانی اور ان قربانیوں سے جو گناہ کے لئے تھی تو راضی نہ ہوا۔"

توریت کی اس آیت اور دوسری کتابوں کے اشارہ حضرت مسیح سے متعلق تھے مسیح کے آنے کے بعد تمام کی انہوں نے تکمیل کر دی اور انجیل میں کسی شخص کی طرف اشارہ نہیں ہے جس کے آنے سے انجیل منسوخ ہو جاوے۔ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے فرمایا اگر ہم تسلیم کر لیں کہ مسیح کی آمد سے احکام توریت مکمل ہو گئے تو وہ احکام جو مسیح سے قبل موقوف ہو گئے ہیں ان کو لابد منسوخ کہنا پڑے گا۔ پادری فرنچ نے کہا کہ وہ کون سا حکم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ مثل حکم ذبح جو قوانین کے سترھویں باب میں لکھا تھا استثنا کے باب ۱۲ آیت ۱۵، ۲۰ اور ۲۲ کی وجہ سے منسوخ ہو گیا۔ ہارن صاحب ان آیتوں کی تفسیر جلد اول مطبوعہ سنہ ۱۸۲۲ء میں لکھتے ہیں۔ یہ حکم منسوخ ہے۔ اس کے بعد ہارن صاحب کی عبارت پیش کی جس میں لکھا ہے کہ فلسطین کے داخلہ سے قبل مصر میں جانے سے چالیسویں

برس بہ حکم منسوخ ہو گیا۔ پادری فرنچ صاحب سن کر خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے فرمایا۔ اس وقت یہ ثابت ہوا کہ کلام الٰہی میں نسخ محال نہیں۔ چنانچہ تمام پادری علی الخصوص ... میزان الحق کے مصنف پادری فانڈر کا دعویٰ تھا کہ نسخ کلام الٰہی میں محال ہے۔ جب اس صورت میں نسخ کا امکان پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ نسخ کا وقوع انجیل میں آنحضرت کی رسالت کے ثابت ہونے کے بعد آشکارا ہو جائے گا۔ پادری فانڈر نے کہا کہ نسخ کی گفتگو ختم ہوئی اب تحریف پر بحث کی جائے۔ اس کے بعد تحریف پر بحث کا آغاز ہوا۔

بحث تحریف

مولانا رحمت اللہ صاحب نے تحریف کی شکل متعین کرنی چاہی کہ لفظی ہو یا معنوی طے نہ ہو سکا تو مولانا صاحب نے فرمایا کہ جسٹن شہید کا جب طریقوں سے مناظرہ ہوا تو اس نے چند پیشین گوئیوں کا ذکر کیا اور دعویٰ کیا یہودیوں نے کتب مقدس سے خارج کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے عیسائیوں کے مستند مفسرین و محققین اور مستند کتب واٹسن سبلرجیس، بارن جسٹن، واٹیکر صاحب اور ڈاکٹر اے کلارک وغیرہ کی کتابوں کے حوالے مذکورہ جسٹن کے دعوے کی تائید میں پیش کرکے فرمایا تو جسٹن کے دعوے کو سچا مانئے یا جھوٹا۔ اگر سچے ہیں تو ہماری بات درست ہے۔ اگر جھوٹے تھے تو افسوس کا مقام ہے کہ عیسائیوں کے بڑے بڑے مقتدر رہنما اس قدر دروغ گو تھے کہ خود اپنی طرف سے چند پیشین گوئیوں کو گھڑ کر ان کو کلام الٰہی کا جزو قرار دیا۔ پادری صاحب نے فرمایا کہ جسٹن بھی ایک آدمی تھا۔ اس سے سہو ہوا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ اس سے سہو نہیں بلکہ قدیم جمہور علما اس سے متفق ہیں۔ پادری صاحب نے کہا عہد عتیق کے بارے میں مسیح نے گواہی دی ہے۔ دوسری گواہیوں کے مقابلہ میں ان کی شہادت زیادہ معتبر ہے اور وہ یہ ہیں۔

(۱) کیونکہ اگر تم موسیٰ پر ایمان لاتے تو مجھ پر بھی ایمان لاتے اس لئے کہ اس نے میرے حق میں لکھا ہے۔ (یوحنا باب ۵ - آیت ۴۶)

(۲) موسیٰ اور نبیوں کی وہ باتیں جو سب کتابوں میں اس کے حق میں ہیں۔ شروع سے ان کے لئے بیان کیں (لوقا باب ۲۴) آیت ۲۷

(۳) اس نے اس سے کہا کہ وہ موسیٰ اور نبیوں کی نہ سنیں گے تو اگر مردوں میں سے کوئی اٹھے اس کی نہ مانیں گے (لوقا باب ۱۶- آیت ۳۱)

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آیتوں سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتابیں اس وقت موجود تھیں نہ یہ کہ لفظ بہ لفظ درست تھا۔ بیلی صاحب کی سند پادری فانڈر نے حل الاشکال میں لکھی ہے اور اس کو اسنادی کتابوں میں شمار کیا ہے۔ وہ اقرار کرتا ہے کہ شہادت مسیح سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتابیں اس زمانہ میں موجود تھیں۔ اس سے ہر لفظ اور ہر جملہ کی تصدیق نہیں سمجھی جاسکتی۔ پادری صاحب نے فرمایا۔ میں بیلی کو اس وقت نہیں مانوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ تعجب ہے کہ آپ اس کی کتاب کو معتبر کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ اگر اس کو مستند نہیں مانتے تو ہم آپ کی بات یہاں تسلیم نہیں کرتے اور یہاں وہی بیلی کا قول ہمارا قول ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا دیکھیے یعقوب اپنے خط کے پانچویں باب میں یوں لکھتا ہے کہ تم نے ایوب کے صبر کو سنا ہے اور خداوند کے مطلب کو جانتے ہو اس پر بھی کسی نے اس کتاب کے الہامی اور صادق ہونے کو نہیں مانا ہے بلکہ سارے اگلے پچھلے اہل کتاب کے علما تو اسی امر پر نزاع رکھتے ہیں کہ ایوب محض ایک فرضی نام تھا یا کوئی شخص سابقہ زمانہ میں ہوا بھی ہے۔ "رب ممانی ڈوبز" جو یہودیوں کے بڑے علما میں ہے اور لیبکلرک، میکالس، سملر، اور بشپ اسٹاک وغیرہ عیسائیوں کے عالم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایوب صرف فرضی نام ہے اور اس کی کتاب محض ایک افسانہ ہے۔ پادری صاحب بولے ہمارے نزدیک ایوب ایک شخص ہے اور اگر مسیح کی شہادت میں اس کی کتاب بھی داخل ہے تو الہامی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ پولوس تمتھی کے دوسرے خط میں یاناس اور یمبراس کا موسیٰ سے مخالفت کر کے ان کے ساتھ مقابلہ کرنے کا حال لکھتا ہے۔ معلوم نہیں اس نے یہ بات کون کی

جعلی اور غیر الہامی کتاب سے لکھی ہے۔ صرف کسی کتاب سے کچھ نقل کر دینا منقول عنہ سے
الہامی ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ پادری صاحب بولے جعلی کتاب میں ہمارا کلام نہیں ہے
ہم نے تو پرانے عہد کی کتابوں کی تصدیق کے لئے مسیح کا قول بیان کیا۔ جب تک انجیل محرف
قرار نہ پائے۔ مسیح کی گواہی اس بات کے لئے کافی ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا ہمارا
کلام ساری بائیبل پر ہے۔ یہ بات منصفانہ نہیں ہے کہ آپ اس کے ایک جزو کو مسلمانوں کے
سامنے بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ اول تو آپ کا مطلب مسیح کی گواہی سے نہیں نکلتا۔ دوسرے
اس سے استدلال کرنا لغو اور بیجا ہے۔ جب تک اس مجموعہ میں تحریف کا نہ ہونا اور دلیلوں
سے ثابت نہ ہو ہم اس کی بات کو سند نہیں مانیں گے۔ پادری صاحب نے فرمایا۔ ہم نے
پرانی عہد کی کتابوں کے متعلق مسیح کی گواہی بیان کر دی۔ اب تم کو چاہیئے کہ انجیل میں تحریف
ثابت کرو۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اگرچہ آپ کا یہ کہنا درست نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ
انجیل میں تحریف دیکھنے کے مشتاق ہیں تو ملاحظہ کیجیے اور انجیل اٹھا کر متی کے پہلے باب کا
۱۷ درس پڑھئے۔

سب پشتیں ابراہام سے داؤد تک چودہ پشتیں ہیں اور داؤد سے بابل کے
اُٹھ جانے تک چودہ پشتیں ہیں اور بابل کے اُٹھ جانے سے مسیح تک چودہ پشتیں ہیں۔

پادری صاحب کو مخاطب کر کے ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ فرمایئے دوسرے طبقہ میں
کونسے نام پر چودہ پشتیں ہوتی ہیں۔ پادری صاحب بولے۔ ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں
ہے۔ آپ یہ بتلایئے کہ تمام نسخوں میں ایسا ہی پایا جاتا ہے۔ یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب
نے فرمایا۔ اب کے نسخوں میں تو موجود ہے اور خدا جانے اگلے نسخوں میں تھا یا نہیں۔ لیکن
اس کے غلط ہونے میں تو شک نہیں ہے۔ پادری صاحب نے فرمایا غلط ہونا اور بات ہے
اور تحریف اور۔ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے کہا۔ اگر انجیل الہامی ہے اور الہام میں غلطی ممکن
نہیں تو اس صورت میں بیشک پیچھے تحریف ہوئی ہے اور اگر الہامی نہیں ہے تو ایک اور مطلب

نکلا۔ پادری صاحب نے کہا۔ تحریف اس وقت ثابت ہوگی جب تم کوئی ایسی عبارت دکھلاؤ جو اگلے نسخوں میں نہ ہو اور اب کے نسخوں میں پائی جاتی ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے یوحنا کے پہلے خط کے پانچویں باب کا ۷، و ۸ درس پیش کیا۔ پادری صاحب نے بتایا کہ یہاں دو ایک جگہ اور تحریف ہوئی ہے۔ اس موقع پر مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی جو پادری فرنچ صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ پادری فرنچ سے انگریزی میں معلوم کیا۔ کیا بات ہے۔ پادری فرنچ نے جواب دیا کہ یہ لوگ ہارن اور دوسرے مفسروں کی کتاب سے چھ سات مقام جن میں تحریف کا اقرار ہوا ہے نکال کے سند کے طور پر دکھلا رہے ہیں۔ پادری فرنچ نے ڈاکٹر وزیر خاں صاحب سے کہا کہ پادری فانڈر بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ سات آٹھ جگہ تبدیلی اور تحریف ہوئی ہے۔

مولوی قمر الاسلام صاحب امام جامع مسجد اکبر آباد نے منشی خادم علی خاں صاحب مہتمم مطبع الاخبار سے فرمایا کہ تم لکھو کہ پادری صاحب آٹھ جگہ تحریف ہونے کے اقراری ہے۔ پادری فانڈر نے جب یہ بات سنی تو کہا ہاں بہت اچھا ہے لکھئے۔ اور کہا اتنی تعداد میں تحریف ضروری ہے لیکن کتب مقدسہ میں اس سے نقصان نہیں ہوا ہے۔ پادری فانڈر نے کہا کہ دو مسلمان اور دو معزز عیسائی انصاف کریں اور پھر مفتی ریاض الدین کی طرف متوجہ ہوکر بار بار فرما رہے تھے کہ آپ انصاف کیجئے۔ آپ نے آخر میں فرمایا کہ جس وثیقہ میں ایک جگہ جعل ثابت ہو جائے تو وہ وثیقہ قابل اعتبار نہیں رہتا۔ کجا کہ آٹھ سات جگہ۔ وقت کافی ہو چکا تھا۔

پادری صاحب کے ایما پر پہلے روز کے مناظرہ کی کارروائی دوسرے دن کے لئے ملتوی کردی گئی۔

دوسرے دن کے مناظرہ کی کارروائی

دوسرے روز پیر کو مناظرہ ۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء، ۱۲، ۱۲ رجب ۱۲۷۰ھ کو علی الصباح مقررہ مقام پر منعقد ہوا جس میں مسٹر اسمتھ صدر دیوانی مسٹر ریڈ حاکم صدر بورڈ،

مسٹر ولیم مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر کشیش ولیم گلین، پادری ہر نلے اور جناب حافظ مفتی ریاض الدین، مولوی اسد اللہ قاضی القضات، مولوی فیض احمد سررشتہ دار صدر بورڈ، مولوی حضور احمد، جناب مولوی امیر اللہ صاحب مختار راجہ بنارس، جناب مولوی قمر الاسلام امام جامع مسجد آگرہ، جناب مولوی امجد علی ڈیل سرکار کمپنی، جناب مولوی سراج الحق اور جناب منشی خادم علی مہتمم مطبع الاخبار، مولوی امیر علی شاہ، مولوی قمر الدین خاں مہتمم سعد الاخبار، مولانا مظفر علی شاہ جعفری القادری، سید صفدر علی شکوہ آبادی، پنڈت جگل کشور، مولوی فیض احمد بدایونی، امیر اللہ وکیل، مولوی معین الدین، سید باقر علی ناظم محکمہ دیوانی، مولوی کریم اللہ خان بچھرایونی سید حافظ حسین، حافظ خدا بخش۔ ڈاکٹر الہام اللہ گوپاموی، مفتی انعام اللہ ساحر، قاضی باقر علی خاں ہمدانی، راجہ بلوان سنگھ کاشی، مولوی سید مدد علی تپش، مرزا زین العابدین عابد۔ عبد الشہید کولوی، ڈاکٹر بکند لال، حکیم فرخند علی گوپاموی، مفتی اکرام گوپاموی، سید فضل حسین، ڈاکٹر وزیر الدین فرخ آبادی، حکیم جواہر لال، غلام محمد خان، خلیفہ گلزار علی اسیر، اعلام قطب الدین خاں باطن، مولوی سراج الاسلام امام جامع مسجد پیشکار وغیرہ موجود تھے۔

پہلے دن کے مناظرہ کا قدرتی طور پر چرچا خوب ہو گیا تھا جس کی وجہ سے دوسرے دن کی حاضری پہلے دن سے دگنی تھی۔ یعنی ہزار کے قریب حاضرین کی تعداد تھی۔ ساڑھے چھ بجے کارروائی شروع ہوئی۔ پادری فانڈر اٹھے۔ ہاتھ میں میزان الحق تھی۔ فصل اول میں سے قرآن مجید کی چند آیات پڑھنی شروع کیں۔ چونکہ آیات درست الفاظوں میں نہیں پڑھ رہے تھے۔ اس لئے قاضی القضات نے فرمایا کہ حضرت ترجمہ پر اکتفا فرمائیں۔ لفظ کی تبدیلی سے معنی بدل جاتے ہیں۔ پادری صاحب نے فرمایا مجھ کو معاف فرمائیں۔ یہ میری زبان کا قصور ہے۔

اس کے بعد یہ آیات پڑھیں:

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ   آپ کہہ دیجئے اللہ نے جتنی کتابیں نازل

مِنْ كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (سورہ الشوریٰ)

فرمائی ہیں۔ میں بیشک ایمان لاتا ہوں اور مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان عدل رکھوں۔ اللہ ہمارا مالک بھی ہے اور تمہارا بھی مالک ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے، اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہماری تمہاری کچھ بحث نہیں۔

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلٰهُنَا وَإِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ

(سورہ العنکبوت)

اور تم اہل کتاب کے ساتھ بجز مہذب طریقہ کے مباحثہ نہ، وہاں ان میں جو زیادتی کرے ہاں ان سے کہو، ہم اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئیں اور ان کتابوں پر بھی جو تم پر نازل ہوئیں۔ ہمارا تمہارا معبود ہے۔ ہم تو اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔

اَلْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ (سورہ مائدہ)

آج تمہارے لئے حلال چیزیں حلال رکھی گئیں ہیں۔ جو کتاب والے ہیں ان کا ذبیحہ تم کو حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے۔

وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ (سورہ البقرہ)

تم پڑھتے رہو کتب

أَنْزَلْتَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ (آل عمران)

خدا نے توریت اور انجیل آگے سے اتاری تھیں کہ لوگوں کی ہادی رہیں۔

ان آیتوں میں کتاب اور اہل کتاب کا ذکر ہے۔ اہل کتاب سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ محمد کے زمانہ میں توریت و انجیل موجود تھی اور مسلمان اس کو

تسلیم کرتے تھے اور اس کو دین کا ہادی سمجھتے تھے۔ محمدؐ کے زمانہ میں اس کے اندر تحریف نہیں ہوئی تھی۔

مولانا رحمت اللہ صاحب نے فرمایا۔ ان آیتوں سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ سابقہ زمانہ میں خدا کا کلام نازل ہوا تھا اس پر ایمان لانا چاہیئے۔ توریت انجیل میں سابقہ نازل شدہ کتابیں ہیں اور محمد کے زمانہ میں موجود تھیں۔ اگرچہ محرّف تھیں۔ ان آیات سے ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتی بلکہ جا بجا قرآن میں اہل کتاب کے تحریف کرنے کا ذکر ہے اور حدیث شریف میں ہے لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْا یعنی اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔ پادری صاحب نے فرمایا۔ احادیث کا حوالہ مت دیجئے بلکہ قرآنی آیات دلیل میں پیش کیجئے۔ مولانا صاحب نے فرمایا۔ قرآن سے ہی یہ چیزیں ہمیں معلوم ہوئیں۔ جس کا اقرار آپ نے میزان الحق میں صاف طور پر کیا ہے۔ پادری صاحب نے کہا۔ سورہ بیّنہ کی آیات سے مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ محمدؐ کے زمانہ سے قبل انجیل میں تحریف نہیں ہوئی۔ اسکے بعد عبارت میزان الحق کے پہلے باب کی تیسری فصل کی یہ عبارت پڑھی۔

چنانچہ سورہ بیّنہ میں لکھا ہے۔

لَمْ یَكُنِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِیْنَ مُنْفَكِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ ۙ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ ۙ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنَةُ

(سورۃ البینہ)

جو لوگ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کافر تھے وہ باز نہ آنے والے تھے جبتک کہ انکے پاس واضح دلیل نہ آتی یعنی اللہ کا رسول جو اُن کو پاک صحیفے پڑھ کر سنا دے۔ جس میں درست مضامین لکھے ہوئے ہوں۔ اور جو اہل کتاب تھے وہ اس واضح دلیل آنے کے بعد مختلف ہو گئے حالانکہ ان لوگوں کو بھی یہی حکم ہوا تھا۔

پادری صاحب نے فرمایا کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے حضور اقدس کے ظہور کے بعد اپنی کتابوں میں تحریف کی۔ ظہور سے قبل نہیں کی۔ اس کے بعد کہا کہ مصنف کتاب استفسار جو انتہائی مشہور ہیں اور ان کو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ مولوی آل حسن ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کے ص ۲۴۲ میں آیت مذکور کی اس طرح شرح کی ہے۔
نبی سابق الانتظار کے اعتقاد رکھنے سے جدا یا اسکے اعتقاد رکھنے میں مختلف و متفرق نہیں ہوئے مگر جب یہ نبی آیا۔ ان معنوں کی راہ سے البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نبی آخر الزماں کی بشارتوں میں اس کے ظہور کے زمانہ تک کچھ تحریف و تبدیل نہیں واقع ہوئی۔

مولانا رحمت اللہ صاحب نے جواب میں فرمایا۔ ان آیات کا ترجمہ جمہور مفسرین نے اس طرح کیا ہے۔ اور شاہ عبد القادر نے خود بھی یہی طرز اختیار کیا ہے۔

نہ تھے وہ لوگ جو منکر ہوئے کتاب والے (یعنی یہودی اور مسیح) اور شرک والے (یعنی بت پرست) باز آنے والے (یعنی اپنے دین اور بری رسموں اور برے عقیدوں سے مثل عدم اعتقاد نبوت جناب مسیح کے جیسا یہود کو تھا اور اعتقاد تثلیث کے جو عیسائیوں کو تھا اور مانند ان کے) جب تک نہ پہنچی ان کو کھلی بات ایک رسول اللہ کا پڑھتا ورق پاک اس میں لکھی کتابیں (یعنی سورتیں مضبوط) اور نہیں پھوٹے وہ جن کو ملی کتاب یعنی اپنے دین اور رسموں اور عقیدوں سے اس طور پر کہ بعضوں نے ان کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا اور بعضے تعصب سے انہیں پر قائم رہے) مگر جب کہ آچکی ان کو کھلی بات (یعنی رسول اللہ اور قرآن!

شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ پہلی آیۃ کے ترجمہ کے آخری حاشیہ میں لکھتے ہیں،

حضرت ص سے پہلے سب دین والے بگڑ گئے تھے۔ ہر ایک اپنی غلطی پر مغرور

اب چاہیئے کہ کسی حکیم یا کسی ولی یا کسی بادشاہ عادل کے سمجھائے راہ پر آویں سو ممکن نہ تھا جب تک ایسا رسول نہ آوے عظیم القدر ساتھ کتاب اللہ کے اور مدد قوی کے کئی برس میں ملک کے ملک ایمان سے پھر گئے۔

ان آیات کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ مشرکین اہل کتاب اپنے افعال شنیعہ سے باز نہیں آئے۔ جب تک ان کے پاس عظیم القدر رسول نہیں آیا۔۔ ان کے آنے کے بعد بھی اہل کتاب کی مخالفت محض تعصب بیجا اور عناد کی وجہ سے ہوتی۔

رہا صاحب استفسار کی عبارت اس کو غلط طریقہ اور بدنیتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے انہوں نے خود اس ترجمہ وخیال کا جواب دیا ہے۔ جواب ملاحظہ ہو۔

" اس استدلال سے" درصورتیکہ صحیح اور درست کیا جائے" اتنا ہی ثابت ہے۔ الخ۔ صرف نبی کے لئے جو بشارتیں تھیں ان میں تحریف و تبدیل نہیں واقع ہوئی۔ مگر بعد ظہور اس نبی کے نہ یہ کہ بائیبل میں اور کہیں کسی طرح کی خرابی نہیں ڈالی گئی "

اس جواب کے بعد مولانا آل حسن کی عبارت کو اپنی تائید میں پیش کرنا غلط ہے۔ مولانا آل حسن نے اپنی تمام تصنیف میں اس تحریف کا بھانڈا پھوڑا ہے۔ اور تحریف کی کافی مثالیں اس میں دی ہیں۔

پادری صاحب نے کہا کہ آپ یہ بتایئے کہ جس انجیل کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے کہ وہ کونسی انجیل تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ قرآن مجید سے صرف اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی پر انجیل نازل ہوئی۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کونسی انجیل تھی اور اس زمانہ میں بہت سی کتابیں انجیل کے نام سے عیسائیوں میں مشہور تھیں جیسے "برنباہ" اور برنولما وغیرہ کی انجیل یہ خدا ہی جانتا ہے کہ ان میں کونسی مراد ہے اور اس زمانہ میں ایک فرقہ مسمی کنیر بھی تھا۔ جو اس مشہور انجیل کے کل مجموعہ کو نہیں مانتا تھا اور اسی زمانہ میں عرب میں ایک

فرقہ ایسا تھا جو کہتا تھا کہ تین خدا ہیں ۔ باپ بیٹا اور مریم ۔ شاید ان کے نسخے میں یہ بھی تحریر ہو کیونکہ قرآن مجید نے ان کو جھٹلایا ہے بس یہ بات کہیں سے ثابت نہیں ہوتی کہ اس انجیل میں حواریوں کے اعمال اور نامے اور مشاہدات بھی داخل ہیں ۔

فرنچ صاحب نے کہا کہ تم عیسیٰ کے قول کے سوا اور کتابوں کو جو انجیل میں ہیں نہیں مانتے ۔ حالانکہ چوتھی صدی میں لڈلیسیا کی کونسل نے ایک کتاب یعنی مشاہدات کے سوا سب کو تسلیم کیا ہے اور ہمارے بڑے بڑے عالم جن کو ہم نہایت معتبر جانتے ہیں جیسے کہ کلیمنس اسکندریانوس ، ارجن اور سانی ہرن وغیرہ نے مشاہدات کی کتاب کو تسلیم کیا ہے ۔ لیکن اگلے زمانے کے فتنے وفساد اور لڑائیوں کی وجہ سے ہمارے پاس قریب کی سند نہیں ہے ۔

اس پر ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا ۔ کلیمنس کس زمانہ میں تھا پادری صاحب نے بتایا کہ دوسری صدی کے آخر میں ۔

ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے فرمایا اگر کلیمنس نے مشاہدات کے متعلق دو فقرے لکھ دیئے تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صدی کے آخر میں کلیمنس نے مشاہدات کی کتاب کو یوحنا کی تصنیف جانا ہے ۔ گویا اس کی سند اس زمانہ سے پہلے کی نہیں ہے ۔ لہٰذا دو فقروں سے ساری کتاب کا تواتر لفظی ثابت نہیں ہوسکتا اور ٹرٹیل ین وغیرہ تو اس کے بعد گذرے ہیں اور کسیس پر سیٹر روم نے تو اس کو سرن تھیس ملحد کا کلام کہا ہے اور اسی طرح ڈیونیسیس نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ ہم سے پیشتر بعضوں نے اس کو سرن کا کلام کہا ہے ۔ پادری صاحب نے کہا کہ ڈیونیسیس نے ان بعضوں کا نام نہیں لیا دو آدمی کی مخالفت سے کیا ہوتا ہے

ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے فرمایا ہم ایک یا دو آدمی کا نام نہیں لیتے بلکہ سینکڑوں آدمیوں کے نام گنوا سکتے ہیں ۔ مثلاً یوسی بیس اور سرل اور اس زمانہ میں یروشلم کی تمام کلیسا اور کونسل لوڈیسیا نے بھی اس کتاب کو رد کیا ہے اور عہد جیروم میں بھی بعض کلیسا اس کو نہ مانتے تھے ۔ اس پر پادری فانڈر صاحب نے اعتراض کیا ۔ یہ گفتگو مبحث سے خارج ہے

اور اس انجیل پر گفتگو ہو جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں موجود تھی۔ اس کے بعد مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب نے ارشاد فرمایا۔ ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ خدا کا کلام حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوا تھا لیکن اس بات سے منکر ہیں کہ وہ کلام یہی بائیبل کا مجموعہ ہے اور اس میں کچھ تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اور حواریوں کا کلام ہمارے نزدیک انجیل نہیں ہے بلکہ انجیل صرف اسی قدر ہے جو مسیح پر نازل ہوئی تھی۔ چونکہ کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں آیا۔ اس لئے ہم اس بات کا تعین نہیں کر سکتے کہ مسیح کی وہ باتیں کونسی کتاب میں لکھی ہوئی ہیں اور جو کچھ ان چار کتابوں میں منقول ہے اس کا درجہ حدیث کا سا ہے۔ اہل اسلام کے قبل کے لوگوں میں کوئی معتمد روایت اس سلسلے میں نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں پوپ کا تسلط اس قدر تھا کہ اس فرقہ کے لوگوں میں اصل انجیل پڑھنے کی عام اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اس بنا پر اس کے نسخے مسلمانوں کو دیکھنے میں کم آئے اور غالباً عرب کے اطراف و اکناف میں اسی قسم کے عیسائی یا فرقہ نسطوریہ کے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس پر پادری فرنچ صاحب نے تیز ہو کر کہا۔ تم نے ہماری انجیل پر بڑا الزام لگایا ہے۔ پوپ صاحب نے اس میں کوئی خرابی نہیں کی۔

اس کے بعد پادری فانڈر نے حضرت عثمانؓ کے قرآن شریف کے بعض نسخوں کو جلا دینے والا قصہ سنانا شروع کیا۔ مولوی صاحب نے کہا۔ جب یہ بات مبحث سے خارج ہے تو آپ اس کا ذکر درمیان میں کیوں لاتے ہیں۔ اس کا جواب بھی سن لیجئے۔ پادری صاحب نے جواب دیا۔ چونکہ آپ نے انجیل پر اعتراض کیا تھا۔ اس لئے میں نے یہ بات کہدی۔ اب آپ اصل موضوع پر آئیں۔

مولانا رحمت اللہ صاحب نے فرمایا۔ ہمارا اعتراض ساری بائیبل پر ہے نہ صرف انجیل پر اس لئے ہم بعض کتابوں کی سند قریب کی مانگتے ہیں۔ پادری صاحب بولے

انجیل پر بحث کیجئے۔ مولانا صاحب نے فرمایا۔ ہمارا اعتراض کل بائیبل کے مجموعہ پر ہے انجیل کی تخصیص بے جا ہے۔ اس پر پادری صاحب خاموش ہو گئے۔

پادری فرنچ اپنے ساتھ ایک تحریری جواب لاتے تھے انہوں نے اس کو پڑھنا شروع کیا جس کا خلاصہ یہ تھا۔ انجیل میں ہمارے علماء تیس چالیس ہزار اختلاف عبارت بیان کرتے ہیں۔ لیکن یہ اختلاف ایک نسخے میں نہیں بلکہ بہت سے نسخوں میں تھے چنانچہ حساب سے فی نسخہ چار یا پانچ سو اختلاف ہوتے ہیں۔ بعض غلطیاں بدعتوں کی وجہ سے ہوئیں چنانچہ ڈاکٹر گریز بیک نے انجیل متی میں تین سو ستر غلطیاں آیتوں اور لفظوں میں نکالی ہیں ان تمام میں بڑی غلطیاں ستر ہیں ان سے چھوٹی غلطیاں ۳۲ ہیں اور بقایا بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ہمارے علماء نے ان غلطیوں کو صحیح کیا ہے۔ جس کتاب کے نسخے زیادہ ہیں اس کی درستگی میں آسانی ہوتی ہے اور جس کے نسخے کم ہیں اس کی تصحیح میں دشواری ہوتی ہے۔ ہمارے علماء کا کہنا ہے کہ ان اغلاط کے علاوہ اور کوئی غلطیاں نہیں ہیں اور مسیحی دین کو ان غلطیوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر کنی کاٹ کہتا ہے۔
بالفرض اگر یہ ساری محرف عبارتیں نکال ڈالی جائیں تو دین عیسوی کے کسی عمدہ مسئلے میں نقصان لازم نہ آئے گا اور اگر ساری بنائی ہوئی عبارتیں داخل کر دی جائیں تو دین کے معتبر مسئلوں میں کچھ زیادتی نہ ہو جائے گی۔ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اس تقریر کا جواب دینا چاہتے تھے تو پادری فانڈر نے کر کے ٹال دیتے اور منع کرتے اور مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوتے تھے

اس پر مفتی ریاض الدین صاحب نے فرمایا۔ اول تحریف کے معنی بیان کیجئے۔ مولانا صاحب نے تحریف کے معنی بیان کئے۔ ہمارے نزدیک تحریف کے معنی تغیر کے ہیں خواہ تغیر کچھ بڑھ جانے یا گھٹ جانے سے ہوا ہو۔ خواہ بعض الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ آنے کے باعث ہوا ہو۔ خواہ یہ تحریف ازراہ خباثت اور شرارت سے ہوئی ہو یا غلبہ وہم کی

وجہ سے اصلاح کے طور پر عمل میں آئی ہو۔ چنانچہ ہمارا دعوئ ہے کہ ان صورتوں میں کتب مقدسہ میں تحریف ہوئی ہے۔ اگر آپ اس سے انکاری ہیں تو ہم اس کو ثابت کرنے کے لئے تیار ہیں۔

ان غلطیوں کو پادری صاحب نے سہو کاتب ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن بعد میں مولانا صاحب کی تشریح قبول کی لیکن اس کا نام سہو کاتب رکھا۔ اور اس کے بعد کہا "سہو کاتب متن میں نہیں ہے" کا عذر پیش کیا جس کو مولانا صاحب نے ماننے سے انکار کیا تو اس وقت جناب مولوی فیض احمد سرشتہ دار نے پادری صاحب کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا۔

تعجب است کہ در کتاب تحریف واقع شود و در متن قباحتے نیفتد۔

اس کے بعد مناظرہ ختم ہو گیا۔

مولانا امام بخش صہبائی شہید فرنگ نے حسب ذیل تاریخ اس مناظرہ کے بارے میں کہی تھی

یافتہ در آگرہ محفل بحث انعقاد — مومن و ترسا بہم آمدہ در گفتگو

حرف نصاریٰ کہ ما در رہ حق میر وہیم — قول مسلماں کہ نیست رائے ترا ہیچ رو

اہل فرنگ از حسد کردہ بہم اتفاق — تا بہر ند از میاں گوے علوا ز غلو

زانطرف اندر کلام پادری نکتہ سنج — زینطرف اندر سخن فاضل انصاف گو

ہادم بنیان شرک ماحی آثار کفر — واقف ہر برگ و ساز ہم ہر رنگ و بو

ہر دو با ناز از بحث ساختہ ساز سخن — ہر دو بقصد ستیز آمدہ در گفتگو

کردہ در آن تنگنا عالم و جاہل ہجوم — صف بصف استادہ خلق منتظر از ہر دو سو

دعوئ تحریف را کامدہ بر روئے آب — تا بزندش بہم رفتہ لبے جستجو

لیک بتائید حق نصرت دیں رخ نمود — شاہد مطلب شتافت بر حسب آرزو

پادری آمد بگفت اینکہ در انجیل ما — حرف غلط چل ہزار آرے گو آوردہ رد

زیں سپس آوازہ داد من بمیاں عاجزم — بر دمبیدان علم حضرت مخدوم گو

ہاتفے گفتا کہ تو سال پئے فتح دین
پادری الزام خورد از مدد حق بہ گو

۱۲۷۰

ازالۃ الشکوک جلد دوم (۲۷۶ × ۲۷۷)

اس مناظرہ سے جہاں مسلمانوں میں جان آئی وہاں عیسائیوں اور خاص طور پر عیسائی مشنریوں کا غرور ٹوٹا۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس کا بھی ذکر ازالۃ الاوہام میں کیا ہے اور ساتھ ہی حکومت برطانیہ کے خاتمے کی تمنا اور اس کے لئے دعا بھی کی ہے۔

"مباحثہ کا فائدہ یہ ہوا کہ پادریوں کا بالکل وہ زور شور گھٹ گیا اور کتابیں جو کثرت سے بانٹتے تھے اس کثرت سے موقوف کر دیں اور مسلمانوں سے الزام اُٹھ گیا اور عیسائیوں کا وہ تکبر اور اعتقاد فاسد مٹ گیا اور مذبذبوں کا وہ تذبذب ہٹ گیا و الحمد للہ علی ذالک مجھ کو اس مباحثہ سے نہ کچھ نام منظور تھا۔ نہ منصب حاصل کرنا تھا بلکہ محبت اسلامی سے خدا پر بھروسہ کر کے اس بات پر قدم رکھا تھا اور اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ مجھ سے دین احمدی کی تائید مقابلے لسانی میں کرادی۔ اس سے ہزار ہا درجہ مقابلہ سنانی بھی کرادے اور جیسا کہ ان کا زور شور مذہب کے مقدمے میں مدھم پڑا اور اس میں پھیکے پڑ گئے ویسا ہی ان کا زور شور حکومت کا بھی ٹوٹے اور سان کا تکبر و غرور خاک میں ملے اور مسلمان اس میں بھی غالب آویں اگرچہ ان دنوں میں جو رجب کا مہینہ اور سنہ ۱۲۷۰ھ بارہ سو ستر ہجری میں ان کی حکومت کے زور شور کا ملاحظہ کر کے جاہلوں کا اعتقاد یہ ہے کہ قبل خروج مہدی رضی اللہ عنہ کے یہ تسلط ان کا نہ جائے اور ان کے ان قوانین محکمہ اور تدابیر مضبوط سے ترقی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ پر اللہ کی قدرت کے لحاظ سے کچھ بعید نہیں کہ نمرود

اور شداد اور فرعون اور بخت نصر کی طرح ان کے اس زور کو بھی ملیامیٹ
کر دے اور ان کے تنزل کو ہماری زندگی میں ہماری آنکھوں سے دکھا دے
آمین اللھم انصر من نصر دین محمد وجعلنا منھم
واخذل من خذل دین محمد ولا تجعلنا منھم

(ازالۃ الشکوک دوم ۲۷۶ X ۲۷۷)

اس مباحثہ کے بعد ۱۱ راپریل ۱۸۵۴ء سے مولانا رحمت اللہ صاحب اور پادری فنانڈر
کے درمیان اس امید پر کہ دوبارہ مناظرہ کیا جائیگا خط وکتابت شروع ہوئی لیکن دوبارہ مناظرہ
کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تو ۲۳ راپریل ۱۸۵۴ء کے بعد سے خط وکتابت بھی بند
ہوگئی۔ ان خطوط کے ضروری اقتباس نقل کئے جاتے ہیں جن سے پادری فنانڈر کی دیانتداری
کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ پادری فانڈر نے مولوی صاحب کے خط کے جواب میں
۱۸ راپریل ۱۸۵۴ء کو یہ خط لکھا تھا۔

اولاً مباحثہ اسی قاعدے اور ترتیب پر رہے گا جس پر رضائی طرفین
پیشتر قرار پائی ہے ثانیاً پہلی شرط سے جس کا ذکر جناب نے اب کے خط میں
ماورای شروط پیشن مذکورہ سے کیا ہے اس سے نہ پادری فرنچ صاحب کو نہ
مجھے کچھ انکار ہے۔ اگرچہ سبب تطویل ہوگی مگر مباحثہ دونوں جلسہ گذشتہ
میں ہم لوگوں کے نزدیک بدیں مضمون تمام ہوا۔ یعنی ہم مقر ہوے کہ توریت
میں نہ در اصول ایمانیہ بلکہ صرف فروعات کے مسئلوں میں نسخ ہوا ہے اور
پھر صرف اس مضمون سے کہ فروعات نے مسیح کے ظہور سے انجام و اختتام
پایا اور انجیل کی بابت ہماری بات یہ تھی کہ نہ منسوخ ہوئی ہے نہ ہوگی۔
مسیح کے اس قول کے موافق جو انجیل میں یعنی لوقا کے ۲۱ باب کے ۳۳ آیت
میں مرقوم ہے۔ پھر ادعائی تحریف کے جواب میں ہماری بات یہ تھی کہ تحریف

وتبدل از سہو کاتبان وغیرہ نکتوں اور حروف اور نقطوں ہیں اور بعض آیتوں میں بھی ہوا ہے اور یہ کہ ہمارے علماء نے قدیم نسخوں سے تیس ہزار ۳۰۰۰۰ غلطیاں اس طرح نکالی ہیں مگر نہ یہ کہ ہر نسخہ میں اتنی غلطیاں واقع ہوئی ہوں بلکہ قدیمی نسخوں سے جو شمار میں چھ سو پچاس سے کچھ اوپر ہیں ۔ مذکورہ غلطیاں نکال دی ہیں اور بعض میں کم بعض میں زیادہ غلطی پائی گئیں (اور اگر ان تیس ۳۰۰۰۰ ہزار غلطیوں کو چھ سو پچاس نسخوں پر بحساب مساوی تقسیم کریں تو فی نسخہ چھیالیس غلطیاں نکلتی ہیں نہ زیادہ) اور یہ بھی ذکر ہوا کہ ان سب نسخوں کو مقابلہ کرنے سے اکثر غلطیاں تصحیح کی گئیں ۔ چنانچہ اب صرف تھوڑے الفاظ اور صرف چند آیت مشتبہ رہی ہیں ۔ پھر یہ کہ ہم نے ان عالموں کی گواہی جنھوں نے قدیمی نسخے مقابلہ کرنے میں اپنی عمر صرف کی ہے پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ باوجود سہو کاتبان وغیرہ انجیل کے اصل متن یعنی اصل مطلب میں کچھ بھی فرق نہیں پڑا بلکہ وہ اپنی اصل پر ہے ۔ چنانچہ سب تعلیمات اور احکام انجیل اب بھی بعینہ وہی ہیں جو اول سے تھے اور یہ بات ماورای گواہی علماء مذکورہ کی اب کی انجیل کو ان نسخوں سے جو زمانہ محمدؐ سے آگے مروج تھے مقابلہ کرنے سے بھی معلوم ہوتی ہے

اس خط کا جواب کہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے پادری فنانڈر کو حسب ذیل دیا ۔

"عنایت نامہ آپ کا پہنچا مگر نو جگہوں میں بسبب اجمال کے جو مطلب صاف صاف نہیں کھلا تو دریافت کرنا ان کا معہ ایک اور امر کے پہلے جواب تفصیلی لکھنے کے ضرور پڑا ۔ عنایت فرما کے تشریح اُن کی فرما دیجیے اور اب کے مجمل نہ لکھیے ۔ . . . . توریت میں نہ ور اصول ایمانیہ بلکہ صرف

فروعات کے مسئلوں میں نسخ ہوا ہے۔ جو کلام اب کے جلسوں میں اس نسخ پر تھا جو مصطلح اہل اسلام ہے اور فقط اوامر و نواہی میں آتا ہے اور اسی کی تشریح ہیں نے جلسہ اول میں کی تھی اور اسی کے اثناء ذکر میں احکام توریت کی منسوخیت آپ کی زبان پر گذری تھی اور اسی کے موافق ہیں نے پہلے عرلضیہ میں بھی لکھا ہے تو غالباً اس جا نسخ سے مراد آپ کی وہی ہوگی گو اس کا نام تکمیل بھی رکھیں مگر اس کی تصیح کر دیجئے اور یہ بھی بتلا دیجئے کہ اس معنی کر کے جس میں ہمارا کلام ہی آپ کے نزدیک اصول ایمانی جن پر وہ نسخ طاری نہیں ہوتا تمام توریت موسیٰ میں سوائے احکام عشرہ کے کچھ اور بھی ہیں۔ اگر ہیں تو ان کی تفصیل کیجئے۔ موضع تحریف و تبدیل از سہو کاتبان وغیرہ نکتوں اور حروف اور لفظوں میں اور بعض آیتوں میں ہوا ہے" اس میں غالباً لفظ وغیرہ کا عطف سہو پر ہوگا اور یہی آپ کی مراد ہوگی کہ سہو کاتبان اور غیر سہو سے یعنی قصداً جیسا آپ نے جلسہ دوم میں بھی فرمایا تھا اور تحریف قصدی اہل بدعت بلکہ تحریف قصدی دیندار مسیحیوں کا بھی بعض محققین عیسائی نے اقرار کیا ہے۔ اگر یہی مراد ہے تو تصریح کر دیجئے اور اسی طرح اس کی بھی تصریح کر دیجئے کہ بعض آیتوں سے وہی سات آٹھ آیتیں مراد ہیں جن میں اس تحریف کو جس کے ہم مدعی ہیں آپ نے قبول کیا تھا یا اس سے زائد بھی ہیں۔ اگر اتنی ہی ہوں تو ان مواضع کو ضبط کر دیجئے کہ فلانی اور فلانی آیت ہے تاکہ ہم آپ کے مختار سے واقف ہوں اور بعد دستخط ہو جانے طرفین کے دوسری آیتوں کو جو ماسوائے ان کے ہیں اور ہم نے ان کو نکال رکھا ہے اگلے جلسوں میں پیش کر کے ان کے حسن و قبح پر مطلع ہو جائیں اور اگر لفظ بعض

یچاس ساٹھ کو بھی شامل ہے تو اس کی تصریح کر دیجئے اور اس صورت میں بھی اگر آپ سے سب کی تفصیل نہ ہو سکے تو دس بڑے بڑے مواضع کی تفصیل کر دیجئے۔ موضع دو "ہمارے علماء نے تیس ہزار غلطیاں الخ" اس سے کیا مراد ہے۔ آیا یہ سب مصححین مشہورین نے جو اٹھارویں صدی میں درپے تصحیح کئے ہوئے تھے بعد مقابلہ نسخوں کے اتنی ہی آج تک غلطیاں نکالی ہیں یا یہ کہ بعض مصححین نے بعض وقت میں اور اسی طرح چھ سو پچاس نسخے سے کیا مراد ہے آیا یہ کہ آج تک اتنے ہی نسخوں سے مقابلہ کیا گیا ہے یا یہ کہ بعض وقت میں اتنوں سے کیا گیا ہے۔ گو اور وقت میں بھی اور سے مقابلہ کر کے غلطیاں نکالی ہوویں اور صورت دویم میں اس مقابلہ کرنے والے کا نام کیا تھا موضع

"اب صرف تھوڑے الفاظ اور صرف چند آیات مشتبہ رہی ہیں۔"

جو کل تیس ہزار تھا تو اکثر کا اطلاق نصف سے کچھ زیادہ پر ہو سکتا ہے۔ پس تھوڑے الفاظ سے مراد کیا ہے۔ آیا ہزاروں جو پندرہ ہزار سے کم ہوویں یا سینکڑوں یا دس بیس اور اسی طرح چند آیت سے کیا مراد ہے۔ اگر تھوڑے الفاظ اور چند آیت سے دس بیس الفاظ اور دس بیس آیتیں ہیں تو ان کی تفصیل کر دیجئے۔ موضع کہ سب تعلیمات اور احکام انجیل بعینہ وہی ہیں۔ الخ اس سے کیا مراد ہے آیا یہ کہ کوئی فقرہ کسی حکم یا تعلیم کا منحرف نہیں ہوا یا یہ کہ گو بعض جا میں ایک فقرہ یا کئی فقرے بگڑ گئے ہوں مگر چونکہ وہی مطلب اور جا سے نکل سکتا ہے تو اصل مطلب میں آپ کے نزدیک کچھ نقصان نہیں آیا۔ . . . . .

پادری فانڈر صاحب نے مذکورہ خط کا ۱۲؍ اپریل ۱۸۵۴ء کو یہ جواب دیا۔

عنایت نامہ آپ کا پہنچا۔ جواب یہ ہے کہ آپ کے سوالات کے جواب اور بیان میں کتاب لکھنی پڑے گی۔ نہ نامہ میں ایک خط میں اس کی گنجائش کس طرح ہو گی۔ مگر ان کا جواب اس وقت ضرور بھی نہیں کس واسطے آپ کے بعض سوال ان مسئلوں سے منسوب ہیں جن کا مباحثہ ہو چکا۔ اور بعض ایسے ہیں اگر جناب چاہیں تو ان کو آئندہ مباحثہ میں

پیش کریں۔ میں نے تو صاف لکھا کہ پادری فرنچ صاحب کی اور میری دانست میں مباحثہ نے کس وجہ سے اور کس مقام تک انجام پایا اور یہ کہ وہ بات جو نسخ اور تحریف کے مباحثہ میں باقی رہے یہ ہی کہ آپ اپنے اس دعوی کو کہ انجیل کا مضمون بدل گیا۔ ثابت کیجئے اور میں نے یہ بھی لکھا کہ اگر مباحثہ پھر قائم ہو تو اسی بات سے شروع ہونا چاہیے نہ اور کسی بات سے۔ مگر جناب نے اس کا جواب کچھ نہیں لکھا بلکہ اور سوالات پیش کئے۔ بس فرمائیے کہ آپ کو منظور ہے کہ مباحثہ اسی بات سے شروع ہووے یا نہیں۔ اگر جناب کی بھی یہی مرضی ہے تو مباحثہ پھر قائم ہو کہ جو جو بات اس مسئلہ کے شامل ہے۔ آپ اسے پیش کیجئے اور ہم تامل سے ان کے جواب دیں گے لیکن مباحثہ سے آگے جواب دینا لازم و واجب نہیں جانتے ہیں اور در حالیکہ آپ کی رضامندی اس بات پر نہ ٹھیرے تو مباحثہ موقوف رہے گا اور میرے اگلے خط میں بھی اسی کا اشارہ تھا۔

مولانا رحمت اللہ صاحب نے مذکورہ خط کا ۲۳ اپریل ۱۸۵۴ء کو جواب دیتے ہوئے آئندہ خط و کتابت کرنے سے بھی پادری فانڈر صاحب کو منع کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ تحریری مباحثہ بھی اس خط کے بعد ختم ہو گیا۔

عنایت نامہ ملا۔ اس کے دیکھنے سے کمال تعجب ہوا۔ افسوس کہ اب محض گفتگو موقوف کرنے کو ایک عذر کچا بار بار زبان پر لاتے ہیں۔ بھلا جب آپ نے علی رؤس الاشہاد اس مجموعہ میں تحریف آیات کی آٹھ جا جس سے ایک جا آیت ۷، باب ۵ پانچویں نامہ یوحنا کی ہے مان لی اور تفسیر سہو کاتب کے ایسی کہ وہ تحریک جس کے ہم مدعی ہیں اس سہو کاتب کے ایک فرد بن گئے اور اس لحاظ سے امکان کا کیا ذکر وقوع تحریف کا بالفعل اس مجموعہ میں آپ کے نزدیک مسلم ہوا۔ پھر جو آپ عدم تحریف مقصود اصلی اس مجموعہ کی واجب التسلیم کراتے ہیں۔ کیا شرط انصاف کی ہے۔ دیکھو جس قبالہ میں سات آٹھ جا جعل پکڑا جاوے اور صاحب قبالہ اس کو قبول بھی کر لیوے اور پھر

دعوے کرے کہ اورجا اگرچہ ہم نے جعل کیا ہے مگر مقصد میں ہم نے جعل نہیں کیا تو اسکی کون سنتا ہے۔ علاوہ اس کے جیسا کہ آگے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہمارا منصب آپ کے عنایت ناموں کے موافق مسئلہ نسخ اور تحریف اور تثلیث میں اعتراض کا اور آپ کا منصب جواب دینے کا تھا پس انصاف کیجیے کہ اثبات عدم تحریف کا مقصد اصلی میں یقیناً آپ کے ذمہ ہے۔ اور ہم نے تو اپنے منصب سے زیادہ مشکوکیت اور محرفیت اس مجموعہ کی ثابت کردی اور آٹھ جا آیات میں آپ نے اس کو مان لیا۔ پس ہمارا ذمہ بالکل فارغ اور آپ کا ذمہ مشغول ہے اور ہم کو اب اتنا ہی کافی ہے جو کہیں کہ یہ مجموعہ مشتبہ ہے اور کیونکر نہ ہو کہ جملوں کا کیا ذکر اس کی اکثر کتابوں کی نسبت علماء مسیحیوں کو سلفاً خلفاً شبہ رہا ہے اور بہت علمائے عیسائی مذہب نے اقرار کیا ہے کہ نامۂ دوم پطرس اور نامہ یعقوب اور نامہ یہود اور نامہ دوم اور سوم یوحنا اور مشاہدات یوحنا انجیل نویسوں کی لکھے ہوئے نہیں جیسا کہ تفصیلاً ان علماء کے اقوال کی تشریح رسالہ اعجاز عیسوی میں جو انشاء اللہ عنقریب آپ کے ملاحظہ میں گذرے گا ہوئی ہے۔ پس اگر سند متصل اس مجموعہ کی ہوتی تو ہرگز ایسا خلاف نہ پڑتا اور بہت علماء معتبر ایسا نہ کہتے اور اسی طرح انجیل متی جو اول اناجیل ہے اس کی بھی کوئی سند متصل نہیں اور موافق مذہب مختار قدما کے وہ عبری میں تھی۔ اور وہ اب صفحہ جہاں سے گم ہے اور ترجمہ یونانی اس کا پایا جاتا ہے اور وہ بھی بے سند کہ آج تک بالیقین اس کے مترجم کا حال اور نام معلوم نہیں پس ایسی انجیل کو ہم کس طرح کلام اللہ مانیں اور ترجموں کا حال تو قدیم سے اہل کتاب میں بہت ہی خراب ہے۔ اس کے مترجم نے بھی بہت کچھ خرابی کی ہوگی۔ شاید اسی لیے ہم اسکو بہت جا صریح غلط پاتے ہیں۔ اول ہی کے باب میں چھ غلطیاں فاحش اس میں موجود ہیں اور بے سند ہونے عہد عتیق کی کتابوں کا ہم کیا ذکر کریں۔ پس ہرگز ہم پر یہ سب بے سند کتابیں جن کے مصنفوں کا بھی بالیقین پتہ نہیں لگتا حجت نہیں ہو سکتی اور جو آپ اپنے دونوں خطوط کے موافق ایک ہی

شرط پر گفتگو کریں گے اور بس۔ ہمارے نزدیک وہ شرط بالکل خلاف داب مناظرہ ہے اور دوسرے ہی جلسہ سے ہم اس کا انکار کرتے ہیں جیسا کہ بار بار ہم عرض کر چکے ہیں۔ پس یہ سمجھ کر آپ نے ایک عذر پوچ سے حیلہ قطع کرنے کا گفتگو کا اٹھایا اور گفتگو موقوف کی۔ ہم بھی مباحثہ کو قطعاً قطع کرتے ہیں اور یہ ہمارا آخری خط ہے۔ ہم تو اس کے بعد کوئی خط نہ لکھیں گے اور آپ بھی نہ لکھئے گا۔ لیکن اگر آپ مباحثہ ضبط کر کے چھپوا دیں تو ضرور دو باتوں کا لحاظ رکھئے گا ایک تو یہ کہ ہمارے معنی اصطلاحی نسخ کے جو کی تشریح تمام میں نے جلسہ اول میں کر دی تھی مشروحاً لکھ دیجیے گا۔ دوسرے یہ کہ سب خطوں اپنے اور میرے جو قبل گفتگو زبانی اور بعد اس کے تحریر ہوئے ہیں اس مباحثہ کے ساتھ چھپوا دیجیے گا تاکہ ناظر اس کا خود ہی معلوم کرے گا کہ کون غالب رہا اور کون مغلوب اور خلاف داب مناظرہ کے کہتا تھا اور کون اس کے موافق ۔ ۔ ۔ ۔ [1]

مولانا رحمت اللہ صاحب اور پادری فانڈر صاحب کے درمیان جو خط و کتابت مباحثہ سے قبل اور اس کے بعد ہوئی اور مناظرہ کی دو روز کی روئیداد "البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف" کے نام سے کتابی شکل میں ۱۲۷۰ھ کو حافظ عبداللہ صاحب کے اہتمام میں فخر المطابع شاہجہاں آباد میں چھپی اور ولی عہد مرزا فخر الدین صاحب بن سراج الدین بادشاہ کے حکم سے ہندوستان کے اطراف و اکناف میں تقسیم کی گئی۔ اس مباحثہ کی روئیداد وغیرہ کو مرتب کرنے والے وزیر الدین صاحب بن شرف الدین صاحب تھے یہ روئیداد ۶۰ صفحات پر مشتمل تھی جو فارسی زبان میں ہے۔

اسی اکبر آباد کے مناظرہ کی روئیداد چھوٹی تقطیع پر مباحثہ مذہبی حصہ اول، سید عبداللہ اکبر آبادی نے منشی محمد امیر صاحب کے اہتمام میں مطبع منتمیہ اکبر آباد میں ۱۲۷۰ھ میں چھپوائی تھی۔ جو فارسی میں ہے۔ اس فارسی کی روئیداد کا اردو کی روئیداد

[1] البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف ص ۵۸

سے ترجمہ ہوا ہے۔

مناظرہ کے خاتمہ اور مولانا رحمت اللہ صاحب کی خط و کتابت کے بعد پادری فانڈر کی خط و کتابت ڈاکٹر وزیر خان صاحب کے درمیان ۱۵ اپریل تا ۱۷ اگست ۱۸۵۴ء تین مہینے تک ہوئی۔ اس کو کتابی شکل میں مباحثہ مذہبی حصہ اول کے نام سے سید عبداللہ اکبر آبادی نے مطبع منعمیہ اکبر آباد محلہ پیپل منڈی میں ۱۲۷۰ھ کو باہتمام منشی محمد امیر خاں طبع کرایا جو فارسی زبان میں ۱۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی خط و کتابت کا اردو ترجمہ مباحثہ مذہبی دوسرا حصہ! سید عبداللہ صاحب نے مطبع منعمیہ اکبر آباد میں چھپوایا۔ جو ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں فانڈر کے تیرہ اور ڈاکٹر وزیر خاں صاحب کے ۱۴ خط ہیں۔ اس خط و کتابت کا تعلق اکبر آباد کے مذکورہ مناظرہ کی بحث سے ہے۔ اور جو بعض باتیں تحریف کے سلسلے میں اس مناظرہ میں رہ گئی تھیں۔ ان کو ان خطوط میں پادری صاحب سے ثابت کرایا۔ چنانچہ سید عبداللہ صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔

"باوجودیکہ کسی اہل اسلام کے دل میں کبھی کسی طرح کا شک یا شبہ کسی زمانہ میں (اسلام کے بارے میں) ذرا سا بھی نہ آیا تھا۔ پھر تیرھویں صدی میں جبکہ میں پادریوں نے پھر اس تیرگی اور گمراہی کو پھیلایا اور یہاں میں نقارہ علی الاعلان آنکھیں بند کر کے خلاف ہدایت کا بجایا تب یہ بھی اسی نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت ہے کہ اولاً تو عادل حقیقی نے مباحثہ تقریری میں مخالفین کو زک دی اور جن باتوں کو ایک مدت سے پادری لوگ اپنی چالاکی سے چھپاتے اور مخفی کرتے چلے آتے تھے۔ ان کا اقرار کروایا اور پھر بعض بعض باتیں جو اس مباحثہ کے وقت یونہی رہ گئی تھیں اور ان کا ذکر نہ کرنے پایا تھا

اب ان خطوط کے ذریعہ ان کا بھی اقبال کرادیا۔ علی الخصوص مسئلہ تحریف جو عمدہ مسائل متنازعہ فیہ میں سے ہے مخالفین کی تحریر و تقریر سے بخوبی تمام کا شمس فی رابعۃ النہار پایۂ ثبوت کو پہنچایا۔ اب بفضلہ و عنایتہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ پر یہ بات واضح و آشکارا ہو جائے گی کہ یہ اناجیل اربعہ جو آج کل عیسائیوں میں مشتمل اور ان کی معتقد علیہ ٹھہرا رہی ہیں۔ بیشک موضوعی و مصنوعی ہیں اور ہرگز ہمارا خدا کا کلام نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ ان کے معتقدین اس بات پر متفق ہیں کہ آیتیں کی آیتیں اسمیں سے نکال گئیں۔ اور آیتیں کی آیتیں مخالفین کے تصرفات سے اس میں بڑھادی گئیں۔

ان خطوط میں صرف تحریف انجیل پر ہی بحث چلی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے اپنے دوسرے خط میں پادری فانڈر صاحب کو یہ اعتراض تحریر کئے تھے

میں چند اعتراض جو ڈاکٹر اسٹراس صاحب نے فقط اول ہی باب متی پر کئے ہیں لکھتا ہوں۔ آپ ان کا جواب جرمنی کتاب سے مہربانی کر کے لکھ دیجئے۔

اول یہ کہ ورس ۱۷ باب اول متی میں یوں لکھا ہے کہ سب پشتیں ابرہام سے داؤد تک چودہ پشتیں ہیں اور داؤد سے اس وقت تک کہ بابل کو اٹھا کے چلے گئے تھے چودہ پشتیں ہیں اور بابل کو اٹھ جانے سے مسیح تک چودہ پشتیں ہیں۔ پس اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نسب نامہ میں چودہ پشتوں کی تین قسمیں ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ اس لئے کہ اگر نام گنے جائیں تو حضرت ابراہیم اور حضرت داؤد تک تو البتہ چودہ ہوتے ہیں کہ حضرت ابراہیم اور حضرت داؤد دونوں اسی قسمت اول میں داخل ہوں اور قسمت دوم میں یہکینیا کو لیکے پورے ہوتے ہیں لیکن قسمت سوم میں سب نام حضرت عیسیٰ سمیت صرف تیرہ ہیں۔ پس متی نے سہو سے ایک نام چھوڑ دیا۔ کس لئے کہ کاتب کے سہو کا تو گمان نہیں ہو سکتا اسلئے کہ "پورفری" نے بھی یہ اعتراض کیا تھا۔

دوسرا یہ کہ قسمت دوم میں جو حضرت سلیمان سے شروع اور یہکینیا پر ختم ہوتی ہے ۔ متی چودہ پشتیں بتلاتا ہے ۔ حالانکہ تواریخ کی اول کتاب کے باب تیسرے کو ملاحظہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ یعنی حضرت سلیمان سے یہکینیا تک ۱۸ پشتیں ہوئی ہیں اور اسی باب میں نیومن صاحب تاسف کی راہ سے کہتا ہے کہ وینا عیسوی میں ایک اور تین کو ایک ماننا پڑا تھا ۔ اب ۱۸ - ۱۴ کو بھی ایک ہی کہنا پڑا ۔ کیونکہ کتب مقدسہ میں تو غلطی کا احتمال ہو ہی نہیں سکتا ۔

تیسرا یہ کہ متی درس ۸ میں "عوزیا" کو "یورام" کا بیٹا لکھتا ہے ۔ حالانکہ وہ اس کے پڑپوتے کا بیٹا ہے اور جناب متی نے غلطی سے تین بادشاہوں کو چھوڑ دیا ہے جیساکہ درس ۱۱ - ۱۲ باب ۳ کتاب اول سے ظاہر ہے ۔

چوتھا یہ کہ درس ۱۱ میں متی نے یہکینیا کو یوشیا کا بیٹا لکھا ہے ۔ حالانکہ وہ اس کا پوتا تھا اور یہاں بھی متی سے ایک نام چھوٹ گیا ۔

پانچواں متی نے یہکینیا کے بھائی لکھے ہیں ۔ حالانکہ عہد عتیق کی کتابوں سے اس کا کوئی بھائی ثابت نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا ۔ البتہ اس کے باپ کے تو تین بھائی تھے ۔

چھٹا ۔ متی ۔ زرو بابل کو شلتائیل کا بیٹا لکھتا ہے ۔ حالانکہ وہ اس کا بھتیجا اور فدایا کا بیٹا ہے ۔

ساتواں ۔ متی نے ابیہود کو زرو بابل کا بیٹا لکھا ہے حالانکہ اس کے بیٹوں میں کسی کا بھی نام یہ نہ تھا پس جب ایک نسب نامہ میں جناب متی نے اتنی غلطیاں کی ہوں تو ان کی کتاب میں تو خدا جانے کتنی غلطیاں ہوں گی ۔ لہذا اسٹراس صاحب کہتے ہیں کہ جب یہ ثابت ہوا کہ مورخ کی تحقیق میں قصور ہے تو اس کا کلام قابل اعتبار نہیں ۔ سوا اس کے اسٹراس صاحب نے نسب نامہ پر اور بھی اعتراض کئے ہیں مگر بسبب خوف طوالت

اتنے پر ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ آپ کے اخلاق سے امیدوار ہوں کہ اس کے جواب سے مطلع فرمائیے۔" (۱۸)

یہ دُنیا کا دستور ہے کہ اگر کسی شجرۂ خاندانی یا نسب نامہ میں ایک پشت کی کسر رہ جائے یا ایک نام چھوٹ جائے تو وہ نسب نامہ مکمل نہیں کہا جا سکتا لیکن پادری فانڈر صاحب ناموں کے حذف ہونے اور ناموں کی تبدیلی اور رشتوں کے غلط منسوب ہونے کو قابل اعتراض نہیں سمجھتے بلکہ ان کی عجیب و غریب تاویلیں گھڑتے ہیں۔

اول تو پادری فانڈر صاحب ان اعتراضوں کا جواب دینے سے گریز کرتے رہے جب ڈاکٹر وزیر خاں نے ان پر زور دیا تو آخر مجبور ہو کر انہوں نے ۲ جون ۱۸۵۴ء کے چوتھے خط میں یہ جواب دیا۔

..... ان اعتراضوں کے جواب میں مذکور کروں گا جن کو آپ نے متی کے نسب نامہ کی بابت مسطور کئے ہیں۔ اولاً جان لیجئے کہ نسب نامہ تفصیلاً بھی لکھا جاتا ہے اور اختصاراً بھی۔ چنانچہ توریت میں مثلاً روت کی کتاب کے آخر باب کی آخر آیتوں میں بھی ایک نسب نامہ اختصار سے مرقوم ہے۔ اب متی حواری نے اختصاراً لکھ کر کئی ایک نام قصداً چھوڑ دیئے مثلاً وے نام جن کا ذکر آپ نے کیا اور ایسا ہی پانچویں آیت میں بھی سلموں کے بعد کتنے نام چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ آپ نے ذکر نہیں کیا اور آپ کی دریافت میں نہیں آئے۔ اب اختصاراً ذکر کرنے کا سبب متی حواری نے نہیں بتایا ہے مگر ماورائے اور سبب کے ایک یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین قسم کے سبب چودہ چودہ پشت پر انہوں نے ایسی ہی کیا ہے ثانیاً لفظ بیٹا عبرانی میں بن اور لفظ بھائی عربی اخ دونوں زبان عبرانی ہیں اور توریت کی بہت سی آیات میں خاص و عام دونوں معنی سے آیا ہے۔ پس بن بیٹا اور پوتا اور پڑپوتا اور آل اور نسل کے معنی اور اخ بھائی اور خویش اور اقربا بھی معنے رکھتا ہے اور اہل زبان اور انجیل داں کو معلوم ہے کہ الفاظ بیٹا اور بھائی انجیل کے اکثر مقاموں میں عبرانی محاورہ پر

آئے ہیں اور لفظ پیدا ہوا بھی ایسے عام معنے آیا ہے یعنی کہ اس کی نسل سے ہے پس یہ ان اعتراضوں کا جواب ہے جن کو آپ الفاظ بیٹا اور بھائی کی نسبت بیچ میں لائے۔ ثالثاً یہ کہ آپ کہتے ہیں کہ ان تین تقسیم پر ہر ایک کے واسطے چودہ پشت نہیں آتی ہیں اور اس بات کو ایک بڑی غلطی بتاتے ہو۔ تو ظاہر ہے کہ متی حواری بھی کچھ عدد جانتا تھا اور پشتوں کا عدد اس طرح سے ہے کہ داؤد کا نام پہلے تقسیم کے آخیر اور پھر دوسری تقسیم کے شروع میں گننا چاہیے اور یہ اسی سبب سے ہے کہ وہ یہودیوں کا بڑا بادشاہ تھا اور اس کو یہ خاص وعدہ بھی دیا گیا تھا کہ مسیح اس کی اولاد سے پیدا ہوگا اور پشت اصل یونانی میں گہنیا ہے نہ صرف ایک شخص یا ایک نسل سے بلکہ دو اور تین شخص سے بھی مراد ہے۔ رابعاً رہی آپ کی ساتویں بات اور وہ یہ ہے کہ متی نے ابیود کو زور بابل کا بیٹا لکھا ہے حالانکہ اسی کے بیٹوں میں یہ کسی کا نام نہ تھا۔ تو آپ کی اس بات میں صرف اتنا ہی سچ ہے کہ اس کا ذکر توریت میں نہیں آیا۔ یہ کہ اس کا کچھ ایسا بیٹا یا پوتا یا رشتہ دار نہ تھا۔ آدم کے اور شیث اور انوس وغیرہ کے بھی سب بیٹوں کے نام مسطور نہیں ہوتے ہیں۔ دیکھیے پیدائش کے پانچ باب اور پھر وے سب نام جو زور بابل کے بعد مذکور ہیں۔ وے بھی توریت میں کہیں نہیں پائے جاتے ہیں۔ تو آپ کے قول کے موافق متی حواری نے ان کو بھی غلط لکھا ہوگا..." (۵۳-۵۴)

اس غیر معقول جواب کا ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے استدلال کے ساتھ ۸ر جولائی ۱۸۵۴ء کے چوتھے خط میں جواب الجواب دیا ہے۔

.... یہ قول آپ کا متی حواری نے اختصاراً لکھ کر کئی ایک نام قصداً چھوڑ دیئے الخ عذر بدتر از گناہ ہے کیونکہ اب تک ان پشتوں کا چھوٹ جانا صرف متی کے سہو پر حمل کیا جاتا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ متی نے پاس سخن کے لئے قصداً چھوڑے۔ لہذا کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اسی طرح اس نے پاس سخن کے واسطے بالکل انجیل تیار کی ہوگی۔ پس آپ نے بچارے متی کی دیانت میں فرق ڈالا۔ ستم یہ کہ آپ کے قول سے اور ایسا

ہی پانچویں آیت میں بھی سلموں کے بعد کتنے نام چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ آپ نے ذکر نہیں کیا اور آپ کی دریافت میں نہیں آیا۔ الخ آپ کی سعادت مندی ظاہر ہوتی ہے جو بچارے متی نے نہیں کیا وہ بھی آپ اس کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ اے صاحب اگر غلطی ہوئی تھی اور نام چھوڑے ہیں تو کتاب اول اخبار الایام کے مصنف نے کیونکہ اس کتاب کے دوسرے باب میں لکھا ہے۔ درس ۱۱ ناشوں کا بیٹا سلما اور سلمٰی کا بیٹا بوعز اور بوعز کا بیٹا اوبید اور اوبید کا بیٹا یشی اور یشی کا پہلوٹھا بیٹا الیاب، دوسرا ابی ناداب تیسرا شما چوتھا منا کبیل۔ پانچواں ردی چھٹا زورم۔ ساتواں داؤد۔ پس متی نے یہیں سے نقل کر لیا ہوگا۔ کیا آپ کے زعم میں متی نے عہد عتیق بھی نہ پڑھی تھی۔ ہاں اگر اعتراض ہے تو اس پر یہ ہے کہ چار سو برس کے عرصہ میں چار پشتیں ہوئیں اور یہ قیاس سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ البتہ ہارٹلی صاحب نے یہ تو لکھا ہے کہ متی نے بعد زور بابل کے لئے نام چھوڑ دئے ہیں۔ بست دیکم یہ کہ آپ کے اس قول سے کہ بن بیٹا پوتا اور پڑپوتا اور آل اور نسل کے معنی اور اُخ بھائی اور خویش اور اقربا بھی معنی رکھتا ہے" حضرت عیسیٰ کا مسیح ہونا بھی مشکل پڑا۔ کیونکہ عتیق سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسیح تو داؤد کے صلبی نسل سے ہیں اور جب یہاں بن کا لفظ ایسا عام ہو گیا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مسیح اور داؤد میں کہیں دور کا رشتہ ہوگا۔ بست و دیم یہ کہ قول آپ کا اور پشتوں کا عدد اس طرح سے ہے کہ داؤد کا نام پہلی تقسیم کے آخیر اور پھر دوسری تقسیم کے شروع میں گننا چاہیے" کچھ نیا جواب نہیں ہے۔ یہ تو اوروں نے بھی لکھا ہے۔ بلکہ ایسی پانچ توجیہیں اور بھی کی گئی ہیں کہ آپ کو نہیں معلوم بھلا یہ کیا جواب ہے کہ ایک شخص کو دو دفعہ گن کے عدد پورا کرنا چاہیے۔ ایسے تو تیرہ کے ۲۶ و انتالیس کیونکہ اس صورت میں دوسری قسمت میں جو یکنیا پر ختم ہوتی ہے پندرہ پشت ہو جاویں گے نہ یہ کہ قسمت سوم میں تیرہ کے چودہ ہوں اس سے بہتر تو میں تمہیں ایک توجیہ گھڑ دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ نے یوں کیوں نہ کہدیا کہ

عیسائیوں کے عقیدہ کے موافق مسیح میں دو صفتیں ہیں - الوہیت کی اور انسانیت کی -
لہذا ان کو دو پشتیں لکھنا چاہیئے پس اس صورت میں تیرہ کے چودہ ہو جائیں گی" (۱۷، ۲۷)
مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی اپنے خطوط میں جب بھی پادری فانڈر صاحب کو
یہ لکھا کہ تم نے انجیل میں آٹھ نو جگہ تحریف کو تسلیم کیا ہے تو انہوں نے اس کا یہی جواب دیا کہ آٹھ
نو جگہ نہیں بلکہ تین چار جگہ سہو کاتب کی وجہ سے تحریف ضرور ہوئی ہے - لیکن ان سے عبارت
کے مفہوم اور مطلب میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے - چنانچہ یہی بات پادری فانڈر صاحب
نے ڈاکٹر وزیر خاں کو لکھی - اس پر انہوں نے ۸ جولائی ۱۸۵۴ء کے خط میں حسب ذیل
مثالیں دے کر ثابت کیا ہے کہ مطلب ہی خبط نہیں ہوا بلکہ احکام کے سمجھنے میں فرق
پڑا ہے -

قول آپ کا (پادری فانڈر کا) باوجود سہو کاتبان کے انجیل اسی مضمون اور
مطلب پر ہے جو ہمیشہ تھی الخ عجیب حیرت افزا ہے کیونکہ ذرا خیال کرنے کی بات ہے
کہ جب کتب مقدسہ میں ایسے اختلافات عبارت کے جو آپس میں ایک دوسرے کے
مناقض ہیں پائے جاویں اور ان میں کسی کو بالجزم نہ کہا جا سکے کہ یہی اصل مصنف
کی عبارت ہے - بلکہ دونوں پر صدق اور کذب کا احتمال ہو تو بھلا اس صورت
میں اس مسئلہ پر کہ جس سے وہ عبارتیں متعلق ہیں - کیونکہ حکم قطعی ہو سکتا ہے لہذا بہت
سے مسئلوں میں شبہ رہا مثلاً حلت و حرمت کے مسئلے میں - اب نہیں معلوم ہو سکتا
کہ کون سے جانور بنی اسرائیل پر حلال تھے - آیا وے کہ جن کی پچھلی ٹانگیں اگلے
پاؤں سے لپٹی ہوئی تھیں یا وے کہ جنکی پچھلی ٹانگیں اگلے پاؤں سے لپٹی ہوئی نہ تھیں -
کس لئے کہ ورس ۲۱ باب ۱۱ کتاب احبار کی دو عبارتیں موجود ہیں - ایک وہ جو متن
میں ہے سو یہ ہے -

"پر تم سب رینگنے والے پرندوں میں سے جو چار پاؤں سے چلتے ہیں

اور ان کی پچھلی ٹانگیں اگلے پاؤں سے لپٹی ہوئی نہیں ہیں۔ وے اُن سے

کود کر زمین پر چلتے ہیں تم ان میں سے کھاؤ"

اور اس جملہ کے عوض اور ان کی پچھلی ٹانگیں اگلے پاؤں سے لپٹی ہوئی نہیں ہیں الخ عبرانی نسخوں کے حاشیہ پر اور نسخوں سے یہ عبارت لے کر لکھی ہے اور ان کی پچھلی ٹانگیں اگلے پاؤں سے لپٹی ہوئی ہیں اور اسی حاشیہ کی عبارت کو اب عیسائی لوگ ترجمہ کرتے ہیں چنانچہ ترجمہ انگریزی ٹھہری و ترجمہ ہندی و فارسی میں یہی عبارت ترجمہ ہوئی ہے۔ یا لونڈ کے مسئلہ میں کوئی شخص اسے آزاد کرے۔ آیا وہ شخص جس نے اسے اپنے لئے نامزد کر لیا ہے یا وہ شخص جس نے اسے نامزد نہیں کیا۔ کیونکہ کتاب خروج کے درس باب ۲۱ کی بھی دو عبارتیں منقول ہیں۔ ایک جو متن میں ہے وہ یہ ہے اگر وہ آقا اس کا جو اسے نامزد نہیں کر کے رہ گیا۔ ناراض ہو تو اس کا فدیہ وے کے الخ اور حاشیہ پر عبرانی نسخہ کے اور نسخہ سے یوں عبارت نقل کی ہوئی ہے۔ اگر وہ آقا اس کا جو اسے اپنے نامزد کر کے رہ گیا ناراض ہو تو اس کا فدیہ دے کے الخ اور یہی عبارت ترجموں میں لکھی جاتی ہے یا حضرت مسیح کے زانیہ عورت کو بے سزا دیئے چھوڑ دیئے جانے کا مسئلہ جو یوحنا کی انجیل کے آٹھویں باب میں مرقوم ہے کیونکہ اس میں بھی بہت سے اختلافات عبارت کے ہیں۔ بحدیکہ بہت سے علماء عیسائی نے ان درسوں کی صداقت پر گفتگو کی ہے اور اسی طرح سے اور بہت سے مسئلہ مشتبہ ہیں لیکن بخوف طوالت میں اُنہوں پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ پس آپ سے مجھے تعجب آتا ہے کہ باوجود ایسے اختلافات عبارت کے آپس میں متناقص ہیں۔ پھر آپ کس منہ سے کہتے ہیں کہ باوجود سہو کاتبان کے اب انجیل اسی مضمون اور مطلب پر ہے جو ہمیشہ تھی (۶۸-۶۹)

پادری فانڈر صاحب نے ان حقائق کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ تحریری مباحثہ کو ختم کرنے کے لئے ۱۶ ر اگست ۱۸۵۰ء کو حسب ذیل خط ڈاکٹر وزیر خاں صاحب کو

تحریر کیا۔

"پادری فانڈر صاحب ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب سے عرض کرتا ہے کہ میں نے اپنے اخیر خط میں اس بات کا اشارہ کیا اور اب صاف لکھتا ہوں کہ اس صاحب سے نہ کوئی اور خط قبول کروں گا نہ ان کو لکھ بھیجوں گا۔ کیونکہ صاحب موصوف غیر مناسب اور بیجا بات لکھنے سے دست بردار نہیں ہوئے بلکہ طعن و بہتان بھی علاوہ کیا پس اسکے لائق نہ ٹھہرے کہ آئندہ ان سے یہ رسم خط و کتابت جاری و برقرار رہے۔ لہذا اس کا خط بے کھولے اور بے پڑھے واپس کر دیتا ہوں۔ اور صاحب ممدوح پھر خط میرے پاس نہ بھیجیں کہ میں قبول نہ کروں گا۔ جو اس صاحب کے خط کا ضروری جواب تھا سو میرے آخیر خط میں ادا ہوا ہے اور اگر وہ صاحب چاہیں کہ اور جو کچھ لکھیں تو لکھ کر چھپوا دیں اور اگر جواب کے لائق ہوگا تو میں بھی چھاپے کی راہ سے جواب دوں گا۔" (۱۴۳)

اسی انداز کا جواب ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب نے ۱۷/ اگست ۱۸۵۴ء میں پادری فانڈر صاحب کو روانہ کیا۔

"سب اسسٹنٹ سرجن محمد وزیر خاں پادری فانڈر صاحب سے عرض کرتا ہے کہ اس نے تو کبھی کوئی بات بیجا یا نامناسب اول نہیں لکھی بلکہ صرف چند باتیں ایک عبارت کی بابت استفسار کی تھیں اور نہ کبھی اس نے اپنی طرف سے کسی سخت بات لکھنے میں تقدم کیا۔ ہاں جب فانڈر صاحب نے بیجا اور غیر مناسب بات کا لکھنا شروع کیا۔ اس نے بھی لاچار ہو کر کچھ سختی اختیار کی۔ چنانچہ یہ بات طرفین کے خطوط سے ہر شخص پر خوب روشن ہوگی اور حق یہ ہے کہ وہ عبارت مذکور جو پادری فانڈر صاحب نے رسالہ مباحثہ کے ۴۲ صفحہ میں لکھی ہے بے سند اور غیر واقع۔ لہذا اُن کے پاس اب کوئی جواب نہیں ہے۔ اس لیے یہ حیلہ نکال کر گفتگو کو موقوف کیا ہے۔ پس جواب دیتے سے جاری ہونا اور اسکے دفع کیلئے حیلہ نکال کے خط کو واپس کرنا اس سے سب اسسٹنٹ سرجن محمد وزیر خاں بڑا

سمجھتا ہے۔ گو یہ حیلہ سازی بھی پادری فانڈر صاحب کی کچھ کارگر نہ ہوگی کیونکہ ہر دانشمند اب بھی سمجھ لے گا کہ وہ صاحب موصوف جب سب طرف سے بند ہو اور اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو لاچار ہو کر اس آڑ میں آ چھپا اور اپنا پیچھا چھڑایا پس اس صورت میں سیا اسسٹنٹ سرجن محمد وزیر خاں بھی اس صاحب کا خط واپس کرتا ہے اور لکھتا ہے وہ صاحب بھی اب اسے کوئی اور خط نہ لکھے اور نہ وہ اس صاحب کو کچھ لکھے گا۔ کیونکہ اس صاحب نے آداب مناظرہ اور بھلے آدمیوں کی رسم کے خلاف کیا۔ لہذا ایسا نہ رہا کہ کوئی بھلا آدمی اسے کچھ لکھے یا اس سے کچھ بات کرے۔ ۱۱۶)

مسلمانوں کی طرف سے اس مناظرہ کی روئداد چھپنے کے بعد عیسائیوں کی طرف سے بھی روئداد چھپی۔ عیسائیوں کی روئداد تلاش کے باوجود بھی ہم کو دستیاب نہ ہو سکی۔ لیکن انہوں نے جس نظریئے سے شائع کی تھی اس کا پتہ دوسرے ذرائع سے لگ گیا کہ انہوں نے اپنی شکست کو تسلیم نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو شکست دینے کا اظہار کیا۔

ہندوستان کے ان نو پادریوں کے حالات (جنہوں نے ہندوستان میں دین مسیحی کی تبلیغ کی تھی) پادری برکت اللہ نے "صلیب کے علمبردار" کے نام سے تالیف کئے تھے جس کو عیسائیوں کی پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاہور نے شائع کیا تھا اسمیں پادری فانڈر کے حالات بھی چھپے ہیں جس میں اس مناظرہ کے بارے میں پادری فانڈر کی رائے نقل کی گئی ہے جو یہ ہے۔

"ایسٹر سنہ ۱۸۵۴ء میں آگرہ میں فانڈر کا معرکۃ الآرا مباحثہ علمائے اسلام کے ساتھ ہوا۔ فرنچ اس کا مددگار تھا۔ فانڈر اس مباحثہ کی بابت لکھتا ہے۔

"یہاں کے (آگرہ کے) علمائے اسلام دہلی کے علماء کے ساتھ مل کر

گذشتہ دو تین سال سے کتاب مقدس کا اور ہماری کتابوں کا اور مغربی علماء کی تنقیدی کتب و تفاسیر کا مطالعہ کر رہے تھے تاکہ وہ کتاب مقدس کو غلط اور باطل ثابت کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کے عالم مولوی رحمت اللہ نے دو کتابیں تصنیف کیں جنوری ۱۸۵۴ء میں جب میں یہاں نہیں تھا تو وہ آگرہ آیا تاکہ اپنے احباب کے ساتھ ان کتب کو چھپوانے کا انتظام کرے۔ اس اثنا میں وہ مذہبی گفتگو کے لئے فرینچ کے پاس چند دفعہ آیا اور مجھے نہ پاکر افسوس ظاہر کیا۔ جب میں آیا تو اس نے اپنے ایک دوست کی معرفت مباحثہ کے لئے کہلوا بھیجا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ مباحثوں کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ تاہم میں نے مباحثہ کا چیلنج منظور کر لیا۔ مباحثہ کی شرائط طے پائے کہ مولوی رحمت اللہ اہل اسلام کی طرف سے ڈاکٹر وزیر خاں کی مدد کے ساتھ مباحثہ کرے اور عیسائیوں کی طرف سے میں مسٹر فرینچ کی مدد سے مباحثہ کروں۔ مضمون زیر بحث یہ قرار پائے۔

(۱) آیا مسیحی کتب مقدسہ میں تحریف واقع ہوئی ہے اور وہ منسوخ ہو چکی ہیں یا نہیں۔

(۲) الوہیت مسیح اور تثلیث

(۳) رسالت محمدی۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

بحث دو دن تک ہوتی رہی۔ پہلے روز تقریباً ایک سو مسلمان علما، مولوی رحمت اللہ کی مدد کے لئے جمع تھے اور دوسرے روز اس سے دگنی تعداد تھی۔ دوسری صبح میری پہلی تقریر تھی اور میں نے کہا کہ قرآن انجیل کا مصدق ہے مولوی صاحب نے جواب دیا کہ قرآن مروجہ انجیل کا

مصدق نہیں کیونکہ وہ محرف ہے۔ میں نے کہا اچھا تم انجیل کو پیش کرو جو غیر محرف ہے اور جس کا قرآن مصدق ہے اور یہ بتاؤ کہ تحریف کب اور کہاں واقع ہوئی۔ مولوی صاحب سے اس کا جواب بن نہ آیا اور کہنے لگا کہ مغربی علماء مثلاً ہارن اور بائکلس وغیرہ خیال کرتے ہیں کہ انجیل میں اختلاف قرأت موجود ہے جس سے ظاہر ہے کہ انجیل محرف ہے میں نے جواب دیا کہ اختلاف قرأت سے تحریف لازم نہیں آتی۔ اس کا جواب مولوی صاحب نہ دے سکے میں نے کہا دونوں باتوں میں سے جو چاہو اختیار کر لو۔ یا تو اس امر کا اقرار کرو کہ انجیلی عبارت مصئون و محفوظ ہے اور جب الوہیت مسیح اور تثلیت پر بحث ہو تو ہمارے عقائد کی تائید میں اس عبارت کو مان جاؤ گے اور ثبوت پیش کرو جس سے یہ معلوم ہو سکے اور ہماری مروجہ انجیل کے الفاظ احکام اور عقائد انجیل کے ان نسخوں سے مختلف ہیں جو محمدؐ کے زمانہ سے پہلے موجود تھے۔ مولوی صاحب نے دونوں باتوں سے انکار کیا میں نے کہا آپ کے انکار کا یہ مطلب ہے کہ ہم مباحثہ نہ کریں۔ مولوی صاحب نے بحث ختم کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور جلسہ برخاست ہو گیا۔ اس پر اہل اسلام نے شور مچا دیا کہ ان کی فتح ہو گئی۔ مجھے یقین ذاتی ہے کہ گو جاہل مسلمان اپنی کم عقلی اور جہالت کی وجہ سے اس مباحثہ میں اپنی فتح تصور کریں گے۔ لیکن خدا اپنے طریقہ سے بہت لوگوں کو ہدایت پر لائے گا۔" (۱۵-۱۶)

یہ عبارت غالباً مناظرہ کی روئیداد کی نہیں ہے کسی اور بیان اور کتاب میں لکھی ہو گی۔ اس مناظرہ کی روئیداد میں پادری فانڈر صاحب نے بجائے آٹھ یا دس آیتوں کے

پانچ آیتیں محرف نہیں بلکہ مشتبہ ہونا تسلیم کی ہیں جس کی تردید میں مولانا رحمت اللہ صاحب نے پادری فانڈر اور پادری فرنچ کو خطوط لکھے جس کے جواب میں ان ہر دو پادریوں نے مولانا رحمت اللہ صاحب کو تحریری جواب روانہ کئے ۔ ان ہر دو حضرات کی چٹھیاں اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے خطوط چھاپنے اور عیسائیوں کے مناظرہ کی غلط کارروائی کا جواب دینے کے لئے ایک کتابچہ "محاکمہ" کے نام سے مولانا رحمت اللہ صاحب کے ایک شاگرد مولوی امین الدین ابن فرید الدین صاحب نے فخر المطابع دہلی میں باہتمام سید عبد اللہ صاحب طبع کرایا جو ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے ۔ جس کی دیباچہ کی عبارت اور ان ہر سہ حضرات کے خطوط کے اقتباس نقل کئے گئے ہیں ۔

"اپریل کے مہینے ۱۸۵۴ء مطابق رجب کے مہینے ۱۲۷۰ھ ہجری میں فی مابین جناب حامی دین متین ناصر شریعت سید المرسلین مولانا محمد رحمت اللہ صاحب بن خلیل الرحمن کیرانوی اور جناب کشیس فنڈر صاحب صاحب میزان الحق کے شہر اکبر آباد کے اندر مجمع عام میں مباحثہ دینی دو روز متواتر ہوا تھا اور خدا کے فضل سے دونوں روز برابر غلبہ اور حق جانب مولوی صاحب کے رہا تھا اور جناب کشیس نے بناچاری علی رؤس الاشہاد نسخ اور تحریف کا اقرار کیا تھا اور دونوں روز کی تقریر جانبین کو کئی شخصوں نے ضبط کیا ہے اور دو شخصوں کی تحریر جو بذات خود دونوں جلسوں میں حاضر تھے اور انہوں نے تقریر جانبین کو بکمال احتیاط ضبط کیا ہے اور بہت شخصوں ذی عزت اور ثقہ کی مہروں اور گواہیوں سے اپنی اپنی تحریر کی صداقت کو ثابت کیا ہے چھپ کر مشتہر بھی ہو گئی ہے ۔ منجملہ ان دو کے ایک تحریر جس کا نام مبحث شریف فی اثبات النسخ والتحریف ہے دہلی میں فخر المطابع ۔ کے اندر زبان فارسی سلیس میں چھپی ہے اور دوسری تحریر جو تالیف حافظ سید عبد اللہ

صاحب اسسٹنٹ مترجم سرکار کی ہے۔ اکبرآباد میں مطبع منبعیہ کے اندر اردو
زبان میں مطبوع ہوئی اور دونوں تحریروں سے حال واقعی ناظرین پر بخوبی
کھل گیا ہے اور انشاءاللہ اس رسالہ کے آخر میں اس پچھلی تحریر سے کچھ
عبارت بھی نقل کروں گا۔ مگر طرفہ یہ گل کھلا کہ جناب کشیس نے اپنی بدنامی کے رفع
کرنے کے لئے تحریر مباحثہ کو بالکل محرف کرکے اکبرآباد کے اندر سکندرہ کے چھاپہ خانہ
میں چھپواکر مشتہر کیا اور باوجود فضل و دانش کے یہ نہ سوجھی اس میں اور بدنامی
ہوگی اور اس سے ان کی بدنامی نہ مٹے گی اور جب تحریر محرف جناب
مولوی صاحب کی نظر سے گذری ان کو کمال تعجب ہوا کہ جناب کشیش سے
ایسی حرکت جو ذی عزت کے لائق نہیں۔ کس طرح سرزد ہوئی اور اس بات
میں ایک خط ۳ ذی حجہ سنہ ۱۲۷۱ھ پیر کے دن بسبیل ڈاک جناب کشیس کی خدمت
میں روانہ کیا اور جو اس کے جواب کے وصول میں موافق اس طریقہ کے جو
فیما بین ان کے اور جناب کشیس کے پہلے خطوں میں جاری تھا۔ دیر ہوئی تو
بیس دن کے بعد ۲۳ ذی حجہ سنہ الیہ میں اتوار کے دن معرفت جناب
مکرمت انتساب ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب صوفی کے ایک خط جناب کشیس
کی خدمت میں اور ایک خط جناب پادری فرنچ صاحب کی خدمت میں
جو مباحثہ کے جلسوں میں شریک اور معاون جناب کشیس کے تھے روانہ
کیا۔ بعد اس کے ۵ ذی حجہ سنہ الیہ میں منگل کے دن جناب کشیس
کا ایک خط لکھا ہوا گیارھویں ستمبر ۱۸۵۵ء کا جناب مولوی صاحب کے
پہلے خط کے جواب میں پہنچا اور بعد اس کے محرم کی آٹھویں ۱۲۷۱ ہجری
میں پیر کے دن دوسرا خط جناب کشیس کا جو ۲۷ ستمبر ۱۸۵۵ء کا لکھا ہوا
تھا پہنچا اور اس خط میں جناب کشیش نے مولوی صاحب کے دوسرے

خط محررہ ۲۳ رذی حجہ کو واپس کیا اور جناب فرنچ صاحب نے اب تک جواب نہیں لکھا ۔ ہم سب کو امید تھی کہ دونوں صاحب جواب معقول لکھیں گے لیکن افسوس کہ اس کے خلاف ظاہر ہوا کہ ایک صاحب نے تو کچھ جواب نہ دیا اور دوسرے صاحب نے ایک عذر ضعیف کو وسیلہ کر کے ان باتوں کے جواب سے جن کا جواب ان سے بڑی تاکید اور منت سے مطلوب تھا انکار کیا اور پہلے خط میں لکھا کہ "فی الحال خط اور کتابت کی راہ سے کوئی جواب نہیں دوں گا ۔ دوسرے خط میں لکھا ۔ مباحثہ کی بات چیت خط و کتابت سے نہ ہوگی اور وہ عذر ضعیف ان کا یہ ہے کہ جس کو میں نے ان کے پچھلے خط میں لفظ بلفظ نقل کرتا ہوں ۔ جب آپ کے سب رسائل و کتب جو آپ نے تالیف کیں اور تالیف کرنے پر ہیں منطبع ہو کر میری نظر میں آئیں گی میں بھی چھاپہ کی راہ سے جواب دوں گا ۔"

مولانا رحمت اللہ صاحب نے پادری فانڈر کو جو دوسرا خط ۳ رذی الحجہ کو لکھا تھا اس کے ضروری اقتباس یہ ہیں ۔

۳ رذی الحجہ کو ایک قطعہ عریضہ نیاز کا آپ کے رسالہ مباحثہ کے بیان حال میں بسبیل ڈاک بیرنگ روانہ کیا تھا ۔ جو تھانہ دار صاحب نے بکمال احتیاط اسی دن کے لفافہ روزنامچہ میں میرے آدمی کے سامنے ملفوف کر کے روانہ مظفر نگر کر دیا تھا ۔ تو اس لئے یقین کلی ہے کہ مظفر نگر سے آپ کی خدمت میں پہنچا ہوگا اور آپ نے اس کو لے لیا بھی ہے ۔ وگرنہ جو بیرنگ تھا یقیناً الٹا آتا ۔ مگر جو طریقہ جناب کا پہلے خطوط میں جو فیما بین میرے اور آپ کے جاری ہوئی تھی ۔ یہ تھا کہ میرے خط کا جواب ہاں یا نہ سے فی الفور عنایت ہوتا تھا اور میں نے اس عریضہ میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ بر تقدیر مہینے یا دو مہینے کی مہلت مطلوب ہو تو عنایت نامہ کے ذریعہ سے اس سے مطلع کیجئے گا کہ اس مدت

تک منتظر ہوں تو اس لحاظ سے کبھی یہ خیال آتا ہے کہ شاید سبب دیر کا یہ ہو کہ پتہ غریب خانہ گمنام آپ کے خیال میں نہ رہا ہو۔ لیکن یہ خیال بھی کچھ نہیں کیونکہ بڑی تصریح سے اس عریضہ کے آخر میں مرقوم ہے اور کبھی یہ وہم دل میں گذرتا ہے کہ شاید میرے عریضہ میں کوئی لفظ غیر مناسب آپ کے زعم میں معلوم ہوا ہو اور اس سبب سے خاطر مبارک مکدر ہوئی ہو۔ لیکن یہ وہم بھی بالکل ایک کچا وہم ہے اور کئی وجہ سے بطلان اس کا ثابت اول یہ کہ میں نے اپنی دانست میں ایک کلمہ بھی خلاف واقع اس میں نہیں لکھا اور سچ کبھی قابل اسکے نہیں ہوتا کہ اہل عقل اور ایمان اس سے مکدر ہوں ... پس ان وجوہ کا لحاظ کر کے سبب دیر کا مجہول الکیف اعتقاد کر کے مناسب یوں جانا کہ اس مضمون کو کچھ تفصیل دے کر پھر دوبارہ عرض کروں اور اب کی بار عریضہ نیاز کو معرفت جناب ڈاکٹر صاحب مخدومی سب اسسٹنٹ سرجن محمد وزیر خاں صاحب کی روانہ خدمت عالی کروں۔ لہذا ان کی معرفت روانہ کر کے بہت منت کرتا ہوں کہ جواب سے مشرف کیجئے اور جواب گول مول اور مہمل نہ لکھئے کہ مجھے پھر شکایت اس کی نہ کرنی پڑے۔ جیسے خط محررہ ۱۹۔ اپریل میں کرنی پڑی تھی اور اس طرح کی تحریر تو نشانی دغابازی اور جہالت اور اپنے عیب پوشی کی ہوتی ہے۔ خدا نہ کرے کہ آپ قصداً کبھی ایسے امر کو اختیار کریں۔ گو بعض اوقات بلا قصد اتفاقاً سرزد ہوا ہو اور حال واجب الاظہار یہ ہے کہ رسالہ عنایتی آپ کا جس میں آپ نے حال اس مباحثہ دینی کا جو فیما بین میرے اور آپ کے اپریل کے مہینہ سنہ حال میں وقوع میں آیا تھا ضبط کر کے چھپوایا ہے۔ معرفت جناب ڈاکٹر صاحب معظم الیہ کے میرے پاس پہنچا اور جب کمال شوق سے دیکھنے لگا تو اول صفحہ کے اندر عنوان میں یہ عبارت جو بمنزلہ بسم اللہ ہے۔ اس مباحثہ کا حال خیر خواہ ہند میں جو مرزا پور کا اخبار ہے مطبوعہ ہوا تھا اور پادری فانڈر صاحب کی معرفت کچھ تصحیح و تفصیل پا کر دوبارہ چھپنے میں آیا اور پھر یہ عبارت اسی صفحہ میں مرقوم ہے۔ اس کی (یعنی مباحثہ کی) صحیح اور مختصر خبر یوں ہے۔ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دل میں سمجھا کہ گو خیر خواہ ہند میں کہ فی الحقیقت اس کو بدخواہ ہند کہنا

چاہیئے۔ بسبب بدخواہی کے وہ حال انجیل اور خلاف واقع چھپا تھا مگر اب جو پادری صاحب نے اپنے اہتمام میں تصحیح کر کے چھپوایا ہے تو غالباً وہ خرابی اور اہمال اس میں نہ ہوگا۔ لیکن آگے بڑھ کر دیکھا تو معنوں کے خلاف عنوان کے پایا اور اس کے پڑھنے سے کمال تعجب ہے۔ خدایا جب صحت اور صدق پادریوں کا یہ ہے تو جھوٹ کیسا ہوگا کیا مہتمم کو اس دروغ بے فروغ اور اس بہتان سے شرم نہ آئی۔ کیا بدنامی سے نہ ڈرا۔ کیا خدا کا خوف یکلخت دل سے نکال پھینکا۔ افسوس افسوس صد ہزار افسوس کہ آدمی اس حیات ناپائیدار اور اس دولت سریع الزوال پر مغرور ہو کر کیا کیا کرتا ہے۔ رفع کرنے میری کے لئے صاحب بحث شریف نے کہ عزیز ول میرے سے ہے اور دونوں جلسوں میں موجود تھا کیا ہی بات برجستہ کہی کہ تو کیوں تعجب کرتا ہے اور دلگیر ہوتا ہے۔ دیکھ حضرات مسیحوں میں یہ تو ایک عادت قدیمہ ہے۔ دوسری صدی والوں نے ایک قاعدہ مقرر کیا تھا " راستی اور خداپرستی کی ترقی کے واسطے جھوٹ بولنا اور فریب دینا صرف جائز نہیں ہے بلکہ قابل تحسین کے ہے،، جیسا کہ موشیم مورخ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے اور ان حضرات نے قریب بچیس انجیلوں اور نامی مشاہدات جعلی بنا کر حواریوں اور تابعین حواریین اور اسقفوں مشہور کی طرف انکی نسبت کی تھی۔ اگر انیسویں صدی والے اسی قاعدے پر آنے کی اطاعت کر کے ایک دو رسالہ بنا ڈالیں تو کیا تعجب ہے۔ میں یہی سمجھا کہ یہ عزیز بات تو برجستہ کہتا ہے اور یہ بھی سمجھا کہ تیرا کیا بگڑا۔ نفس الامر میں پادری صاحب نے کچھ اپنا ہی کھویا ہے کہ جس نے اس رسالہ کو دیکھا تھت تھت کیا . . . میں نے اپنے خط محررہ ۲۳ اپریل میں آپ کی خدمت میں لکھا تھا کہ اگر آپ مباحثہ ضبط کر کے چھپوا دیں تو ضرور دو باتوں کا لحاظ رکھئے گا۔ ایک تو یہ کہ ہمارے معنی اصطلاحی نسخ کے جن کی تصریح تمام ہم نے جلسہ اول میں کی تھی۔ مشروحاً لکھد یجیئے گا۔ دوسری یہ کہ سب اپنے اور میرے خطوں کو جو گفتگو زبانی کے قبل اور بعد تحریر ہوئی ہیں چھپوا دیجیئے گا تا کہ ناظر اس کا خود ہی معلوم کرلے گا کہ کون غالب رہا

اور کون مغلوب اور کون خلاف ادب مناظرہ کی کہتا تھا اور کون اس کے موافق" اور پھر آپ نے کیوں اسکے موافق عمل نہ کیا" اور کیوں خطوط طرفین کو حرفاً حرفاً چھپوایا اور کیوں آپ نے میری اور ڈاکٹر صاحب کی تمام تقریر کو نہ لکھا۔ سچ تو یوں ہے کہ یہ امر خلاف قاعدہ صدی دوسرے کے آپ کس طرح کرتے، مگر الحمدللہ اس احتیاط نے سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہ دیا۔ بلکہ تمام حال واقعی رسالہ مبحث شریف فی اثبات النسخ والتحریف سے جو دلی میں چھپا تھا۔ اگر فرمائیے کہ ہم کو اختصار منظور تھا تو یہ عذر تو کچھ نہیں اس لئے کہ آپ نے اپنی تقریر میں ویسا ہی کیوں نہ اختصار کیا بلکہ برعکس اس کے بہت سی باتیں جن کا ذکر جلسے میں نہیں آیا تھا مثلاً صفحہ ۳ کی سطر ۶، ۷ اور سطر ۱۳ سے ۱۶ تک اور صفحہ ۴ کی سطر ۱ سے ۲ تک اور سطر ۷ سے ۱۵ تک سے البتہ اس پچھلی بات کو اپنے بعض خطوں میں لکھا ہے۔ مگر جلسوں میں آپنے بالکل اس طرح نہیں کہا اور صفحہ ۵ کی سطر ۱۱ سے ۱۶ تک اور صفحہ ۹ کی سطر ۲ سے ۹ تک اور اسی طرح اور جا۔ ثانیاً قریب ۲۱ صفحہ کی آپ نے تقریر کی تائید میں لکھا۔ اس صورت میں اگر ہماری سب تقریریں اور خطوط نقل کرنے میں رسالہ اور بڑھ جاتا تو کیا تو گیا ظلم ہوتا اور اس کی زلالت کی کیا شرح کروں کہ ایک بڑی کتاب بن جاتی ہے۔ خط میں سب کچھ مناسب نہ سمجھ کے بطور نمونہ کے آٹھ موضع نقل کرتا ہوں۔ بعد وصول جواب کے انشاءاللہ تعالیٰ جو کچھ عرض کرنا ہوگا مفصل عرض کروں گا۔

موضع اول یہ کہ قول پادری فرنچ صاحب صفحہ ۱۴۔ اور ۱۵ کے اندر یوں مسطور ہے کہ

"سب قدیم نسخہ مقابلہ کرنے سے اکثر غلطیوں کی تصحیح ہوئی یہاں تک کہ فی الحال صرف چار پانچ آیت مشتبہ رہی ہیں اور ان کے مضمون میں کوئی ایسی بات نہیں کہ انجیل کی کسی تعلیم یا گذارش یا امر و نہی کو خلل پہنچے۔"

اور آخر صفحہ ۱۵ میں بطور حاشیہ کے اس کے یوں ہے۔

"مباحثہ کے وقت میں آٹھ دس جا ذکر ہوا مگر زیادہ تحقیق سے معلوم ہوتا

ہے کہ آیات مشتبہ چار پانچ سے زیادہ نہ ہوں گی۔"

یہ بھی ایک نوع کی تحریف ہے۔ اس لئے مباحثہ کے وقت آپ کے اقرار کے موافق ہے۔ آٹھ دس کا ذکر ہوا تھا نہ چار پانچ کا پس نقل تقریر میں آٹھ دس کو چار پانچ کے ساتھ بدل ڈالنا صریح تحریف ہے جیسا کہ اکثر جا اس رسالہ میں آپ نے بھی یہی طریقہ برتا ہے۔ گو اس لحاظ سے کہ اس قول فرنچ صاحب کو صد آدمیوں نے سنا تھا اور اس کا بہت چرچا ہوا تھا اور جلسوں میں اور اسی طرح اپنے خطوں میں ہم نے اس کو کرات مرات نقل کیا ہے۔ آپ کو اس جا حاشیہ میں بطور عذر کے ظاہر کرنا پڑا اور قولوں میں جو اپنے زعم میں ایسا نہ دیکھا تو نقل انکی محرف پر اکتفا کیا اور اصل کو ہضم کر گئے۔ لیکن اس جا اگر بنا جاری کرنا تھا تو یوں چاہیئے تھا کہ نفس تقریر میں بعینہ قول فرنچ صاحب کو نقل کرتے پھر حاشیہ میں اس کا عذر کرتے۔ علاوہ اس کے اس جا ایک تحریف اور بھی ہے کہ فرنچ صاحب نے اس جا آٹھ دس مواضع کی نسبت لفظ تحریف اور تبدیل کا بولا تھا۔ چنانچہ بہت آدمیوں نے سنا ہے اور ان کو بخوبی یاد ہے پس لفظ تحریف اور تبدیل کی لفظ مشتبہ کو ذکر کرنا بھی ایک نوع کی تحریف ہے اور ان سے بھی قطع کر کے عرض کرتا ہوں کہ اب جواب عریضہ میں ارشاد کیجئے کہ وے چار پانچ آیتیں جو اب زیادہ تحقیق کے موافق مشتبہ ہیں کیا کون سی ہیں۔ مگر ارشاد آپ کا مفصل ہو اور ہرگز ہرگز اجمال کو کار نہ فرمائیے اس طور پر کہ فلانے انجیل یا نامہ یا مشاہدات کی فلانے باب کی فلانی آیت تمام یا اس قدر اور وجہ اور دلیل اشتباہ کی یہ ہے اور مختار ہمارے علمار کا یہ ہے اور وے چار پانچ آیتیں منجملہ آٹھ دس کے جنکو جلسہ میں فرنچ صاحب نے محرف بتلایا تھا اور اب آپ کی تحقیق زیادہ سے وے ایسی نہیں کونسی ہیں اور آپ کے علمار سے کس کس نے ان کو محرف مانا ہے اور دلیل محرف نہ ہونے کے موافق زیادہ تحقیق کیا ہے اور یہ مواضع محرف تو فقط عہد جدید میں ہیں تو اب بتلایئے کہ اس بڑی تحقیق کے موافق عہد عتیق میں کتنی ہیں مگر ان میں بھی وہی تفصیل لحاظ رکھئے گا جس کا ذکر اوپر گذرا کہ بعد اسکے جو مجھے عرض کرنا ہے کروں گا

اور اس امر کا آپ سے بھی طالب ہوں اور اسی امر کی میں نے اپنے خط محررہ ۱۹ اپریل میں درخواست کی تھی مگر اس وقت آپ نے پہلو تہی کی تھی۔ غالباً اس کا سبب یہی ہوگا کہ اس وقت آپ کو اس امر کی زیادہ تحقیق نہ ہوگی اور اب تو وہ سبب نہیں رہا اور آپ خوب تحقیق کر چکے ہیں پس اب تو آپ پر لازم ہے کہ اس کا بیان کر دیجئے ورنہ بلاشبہ ہم آپ کے عجز پر حمل کریں گے اور اگر یہ عذر ہو کہ خط میں اس بیان کی گنجائش نہیں تو ہم خط میں اس کی شرح نہیں چاہتے ایک چھوٹا سا رسالہ جداگانہ اس امر کے بیان میں لکھ کر بسبیل ڈاک عنایت کیجئے بہرحال اگر باتوں کا جواب دینا منظور نہ ہو تو آپ مختار ہیں مگر اس امر کا جواب دیجئے گا۔

موضع دوم صفحہ ۷ میں سطر ۲ سے ۷ تک یوں ہے۔

"مولوی صاحب نے مباحثہ کی دوسری بات شروع کر کے اپنا یہ دعویٰ کہ توریت و انجیل میں تحریف ہوئی پیش کر کے توریت کی کئی ایک گذارشات کی طرف اشارہ کیا مثلاً نوح کی مے نوشی اور ابراہیم کا بی بی کو بہن کہنا وغیرہ اور کہا اس طرح کی گذارش قابل اعتراض ہیں اور دلالت کرتے ہیں کہ توریت میں تغیر و تبدیل ہوئی۔"

کیونکہ گمان سے دور ہے کہ ایسی اصل توریت میں ہو اور یہ بات محض افترا اور بہتان ہے اور دوسرے مباحثہ کی بات ہرگز اس پر شروع نہیں ہوئی۔ بلکہ ایسی گذارشات کو ہرگز میں دونوں جلسوں میں اثبات تحریف کے لئے زبان پر بھی نہیں لایا۔ سبحان اللہ کیا دیانت کی ہے ہم کو امید نہ تھی کہ حضرات پادری خصوصاً آپ ایسے صفات کے ساتھ بھی متصف ہیں۔ مگر یہ امر بغایت بعید معلوم ہوتا ہے تو شاید یوں ہی ہو جیسے کاتبوں کے فساد سے قصداً سہواً بعضے جا عہد جدید اور عہد عتیق میں آیات کی آیات بڑھ گئیں اور بعضے جا گھٹ گئیں اور بعض جا لفظ کے لفظ اور جملے کے جملے بدل گئے اور موافق آپ کے مختار کے ایسے اختلافات کی نوبت عہد جدید میں تیس ہزار کو پہنچی تو اس رسالہ میں یہی کہ یقیناً اس کی محافظت میں محافظت مقدس

کتابوں کی نہ تھی۔ وہی فساد کاتب کا پڑا۔ اس نے یا تو قصداً یا سہواً صفحہ اول کے سطر ۲ میں آپ کا
"کر" بڑھادیا ہوگا یا اور کے نام کو آپ کے نام سے بدل ڈالا ہوگا۔ اور اگر نام آپ کا تصحیح ہو تو اس
کاتب یا مصحح ناخدااندیش نے آپ کے مسودہ میں تحریف کر کے بعضے جا سے سطریں کی سطریں نکال
ڈالی ہوں گی اور بعضے جامیں بڑھادی ہوں گی اور اس جا بھی سطر ۲ سے ۱۴ تک اسی ناخدااندیش
کی تحریف ہے وگرنہ جب دونوں جلسوں میں ایسی گذارشات بیان نہ ہوئی ہوں تو دلیل
بیانی کی ابتدا میں کہاں گنجائش اور آپ کا جواب جو اس کے بعد سطر ۵ سے ۱۴ تک مذکور ہوا
کہاں سے آیا۔ آپ کے مقدمہ ازالۃ الاوہام کے فائدہ اول کے اندر اس قسم کی پچاس ساٹھ
گذارشات الزاماً بایں الفاظ نقل کی گئی ہیں کہ پادری لوگ جو اپنے زعم میں بعض بعض روایتوں
حدیث یا آیتوں قرآن یا ذات خیر البشر صلعم پر کرتے ہیں۔ ان گذارشات خانگی اپنی کو بھی دیکھیں
اور ہرگز ازالۃ الاوہام میں بھی میں نے ان سب کو دلیل تحریف کی نہیں بنائی ہاں اس قدر ہے
کہ جب میرے نزدیک تحریف اور دلیلوں سے ثابت ہے۔ ان روایتوں سے بعض روایتوں
کو مثل اس کے لوط ع نے حالت نشہ میں اپنی دونوں بیٹیوں سے زنا کیا اور دونوں زنا سے
حاملہ ہوکر دو بچے جن بیٹھیں۔ جن کی بنی مواب اور بنی عماں اولاد ہیں جیسا باب ۱۹ انیسویں
پیدائش میں مرقوم ہے اور مثل اس کے سلیمان ع جن کو آپ بھی نبی مانتے ہیں بڑھاپے میں
بت پرستی کرتے تھے اور بت خانہ بنوائے اور بدی کر کے خدا کی نظر سے گر گئے جیسا باب
گیارھویں کتاب اول سلاطین میں ہے۔ اور مثل اس کے داؤد ع صاحب زبور نے اوریا کی جورو
پر عاشق ہوکر اس سے زنا کیا اور وہ زنا سے حاملہ ہوکر بچہ جنی اور اس کے خاوند اوریا کو
فریب سے لڑائی میں مروا ڈالا جیسا باب گیارھویں کتاب سموئیل میں ہے۔ یقیناً کاذب جانتا
ہوں غضب خدا کا جب نبی بت پرستی کرے اور بت خانہ بنوائے تو جھوٹ بولتے خدا پر
اس کو کیا لگتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شروع دوسری بات کے وقت اول آپ سے میں نے پوچھا تھا
کہ آپ کوئی قاعدہ بتلائیے کہ اگر اس کے موافق ہم تحریف ثابت کردیں تو آپ مان لیں۔ آپ نے

اس امر سے انکار کیا۔ پھر ایک بات اور پوچھی اس میں بھی آپ نے اغماض کیا کہ اسکے بعد میں نے والٹن اور ہارون کی تفسیروں سے نقل کر کے کہا کہ یہ مفسرین لکھتے ہیں کہ جناب جسٹیس شہید طریقوں کے مقابلہ میں دعوی کرتے تھے کہ یہودیوں نے کتب مقدسہ میں تحریف کی۔ اور مینیوس اور گریب اور سلز جیس اور ڈاکٹر اے کلارک، اور والی ٹیکر نے ان کی تصدیق کی ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا تھا کہ ان سے سہو ہوا۔ بعد اس کے میں نے تفسیر ہنری اور اسکاٹ سے نقل کیا کہ جناب اگسٹاین اور آپ کے جمہور علما، سلف مدعی تھے کہ بزرگوں کی عمر کے سالوں میں یہودیوں نے تحریف کی اس پر آپ نے بعد قیل وقال کے یہ فرمایا کہ ان سب کے قولوں سے مسیح کا قول معتبر زائد ہے اور آپ نے ان قولوں کو نقل کیا جو صفحہ آٹھ میں اس رسالہ کے لکھے ہیں۔ اس پر ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے قدح کر کے فرمایا کہ مسیح کی اس گواہی سے آپ کا مطلب نہیں نکلتا بلکہ فقط اتنا ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتابیں اس وقت میں تھیں جیسا کہ پیلی نے کہ آپ بھی اس کی کتاب کو معتبر سمجھ کر حل الاشکال میں اسنادی کتابوں میں گنتے ہیں۔ تصریح کی ہے اور اس جا ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر کو بسط کیا تھا جس کو آپ نے صفحہ نو میں ناقص طور پر نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں شہادت مسیح کی عام ہے اور ہم اس جا پیلی کو نہیں مانتے اور اس میں قیل وقال رہی۔ بعد اس کے ڈاکٹر صاحب نے آیت ۱۷ باب اول متی کی کہ یقیناً غلط ہے پیش کی۔ اس پر بعد قیل قال کے آپ نے فرمایا کہ غلطی اور چیز ہے اور تحریف اور چیز۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ کلام متی اگر وحی کے موافق ہے تو ممکن نہیں کہ اس میں غلط لکھا جاتا بلکہ کسی نے پیچھے سے غلط کر ڈالا اور اگر کلام متی موافق وحی کے نہیں تو ہم کو گنجائش ہے۔ اس پر آپ نے وہی جواب اول ارشاد کیا اور قیل قال ہوئی۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے آیت ۷ و ۸ باب ۵ نامہ اول یوحنا کی پیش کی اس پر بمقولہ قول مشہور "حق برزباں جاریست بلا تحاشی" آپ کی زبان مبارک سے نکلا کہ ہاں اس میں اور اسی طرح دو تین جا تحریف کے ہم بھی قائل ہیں اور جناب پادری فرنچ صاحب آپ کی شریک نے مقتضائے انصاف

اس نے بھی ترقی کر کے فرمایا کہ بلاشبہ تحریف و تبدیل کتب مقدسہ میں سات آٹھ جا اور اسی طرح سہو کاتب بہت جا واقع ہے۔ چنانچہ اسی وقت باشارہ مولوی امیر اللہ صاحب اور مولوی قمر الاسلام صاحب امام مسجد جامع کے منشی خادم علی صاحب مہتمم مطبع الاخبار نے ان تقریرات آپ کی اور آپ کے شریک کی کو قلمبند کیا اور ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آپ کے علماء سے بعض نے سہو کاتب ایک لاکھ پچاس ہزار اور بعض نے تیس ہزار لکھے ہیں۔ آپ کا مختار کتنا ہے۔ فرنچ صاحب نے ارشاد کیا کہ چالیس ہزار۔ اس پر قیل و قال ہوئی۔ اس پر آپ نے تین دفعہ مفتی ریاض الدین صاحب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ مفتی صاحب تمہیں انصاف کرو کہ ایسے امروں سے کتاب کے مقصود اصلی میں نقصان نہیں آتا۔ اس پر مفتی صاحب نے فرمایا کہ مجھ کو منظور نہ تھا کہ میں کچھ کہوں جب آپ نے ارشاد کیا تو کہتا ہوں کہ آپ فرمائیے کہ جس صورت میں مدعی کوئی دست آویز پیش کرے اور مدعی علیہ کہے کہ فی الحقیقت دست آویز اس کے پاس ہے مگر اس میں جعل ہو گیا ہے اور مدعی اس سے بھی انکار کرے اور اس پر مدعی علیہ اس کے بعض جعل کو پکڑے۔ اس پر مدعی کہے کہ ہاں یہ جعل میں نے کیا ہے مگر اصل مقصود میں جعل نہیں کیا تو وہ دست آویز سند رہے گی یا نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تم ہی کہو۔ مفتی صاحب نے اشارہ جناب اسمتھ صاحب کی طرف کر کے کہا کہ ہمارے حاکم صدر رونق افروز ہیں ان سے پوچھو مگر اسمتھ صاحب بہادر نے اس پر کچھ ارشاد نہ کیا۔ اس کے بعد مفتی صاحب نے کہا کہ ہمارے نزدیک تو وہ سند نہیں رہتی۔ پھر پوچھا کہ جو چالیس ہزار سہو کاتب آپ کے نزدیک مسلم ہیں۔ اس کے کیا معنی۔ آپ نے فرمایا۔ ان کے یہ معنی کہ بعض نسخوں میں ایک عبارت ایک طرح سے اور بعض نسخوں میں دوسری طرح سے واقع ہوئی۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ ہم ان اختلافوں سے مثلاً دو اختلافوں کو لے کر پوچھتے ہیں کہ آپ ان سے جزماً کہہ سکتے ہیں کہ یہ عبارت کلام اللہ ہے اور یہ عبارت نہیں آپ نے فرمایا کہ نہیں مفتی صاحب نے کہا جب آپ کے نزدیک سات آٹھ جا تحریف قصدی مسلم ہوئی اور چالیس ہزار اختلاف عبارت

ایسی نکلی نو مسلمانوں کا دعویٰ کچھ اس سے زیادہ نہیں۔ اس لئے وے اس قدر کہتے ہیں کہ اس میں تحریف ہوئی اور یہ مجموعہ مابین الدفتین سب کلام اللہ نہیں اور اس تقریر مفتی صاحب کو صدہا آدمیوں نے سنا ہے اور یہ چند امر میں نے اس موضع میں بطور اختصار ذکر کئے۔۔۔ جلسہ اول میں فقط تحریف کی بابت ظہور میں آئی تھی اور نسخ کی بابت اسی جلسہ میں اور تحریف کی بابت دوسرے جلسہ میں اور جو امر دو گھنٹہ تک مذکور ہوئے ہیں سب علاوہ اس کے ہیں آپ نے ایک کو بھی ان سے مفصل نقل نہ کیا بلکہ تحریف میں ایک قول فرضی میری نسبت کر کے اس کا جواب فرضی ذکر کیا۔ سبحان اللہ کیا اچھا اختصار ہے۔ کوئی خلاصہ کرنا اور مختصر کرنا آپ ہی سے سیکھے۔

موضع چہارم یہ کہ صفحہ ۲ میں ہے۔ مباحثہ ان باتوں کا پھر ہوا پہلے انجیل کی نسخ اور تحریف پر الخ یہ بات خلاف واقع ہے۔ کیونکہ گفتگو نسخ اور تحریف کی ساری مجموعہ بیبل پر تھی اور خطوط جانبین میں ہرگز تخصیص انجیل کی نہیں ہوئی اور آپ اپنی تصنیفات میں بھی ممتنع ہوتے نسخ کی سب کتب مقدسہ میں کیا عہد عتیق کی کتابیں کیا عہد جدید کی کتابیں قائل ہیں چنانچہ فصل دوسری باب اول میزان الحق کے عنوان میں یوں لکھتے ہو، دوسری فصل اس بیان میں کہ انجیل اور عہد عتیق کی کتابیں کسی وقت میں منسوخ نہیں ہوئی ہیں۔ پھر آخر صفحہ اس فصل میں ہے کہ پرانے اور نئے عہد کی کتابیں نہ منسوخ ہوئی ہیں اور نہ ہوں گی۔ البتہ جب ہم نے معنی نسخ بیان کئے اور آپ کو اس معنی کے موافق سوائے اقرار نسخ کے عہد عتیق کی کتابوں میں کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ اس پر آپ اپنے کو بچانے کے لئے عہد عتیق کی کتابوں کو چھوڑ کر عہد جدید پر آئے۔ اس پر میں نے اور ڈاکٹر صاحب نے بار بار کہا تھا کہ آپ تخصیص عہد جدید کی کیوں کرتے ہیں۔ چنانچہ دونوں جلسوں میں بکرات و مرات اس بات کو ہم زبان پر لائے تھے اور حاضرین نے اس کو سنا ہے اور خط ۱۶ اپریل میں میں نے آپ کو لکھا تھا۔

شرط دوم آنکہ کلام ما از اول بر مجموعہ بیبل است نہ فقط بر عہد جدید

ازیں جہت در ہر دو جلسہ بکرات و مرات ایں معنی بر زبان ہا میگذشت و
در خطوط فریقین ہم مباحثہ در مطلق نسخ و تحریر تقرار یافتہ نہ در نسخ و تحریف عہد جدید
فقط لہذا گذارش آنست کہ تا اختتام مباحثہ دراں دو مسئلہ مذکورہ ہرگز
تخصیص عہد جدید از جانب سامی نشود"

اور آپ نے اس کے جواب میں اگرچہ اس شرط کو نہیں مانا تھا مگر اس کا انکار نہیں کیا تھا کہ
کلام اول میں مجموعہ بیبل پر نہ عہد جدید پر

موضع پنجم یہ ہے کہ پھر صفحہ ۲ میں اور سطر اول صفحہ ۳ میں ہے۔

"پہلے دن کا مباحثہ اس طرح شروع ہوا کہ پادری فانڈر صاحب
نے حاضرین سے وے مطالب اور قاعدے بیان کئے جن پر رضائے طرفین
قرار پا چکی تھی بعد اس کے مولوی صاحب سے عرض کی کہ ان دلیلوں کو
پیش کیجئے جن کے مطابق آپ کتب انجیل مقدس کو منسوخ جانتے ہیں
یہ کلام مجمل اور موہم خلاف واقع ہے۔ اس کے مطالب اور قاعدہ کا ذکر اس میں مجمل ہے۔
اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ بعد اس بیان کے اول کلام جو شروع ہوا یہی تھا کہ آپ نے میرے سے
مطالب ان دلیلوں کی کی جن کے مطابق ہم انجیل کو منسوخ جانتے ہیں حالانکہ حقیقت یوں
ہے کہ اولاً آپ نے بیان مطالب کا مطابق اپنے خط محررہ ہفتم اپریل کے کیا اور مباحثہ مطلق
نسخ اور تحریف میں بیان کیا اور ہرگز تخصیص عہد جدید کی اس بیان میں آپ سے سرزد نہ ہوئی
اسی سبب سے ہم نے اس وقت کچھ قدح نہ کی تھی اور عبارت آپ کے خط کی یوں ہے۔

"گفتگوئے مسائل متنازعہ بدیں ترتیب خواہد بود کہ اولاً چنانچہ مقصود
سامی است بر نسخ و تحریف والوہیت و تثلیث آنجناب معترض و بندہ مجیب منا
بعد کہ نبوت پیغمبر اسلام بندہ معترض و آنجناب مجیب خواہند بود"

اس رسالہ میں یہی چاہیے تھا کہ اولاً بیان ان مطالب کا ذکر کر دیتے تا کہ کسی کو دھوکا نہ ہوتا۔

جب آپ اس بیان سے فراغت پا چکے اول کلام میں نے شروع کیا اس طور پر کہ آپ فصل دوسرے باب میں میزان الحق کے اول صفحہ ۱۴۸ کے اندر لکھتے ہیں :۔

"اس باب میں قرآن اور اس کے مفسرین دعوی کرتے ہیں جس طرح زبور کے آنے سے توریت اور انجیل کے ظاہر ہونے سے زبور منسوخ ہوئی اسی طرح انجیل بھی قرآن کے ظاہر ہونے سے منسوخ ہو گئی"۔

پھر صفحہ ۲۶ میں یوں لکھتے ہیں :

"پھر اس حالت میں محمدیوں کا دعوی بے اصل اور بے جا ہے جو کہتے ہیں کہ زبور توریت کو اور انجیل دونوں کو منسوخ کرتی ہے"۔

پس ان عبارتوں کے موافق آپ مدعی ہیں کہ قرآن اور اسکی تفسیروں میں مذکور ہے کہ زبور ناسخ توریت کی اور منسوخ انجیل سے ہے۔ آپنے یہ بات قرآن کی کس آیت میں دیکھی ہے اور اسی طرح کس تفسیر میں ہے۔ اس لئے قرآن میں کہیں اس امر کا ذکر نہیں اور تفسیروں اور کتب اسلامی میں اس کے خلاف پایا جاتا ہے اور اس کے بعد میں نے عبارت تفسیر عزیزی اور تفسیر حسینی اور شرح قصیدہ ہمزیہ کی پڑھی جس کی نقل مبحث شریف میں ہوئی اور اس پر آپ سے سوا تسلیم اپنی غلطی کے کچھ نہ بن آیا اور اس کو غلط ماننا پڑا۔ بعد اسکے میں نے معنی نسخ مصلح اسلامی کے بیان کئے پھر اس پر کلام اور شروع ہوا اور ظاہر ہے کہ جب سرے سے دعوی غلط نکلا تو اس پر جو آپنے نو صفحہ کے اپنے زعم میں دلیلیں لکھی ہیں جو قبیل بنا فاسد علی الفاسد سے ہیں۔ سب عبث اور بے ہودہ ہیں۔ اس لئے آخر گفتگو نسخ کی میں نے عرض کیا تھا کہ یہ نو صفحے جو آپ نے لکھے ہیں۔ واجب الاخراج ہیں۔ ان کو نسخ مصطلح اسلامی سے کچھ علاقہ نہیں اور پھر عرض کرتا ہوں کہ اگر لاعلمی معنی نسخ میں آپ سے وہ تحریر ہوئی آپ معذور تھے مگر جواب ان معنوں سے واقف ہو کر وہی طعن کرو گے تو معذور نہ ہو گے اور ان نو صفحوں کو نکال پھینکئے۔ آئندہ آپ مختار ہیں۔

موضع ششم صفحہ اٹھارویں میں سطر ۱۴ تک یوں ہے۔

"مولوی صاحب نے ایک طویل خط لکھا جس میں انہوں نے مباحثہ کی بابت چار نئی شرطیں پیش کیں۔ ان میں سے پہلی شرط یہ تھی کہ طرفین کے بیان وکلام قلمبند ہوں اور ایک دوسرے کی نوشتہ کی صحت پر دستخط کردے۔ پادری صاحب نے منظور کیا۔ لیکن جب مولوی صاحب نے مباحثہ کے احوال کا اپنا احوال اس کے پاس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گذرانا کہ دستخط کرے تو اس لحاظ سے کہ بیان مباحثہ بالکل ایک طرف کا تھا اس کو دستخط سے انکار کرنا پڑا اور اسی طرح مولوی صاحب کو پادری صاحب کا بھی بیان منظور نہ ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ اس شرط پر عمل کرنا امر محال ہے"

میں نے اسی خط محررہ ۱۶ اپریل میں صاف لکھا تھا کہ جو دونوں جلسوں میں کہ ہمارے کلام سے آپ کی مفید ہو۔ آپ اس کو لکھ کر پیش کریں کہ ہم اس پر دستخط کردیں، اور جو آپکے اور پادری فرنچ صاحب کے کلام سے اپنے حق میں مفید سمجھیں لکھ کر پیش کریں۔ آپ اس پر دستخط کردیں پس اگر میں نے بعد اس کے بعض باتیں اپنے مفید مطلب لکھ کر استدعا دستخط کی تھی تو کیا خلاف مناظرہ کیا تھا اور میں نے آپ کی تحریر پر دستخط کرنے سے انکار نہیں کیا تھا مگر نوجا اس میں اجمال تھا اور اس سے وہ مطلب نہیں کھلتا تھا جن کا ذکر جلسوں میں آیا تھا تو میں نے اپنے خط محررہ ۱۶ اپریل میں ان کی تشریح چاہی تھی اور آپ نے نہ کی پس الزام آپ کے ذمہ ہے نہ میرے۔ قطع نظر اسکے آپ میرے اس بیان کو ایک طرفہ لکھتے ہیں نہ غلط اور آپ نے آگے بھی اس کے جواب میں کسی امر میں قدح نہ کی تھی کہ یہ غلط ہے۔ پس یہ دلیل ہے کہ صداقت اس کی آپکے نزدیک مسلم تھی۔ پس میں پوچھتا ہوں کہ جب وہ آپ کے نزدیک صحیح تھا وقت نقل گفتگو فریقین کی اس سب کو آپ نے کیوں نہیں نقل کیا اور عبارت میرے خط محررہ ۱۶ اپریل کی جس کا آپ حوالہ دیتے ہیں یوں ہے :۔

پس بنظر حسن ضبط میخواہم کہ ہرچہ در دو جلسہ از اقرار و کلام ما مفید
سامی باشد نوشتہ پیش فرمائید کہ ما بلا عذر دستخط خویش براں ثبت کردہ
دہیم و ہرچہ از کلام جناب و پادری فرنچ صاحب مناسب دانیم نوشتہ پیش کنیم
آنجناب و پادری صاحب ممدوح آنرا اندستخط خویش مزین فرمایند مثل آنکہ
مولوی جناب کو در عنوان فصل دوم میزان الحق مرقوم است درباں نسبت
بسوی قرآن و تفاسیر فرمودہ اند غلطست و غلطی آں مسلم جناب شدہ و مثل
آنکہ جناب امکان نسخ مصطلح اہل اسلام را پذیرا کردہ باں معنی معترف
نسخ در توریت شدہ و تسلیم منسوخیت توریت دراں مجمع چند بار بر زبان مبارک
گذشتہ و کلام سامی اگر بود ہمیں بود کہ انجیل موافق قول جناب مسیح کہ ما
آنرا خاص و جناب آنرا عام میدانند منسوخ نخواہد شد مثل آنکہ ہمراں جلسہ
پادری فرنچ صاحب از جانب سامی ہفت ہشت جا در کتب مقدسہ
اقرار تحریف نمودہ و آنجناب رضائی خود براں ظاہر فرمودہ اند و مثل آنکہ
ہمدراں جلسہ پادری صاحب ممدوح بر وفق مذہب مختار خود بجہل ہزار امر
کہ ما او را بہ اختلاف عبارت و آنجناب بہ سہو کاتب تعبیر نمودہ اعتراف
نمودہ اند و مثل آنکہ در جلسہ دومی آنجناب سہو کاتب در کتب مقدسہ تسلیم
فرمودند و بعد التماس تفسیر آں سہو چنیں ارشاد کردند کہ ایں ہمہ امور یعنی
کسے حاشیہ گرفتہ را داخل متن کردہ باشد یا آیات را افزودہ یا
آیات را برانداختہ و ایں قسم تصرف در آیات پنج شش جا خواہد بود
یا بعض لفظ بعض تبدیل ساختہ و ایں بسیار جاست یا تفسیر لفظی
از جانب خود دراں افزودہ و ایں عام است کہ درج و افزودن و برانداختن
و بدل کردن قصداً باشد یا سہواً یا از روئے غلطی و نادانی نزد ما داخل

در سہو کاتب اند و مانند ایں امور یک دو امر دیگر ہم اند کہ بر وقت پیش کردن فرد بنظر مبارک خواہند گذشت "

علاوہ اس کے آپ کے اس قول سے۔

"پادری صاحب نے منظور کیا۔ لیکن جب مولوی صاحب نے مباحثہ کے احوال کا اپنا بیان اس کے پاس گذرانا الخ"

ظاہر میں یوں سمجھا جاتا ہے کہ اولاً میں نے خط میں درخواست کی اس پر آپ نے اس کو منظور کیا۔ بعد اس کے میں نے بیان مباحثہ کا ضبط کر کے پیش کیا حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ نوبت پیش کرنے اس بیان کی نہیں آئی اور فقط پانچ امر جو بطرز نمونہ کے شرط اول کے بیان میں اس خط کے اندر آپ کی نظر سے گذرے انہیں دیکھ کر آپ گھبرا گئے تھے اور بسبب قطع ہو جانے گفتگو کے فرد بیان مباحثہ کی جس کا وعدہ اخیر شرط اول میں تھا پیش نہیں ہوئی پس ایسی گول عبارت جو خلاف واقع کو موہم ہو آپ کو لکھنی مناسب نہ تھی۔

موضع ہفتم صفحہ ۱۳۱ کی سطر ۴ و ۵ میں یہ ہے:-

"پھر اب بھی انجیل کے ایسے نسخے اصل زبان یونانی میں موجود ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پیشتر با دست و قلم لکھی ہوئی ہیں"

یہ ایک دعویٰ محض بے دلیل تھا جیسا اسکا بیان مفصل کتاب اعجاز عیسوی کے مقصد دوسرے کے آخر میں ہوا ہے اور میں نے نوبت اس دعوے پر قدح کر کے آپ کو اپنے خط محررہ ۱۹ را پریل میں تاکیداً لکھا تھا کہ اگر آپ کے پاس اس امر کی کوئی دلیل ہو تو پیش کیجیے کیونکہ بعض کتب اسناد آپ کے مذہب کی جو ہمارے پاس موجود ہیں ان میں ہم نے اس امر کو دیکھا ہے مگر ہم کو کوئی دلیل ایسی نہیں ملی کہ اس پر اعتماد کیا جاوے اور آپ نے اس کے جواب میں کوئی دلیل نہ لکھی بس معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اس امر کی دلیل نہیں۔ بلا دلیل اغوائے عوام اور ناواقفوں کے لیے آپ اپنی تصنیفات میں لکھتے ہیں۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ سے پیشتر یا دست وقلم لکھی ہوئی ہیں"۔
ایسی بے سند اور ایسی بے ٹھکانی بات کوئی احمق یا ناواقف ہی تسلیم کرے گا اور بس۔
موضع ہشتم دیریوس ریڈنگ کے حق میں جس کا ترجمہ آپ نے جلسہ اور صفحہ ۲۱ و ۲۲ ر
اس رسالہ میں کاتبوں کے سہو اور غلطی کے ساتھ کیا ہے۔ آپ نے ناحق کئی صفحے سیاہ کئے اور
ایک بات بھی کام کی نہ لکھی اور میں نے اسی خط محررہ ۱۹ اپریل میں آپ سے پوچھا کہ تعریف
اس کی کیا ہے اور اراٹہ میں فرق ہے یا نہیں۔ آپ کو اس کے بیان میں لازم تھا کہ تعریف
اس کی کرکے اسمیں اراٹہ میں فرق بتلاتے یا پسند معتبر ثابت کرتے کہ دونوں ایک ہی چیز
ہیں۔ لیکن آپ نے ان دونوں امروں سے ایک امر بھی نہ کیا اور بالکل اس بیان سے اعراض
کرکے بیانات فضول میں صفحے کے صفحے کالے گئے اب تھوڑا تھوڑا عرض کرنے میں خط بڑھ
گیا ہے۔ اس لئے اور عرض سے اعراض کرکے گذارش کرتا ہوں کہ ضرور جواب سے یاد فرمایئے گا
اور ہمیشہ مجھ کو کارو خدمات لائقہ سے آگے کو بھی یاد کرتے رہیئے گا۔ زیادہ نیاز محررہ ۲۲ ذی الحجہ
۱۲۷۰ھ ہجریہ مقدسہ نقل مہر رحمت اللہ ۱۲۶۱ھ۔ مقام کرانہ ضلع مظفر نگر سے

پادری فانڈر نے بائیس دن کے بعد ۱۱ ستمبر ۱۸۵۴ء کو مولانا رحمت اللہ صاحب
کے ۲ ذی الحجہ کے خط کا جواب دیا جو ۲۳ ذی الحجہ کو روانہ کیا تھا۔

نامہ سامی مورخہ ۲ ذی الحجہ پہنچا اور بندہ اس کے مضمون سے آگاہ ہوا کہ خلاصہ اس کا
یہ ہے کہ آپ کی دانست میں میں نے مباحثہ بعینہ بیان نہیں کیا اور اس بات کا میں کچھ
تعجب نہیں کرتا کہ مباحثہ کا میرا بیان آپ کے نزدیک معقول نہیں ہے مگر آگے ہی سے مجھے
یقین تھا کہ آپ ویسا ہی کہو گے کیونکہ مباحثہ کے بعد بھی آپ نے اپنے خط مورخہ ۱۶ اپریل
میں اس کے گذارش مطالب ایسے طور پر بیان کئے کہ مجھے ان کے انبال اور دستخط کرنے سے
انکار کرنا پڑا۔ اور جب اس کے جواب میں میں نے مباحثہ کی بات جیسے میری اور پادری فرنچ
صاحب کی دانست میں انجام پائی مسطور کی تو آپ نے اس کو پسند نہیں کیا۔ پس اب بھی وہی حال

ہے یعنی آپ کہتے ہیں کہ ہمارا بیان غیر صحیح ہے اور ہماری دانست میں آپ نے اس خط میں بھی کئی جگہ خلاف واقع بیان کیا۔ مثلاً بزرگوں کی عمر کے سالوں کی تحریف کا ذکر کہ آپ کہتے ہیں کہ میں نے کیا ہے۔ پھر یہ کہ آپ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے سہو کاتب ڈیڑھ لاکھ اور پھر تیس ہزار سے بتایا ہے۔ ہمارے علمار کے قول پر یہ سب میری دانست میں اس صاحب سے مباحثہ کے وقت ذکر نہیں ہوا۔ یا اگر ذکر ہوا تو مجھ سے نہیں کہا گیا اور میرے سننے میں نہیں آیا پھر اس بات کو بھی جو میرے اور مفتی صاحب کے درمیان ہوئی۔ آپ نے صحیح نہیں لکھا۔ میں نے مفتی صاحب کو تم سے نہیں بلکہ جیسا کہ چاہیئے آپ سے مخاطب کیا۔ پھر اس گفتگو کو صدہا آدمیوں نے نہیں سنا جیسا کہ آپ کہتے ہیں بلکہ محض انہی دس پانچ اشخاص نے جو مفتی صاحب کے اور میرے پاس بیٹھے تھے کیونکہ وہ گفتگو خاص مفتی صاحب سے ہوئی تھی نہ عام جلسہ سے اور پھر خود گفتگو کی باتوں میں آپ نے مبالغہ اور علاوہ بھی کیا ہے۔ آپ جو کہتے ہیں کہ میں نے مباحثہ کی سب گذارشات نہیں لکھیں تو یہ درست ہے میرا مطلب یہ نہ تھا کہ سب لفظاً لفظاً لکھوں قطع نظر اس سے کہ ایسے مباحثہ کی سب باتیں لفظاً لفظاً یاد رکھنا بہت مشکل ہے بلکہ میرا مقصد یہ تھا کہ مباحثہ کو اختصاراً لکھوں چنانچہ اس کے مقدمہ میں بھی میں نے کہا ہے۔ لہذا ان سب باتوں کا ذکر بلکہ اشارہ بھی نہیں کیا جو مباحثہ کے مطلب سے خارج ہیں۔ مثلاً آپ کا وہ قول اور بیان کہ میں نے میزان الحق میں کہا قرآن اور اسی کے معتقد دعوی نسخ کتب مقدسہ کرتے ہیں اور آپ نے کہا کہ کوئی ایسی بات قرآن میں نہیں ہے (اور جواب اس کا میں نے اپنے خط مورخہ ۱۸ اپریل سنہ حال میں آپ کو لکھا تھا اور پھر وہ اعتراض جو ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے بھی متی کے پہلے باب کی بعض آیات کے مضمون پر پیش کیا تھا وغیرہ کہ نہ نسخ اور نہ تحریف سے کچھ علاقہ رکھتی ہیں اور جہاں آپ کے اعتراضات مباحثہ کے مطالب کے موافق اور مطابق تھے۔ وہاں بھی میں نے سب اختصار کے سبب صرف اصلی مطلب کو ذکر کیا ہے اور بس۔ اور مطلب اور زیادہ

واضح کرنے کے لئے میں نے بعض جا ایسی بات علاوہ بھی کی جو مباحثہ کے وقت ذکر نہیں ہوئی مثلاً وہ باتیں جو حلقہ میں ہیں۔ پھر یہ کہ میں نے بعض جگہ صرف انجیل کا لفظ کہا اور مباحثہ کے وقت بھی بعض دفعہ صرف انجیل کا ذکر کیا ہے تو یہ اس کے سبب سے نہیں کہ گویا مجھے یاد نہیں تھا۔ کہ مباحثہ نسخ و تحریف کا نہ محض انجیل بلکہ سارے مجموعہ بائیبل پر ٹھہرا تھا بلکہ میں نے اس واسطے بعض مقام میں صرف انجیل کا ذکر کیا کہ اصل مباحثہ انجیل پر ہوا تھا اور میں نے مباحثہ کے وقت کہا تھا کہ مباحثہ اول انجیل پر ہو اور اس کا یہ سبب بتایا کہ اگر انجیل کا غیر صحیح ہونا ثابت ہو تو پھر توریت پر مباحثہ کرنا لازم نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ اگر بالفرض انجیل غیر حق ہو تو عیسائیوں کو توریت سے اور کیا کام ہوگا۔ پھر یہ کہ میں نے لکھا کہ مباحثہ کی دوسری بات کے شروع کرنے میں آپنے نوح اور ابراہیم وغیرہ کی گذارشات کی طرف اشارہ کیا اور آپ کہتے ہیں کہ ایسی گذارشات کو ہرگز میں دونوں جلسوں میں زبان پر نہیں لایا تو گو آپنے لفظاً نہیں کہا جیسا میں نے لکھا پھر اس بات میں مجھے اور پادری فرنچ کو بھی کچھ شبہ نہیں ہے کہ آپ نے توریت کی ایسی ایسی گذارشات کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہی میرا مطلب ہے۔ پس میں نے غیر حق یا جھوٹ کہاں سے لکھا۔ یہ صرف آپ ہی کی سمجھ ہے اور بس اور آپ کے اشارہ پر ان باتوں کو یاد کر کے جن کو آپ نے اپنی کتاب ازالۃ الاوہام کے ۲۸ صفحہ سے توریت کی انہیں گذارشات کے حق میں تفصیلاً لکھا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ایسی باتیں مباحثہ کے مسئلہ سے باہر ہیں اور کہ ایسے اور آپ کے سب اور اعتراض کہ واسطے جن کو آپنے توریت کی تحریف اور غیر حق ہونے کی بابت ظاہر کیا اور ظاہر کیا چاہتے ہیں مسیح کی گواہی توریت کی صحت اور حقیقت پر کافی وافی جواب بھی اور آپ کے دو وزیر خاں صاحب کے اور اعتراض جو اس سبب سے مذکور نہیں کئے کہ ان کو عمدہ نہیں جانا اور مباحثہ کے وقت بھی میں نے کہا تھا جسٹیس سے سہو ہوا اور یہ دعوی کہ یہود نے توریت کو مسیح کے بعد تحریف کیا میرے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہے۔ پھر یہ کہ میں نے ۲۰ صفحہ میں لکھا ہے کہ مولوی صاحب

نے غیر مناسب الفاظ لکھے۔ الخ"

اور اس کے جواب میں آپ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی دانست میں کوئی غیر مناسب لفظ نہیں لکھا الخ اور اس کا ثبوت چاہتے ہو پس ثبوت اس کا یہ ہے کہ آپ نے اپنے خط مورخہ ۲۳ر اپریل کے شروع میں مجھے لکھا کہ آپ گفتگو موقوف کرنے کو ایک عذر کچا بار بار زبان پر لاتے ہیں" پھر اس خط کے بیچ میں آپ نے یوں لکھا کہ "آپ نے ایک عذر پوچ بے حیلہ قطع کرنے گفتگو کا اٹھایا ہے" اب عذر پوچ اور حیلہ ہماری طرف منسوب کرنا کیا یہ غیر مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ اگر ایسے الفاظ عمل میں لانا آپ کے نزدیک مناسب لائق ہیں تو یہ آپ ہی کا انصاف ہے اور پس اوسپر بھی حال یہ ہے کہ میں نے نہیں بلکہ آپ نے گفتگو کو موقوف کیا اور اس خط کے اسی مقام میں یوں لکھا کہ "یہ ہمارا آخری خط ہے ہم تو اس کے بعد کوئی خط نہیں لکھیں گے" اور "اب لکھنے گا کیا آپ کو اپنی باتیں یاد نہ رہیں۔ یا اپنے خط میں یہ لفظ نہیں دیکھے اور آپ کے خط کی اور باتیں جو ہیں سو ان کے جواب لازم نہیں جانتا اس واسطے کہ میں نے سنا کہ آپ مباحثہ کی گزارش کو تفصیلاً چھپوا رہے ہیں اور ڈاکٹر وزیر خاں صاحب بھی اس کام میں مشغول ہیں۔ پس جب یہ اور آپ کی اور کتابیں جن کا ذکر آپ نے ازالۃ الاوہام میں کیا طبع میں آویں گی اور میں ان سب کو دیکھوں گا تب اگر خدا زندگی بخشے میں مباحثہ کی کتاب کا دوسرا حصہ تمام کر کے اور پہلا حصہ اس کے ساتھ از سر نو چھپوا کر جوابات جو ان کے لازم و لائق ہوں گے۔ خدا کی مدد سے اس کا جواب ادا کروں گا اور آپ کے پاس بھی بھیجوں گا مگر فی الحال خط و کتابت کی راہ سے کوئی اور جواب نہیں دوں گا سوا اسکے جواب دیا گیا فقط آپ کی کتاب ازالۃ الاوہام فرصت پا کے فی الحال تامل سے دیکھتا ہوں اور آپ کا ابطال التثلیث دیکھ چکا ہوں مگر اس میں کچھ اور بات نہیں پائی مگر وہی جو مصنف کتاب کشف الاستار نے بھی لکھا اور جس کا جواب میں نے حل الاشکال میں دیا ہے۔ آپ نے صرف اس کی بات کچھ کم و بیش کر کے مکرر کی اور کچھ بے جا اور بے مناسب باتیں علاوہ کی ہیں۔

مثلاً وہ جو آپ نے ۳۵ و ۳۶ صفحوں میں رومن کا تھلک کے حق میں لکھی ہیں۔ وغیرہ چنانچہ آئندہ بیان کیا جائے گا۔ فقط الراقم کشیس فنڈر صاحب مرقوم ۲۵ ستمبر ۱۸۵۴ء اکبرآباد

پادری فنڈر کے اس جواب کے بعد جب مولانا رحمت اللہ صاحب کا ۲۳ ذی الحجہ کا خط پادری فنڈر کے پاس پہنچا تو انہوں نے یہ خط واپس کرکے مذکورہ تحریری مناظرہ بند کرنے کا جواب ۲۷ ستمبر ۱۸۵۴ء کے خط میں تحریر کیا۔

آپ کا یہ خط ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب کے واسطے سے پہنچا بن پڑھے واپس کرتا ہوں وجہ واپس کرنے کی وہی ہے جو میں نے اپنے آخری خط میں لکھی ہے کہ مباحثہ کی بات چیت خط و کتابت سے نہ ہوگی جو کچھ آپ کو لکھنا ہو رسالہ وار قلمبند کرکے اسے چھپوائیے جب آپ کے سب رسائل و کتب جو آپ نے تالیف کیں اور تالیف کرنے پر ہیں منطبع ہو کر میری نظر میں آویں گی۔ میں بھی چھاپہ کی راہ سے جواب دوں گا۔

الراقم کشیس فنڈر (ر۔ ۳)

پادری فرنچ کو جو دوسرا خط ۲۳ ذی الحجہ کو مولانا رحمت اللہ صاحب نے روانہ فرمایا تھا۔ اس کے اقتباس یہ ہیں:۔

ان دنوں میں وہ رسالہ جس میں اس مباحثہ کو جو اپریل کے مہینے سنہ حال میں ہوا تھا۔ جناب کشیس فنڈر صاحب نے ضبط کرکے اپنے اہتمام اور تصحیح سے سکندرہ کے چھاپہ خانہ میں چھپوایا ہے میری نظر سے گذرا غالب یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مسودہ آپ کی نظر سے نہ گذرا ہوگا۔ وگرنہ یقین ہے کہ آپ ایسی تحریر خلاف واقع پر رضامند نہ ہوتے۔ ... اس رسالہ میں صفحہ ۱۴ و ۱۵ کے اندر آپ کے قول کی یہ عبارت مرقوم ہے۔

"سب قدیم نسخہ مقابلہ کرنے سے اکثر غلطیوں کی تصحیح ہوئی یہاں تک کہ صرف چار پانچ آیت مشتبہ رہی ہیں۔ الخ"

(اور آخر صفحہ ۱۵ میں بطور حاشیہ کے اس جا یوں ہے۔

"مباحثہ کے وقت آٹھ دس کا ذکر ہوا۔ مگر زیادہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے

کہ آیات مشتبہ چار، پانچ سے زیادہ نہ ہوں گی"

آپ کو یاد ہو گا کہ ان مواضع کی نسبت آپ نے لفظ تحریف اور تبدیل کا فرمایا تھا۔ پس پادری صاحب نے اس جا تین باتیں کیں دو تحریفیں ایک یہ کہ لفظ تحریف کو مشتبہ کے ساتھ بدل ڈالا تا کہ لوگ سہاء میں پڑیں۔ دوسری یہ کہ لفظ آٹھ دس جا کو پانچ کے ساتھ محرف کیا۔ اگرچہ اس کا عذر بھی بناچاری حاشیہ میں کرنا پڑا۔ تیسرے یہ کہ اس آپ کی بات کو مخالف زیادہ تحقیق کے بیان کیا۔ پس اب میں آپ کے انصاف سے امید رکھ کر پوچھتا ہوں کہ جواب اس خط میں ان کے امروں سے ضرور مطلع فرمایئے گا۔ اول یہ کہ آپ نے ان مواضع کو محرف بتلایا تھا یا نہیں دوم یہ کہ آپ نے اس وقت ان مواضع میں موافق زیادہ تحقیق کے اقرار کیا تھا یا موافق تحریر سرسری کے اور آپ کے نزدیک اب وہی محقق ہے جو جلسہ میں ارشاد ہوا تھا یا موافق تحقیق کشیس ممدوح کے۔ سوم یہ کہ آٹھ دس مواضع عہد جدید کونسے ہیں۔ جن کا ذکر جلسوں میں کیا تھا۔ بحوالہ درس اور باب اور کتاب ارشاد کیجئے۔ چہارم یہ کہ آٹھ دس مواضع محرفہ کو فقط عہد جدید میں فرمایا تھا یا عہد عتیق میں . . . وہ تحریف کس زمانہ میں کس شخص نے کی کس لئے کی تھی اور جو آپ نے وقت مباحثہ کے اور اس کے بعد بھی اس امر میں بڑی جستجو کی ہے تو آپ کو بہت تلاش کی حاجت نہیں . . . اس کے جواب سے پہلوتہی نہ کیجئے گا اور جواب اس کا جناب مخدومی ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب کی معرفت ارسال فرما دیجئے گا۔ رحمت اللہ" (۲۶)

پادری فرنچ صاحب نے ۵ رستمبر ۱۸۵۴ء کو مولانا رحمت اللہ صاحب کے خط کا جواب دیا جو بہت مختصر، املا کی غلطیوں سے پُر اور الجھا ہوا ہے اور اس کا جواب بھی وہی ہے جو پادری فنڈر نے مناظرہ کی روئداد میں لکھا ہے۔ اسکے الفاظ یہ ہیں:

"اس کی حقیقت حال یہ ہے کہ عدد کلاں کے باب میں مصححین کا

کا اتفاق کسی صورت میں نہیں ہے۔ چار پانچ آیتوں کے حق میں قریب بیقین ہوا کہ سہواً یا عمداً بہ راہ تحریف متن کے درمیان آئیں۔" (۵۳)

مسلمانوں کی طرف سے اس مناظرہ کی جو روئیداد چھپی تھی اس کی صحیح ہونے کی تصدیق مناظرہ میں شریک ہونے والے علماء اور معزز حضرات نے کی یہ تصدیق "پہلا حصہ مباحثہ مذہبی کا" (اردو) اور "محاکمہ" کے آخری صفحہ پر چھپی ہے کن حضرات نے اس کی تصدیق کی تھی اور سوالیہ عبارت کیا تھی وہ نقل کی جاتی ہے۔ پہلا مباحثہ مذہبی کے مرتب سید عبداللہ صاحب تھے وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"الحمد للہ یہ مباحثہ تمام ہوا اور چونکہ بندہ دونوں جلسوں میں حاضر تھا تو گفتگو اپنے کانوں سے سنی لکھی ہے لیکن ان دنوں میں پادری فنڈر صاحب نے اس مباحثہ کو دوسرے ڈھنگ سے چھاپا ہے جس میں اکثر باتیں ایسی ہیں جو اس وقت طرفین سے کسی نے نہیں کہیں اور بہتیری ایسی ہیں جو جان بوجھ کر ان کو چھوڑ دیا اور بہتیری ایسی ہیں جن کے جوابوں میں تحریف کر ڈالی تو اس لئے یہ رسالہ سب صاحبوں کی خدمت میں جو اس جلسہ میں شریک تھے بھیجکر یہ توقع رکھتا ہوں کہ اگر یہ مناظرہ جو نیاز مند نے قلم بند کیا ہے مطابق واقع کے ہو تو اپنے اپنے دستخط سے مزین فرمادیں وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ"

ان تصدیق کنندہ حضرات میں محمد امیر اللہ وکیل راجہ بنارس، مولانا فیض احمد (بدایونی)، مولوی محمد سراج الحق صاحب پسر مولوی فیض احمد صاحب (بدایونی)، محمد اسد اللہ صاحب قاضی القضاۃ، مفتی محمد ریاض الدین صاحب، حافظ خدا بخش صاحب، محمد امجد علی صاحب وکیل سرکار آگرہ، مولوی محمد قمر الاسلام صاحب امام جامع مسجد آگرہ، منشی خادم علی صاحب مہتمم مطبع الاخبار (آگرہ)، محمد جعفر بخش قادری مولوی محمد قمر الدین صاحب مہتمم اسعد الاخبار (آگرہ) اول مدرس مشنری کالج آگرہ محمد شہید کولوی اور سید حافظ فضل حسین صاحب تھے۔

جب پادری فنڈر نے دیکھا کہ اس مناظرہ سے عیسائی مشنریوں کی ہوا خیزی ہوگئی ہے ہندوستانی اور خاص طور پر مسلمانوں میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے اور مسلمانوں کی طرف سے مناظرہ کے حالات اور "انصاری" میں مولانا رحمت اللہ صاحب کی کتابیں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر رہی ہیں تو انہی مباحث پر جن پر مناظرہ ہوا تھا اور عیسائیوں نے شکست کھائی تھی ان کا جواب دینے کے لیے "اختتام دینی مباحثہ کا" نام سے ایک کتاب سکندرہ چھاپہ خانہ آگرہ سے فنڈر نے ۱۸۵۵ء میں شائع کی جن میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو پادری فنڈر نے مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں صاحب کو لکھے تھے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کا جواب وہی ہے جو "محاکمہ" میں ۱۱ ستمبر ۱۸۵۴ء والا خط میں چھپا ہے جس کی ہم نے اس کتاب میں نقل کی ہے۔ اس کتاب کے صفحات ۱۵۲ ہیں۔

اس کتاب میں پادری فنڈر نے جن مسائل پر بحث کی ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) مسیح کی گواہی توریت کے حق اور صحیح ہونے کے باب میں اور یہ کہ مسیح کے ایام کے بعد بھی توریت تغیر و تبدل نہیں ہوئی

۲۔ مسیح کی گواہی حواریوں کی رسالت کی بابت اور ان کے معجزات اور رسالت کے بیان میں۔

۳۔ ذکر ان دلائل کا جن سے ظاہر و ثابت ہوتا ہے کہ توریت و انجیل کلام اللہ ہے۔

۴۔ الہام اور نبی کے بیان میں اور حق نبی کی نشانیوں کا ذکر

۵۔ مسیح کی گواہی اور حواریوں کی شہادت انجیل کے منسوخ ہونے کی بابت

۶۔ سہو کاتبوں کے بیان میں اور اس بات کا ذکر کہ انجیل محرف نہیں ہوئی۔

۷۔ آیات قرآنی کہ ان کے ضمن میں کہا گیا کہ انجیل خدا کا کلام ہے۔

۸۔ اس بات کے بیان میں کہ مضمون پر اعتراض کرنے سے تحریف ثابت نہیں ہوتی

۹۔ کلمات چند مسیح کی الوہیت اور تثلیث کے باب میں۔

۱۰۔ قول مسیح اس بات کے بیان میں کہ شافع اور نجات دینے والا خود آپ ہی ہے اور بس۔

۱۱۔ ان دلیلوں کا ذکر جن سے معلوم و یقین ہوتا ہے کہ نہ قرآن کلام اللہ ہے اور نہ محمد رسول اللہ ہے۔

اس کتاب کے دیباچہ کی عبارت سے بہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پادری فنڈر نے مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں صاحب کی کوششوں اور ان کی کتابوں کے اثرات زائل کرنے اور ان کے سوالات کا جواب دینے کے لئے یہ کتاب شائع کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

.. "ان دنوں میں دو تین کتابیں مسیح دین کی تردید اور ہماری کتابوں کے جواب میں مطبوع ہوئی ہیں کہ مولوی رحمت اللہ صاحب نے محمد وزیر خاں صاحب کی اعانت اور انگریزی دانوں کی مدد سے تصنیف کی ہیں اور میں نے بھی آگے سے جناب موصوف سے وعدہ کیا تھا کہ جب آپ کی کتابیں چھپ چکیں میں دیکھ کر اس کا جواب ادا کروں گا۔ مگر مولوی صاحب کی سب کتابیں غور سے دیکھ کر معلوم ہوا کہ ان میں کچھ نئی بات اور کوئی اور اعتراض نہیں پائے جاتے ہیں مگر وہی کشف الاستار اور کتاب استفسار وغیرہ میں مسطور کئے گئے اور جن کا جواب میں نے حل الاشکال اور میزان الحق اور مفتاح الاسرار کے آخیر چھاپے میں دیدیا ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ صاحب موصوف نے طعن و تعصب میں ان مصنفوں سے زیادہ کوشش کی ہے اور انجیل کی تحریف اور تخریب ادعا میں زیادہ تر شور مچایا ہے۔ یہاں تک کہ جا بجا کہا ہے کہ انجیل و توریت سب صورت سے تحریف اور خراب ہو گئی۔ چنانچہ پھر قابل اعتماد و اعتقاد کے نہ رہی ہیں اور بہت جد و جہد کیا۔ اپنے انگریزی اد...

دوستوں کی مدد سے اس بات کو ہمارے علماؤں کی کتابوں کی مدد سے ثابت کیے۔ لہذا لگا ہے سنکر اور ملحدوں مثل استراوس، اسپوزہ، پائین، کارلائل وغیرہ کے قول کو اپنی دلیل بنایا۔ . . . . چنانچہ جو جو انہوں نے انجیل کے بعضے لفظوں کی تحریف اور بعضے آیات کے مشتبہ ہونے کے باب میں لکھا۔ اس نے ایسا بیان کیا گویا وے مقر ہوئے کہ انجیل اور توریت کی اکثر آیات نے تحریف پائی اور اکثر مطالب مشتبہ ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ پھر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انجیل کی کون سی بات اصل اور صحیح ہے۔ لیکن ایسی باتوں سے اور کچھ ظاہر اور ثابت نہیں ہوتا مگر مولوی صاحب کا تعصب وطرف داری کیونکہ ہمارے انہیں علماؤں نے کہ ان غلطیوں کی کیفیت جو کاتبوں کے سہو وغیرہ کی سبب سے کتب مقدسہ میں وارد ہوئی ہیں۔ بیان کی۔ آپ نے انہیں کتابوں میں یہ بھی صاف صاف کہا اور لکھا ہے کہ باوجود ان غلطیوں کے توریت اور انجیل کے مضمون اور مطالب میں کچھ فرق اور نقصان نہیں پڑا۔ بلکہ کتب مقدسہ اب بھی وہی ہیں کہ اول ہی میں تھیں۔ چنانچہ فرصت پا کے آگے مذکور کیا جائے گا۔"

"پھر مولوی صاحب نے بڑے تفخر سے بار بار کہا ہے کہ میزان الحق اور مفتاح الاسرار کا جواب میں نے خوب ادا کیا ہے۔ مگر یہ بھی صرف اس کا ایک دعویٰ ہے اور جس میں نے تو میزان الحق کے دیباچہ میں تفصیلاً وہ شرطیں بیان کی ہیں جن سے حق کلام ثابت ہوتا ہے اور اس کے دوسرے باب کی فصلوں میں میں نے بتایا اور ثابت کیا کہ انجیل کے مضامین اور تعلیمات سے وے شروط بوجہ احسن پورے ہوئے اور انجام پائے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح انجیل کا من اللہ ہونا بخوبی ثابت ہوتا ہے اور اسی باب

کی چھٹی فصل میں میں نے ان دلیلوں کو بھی بیان اور پیش کیا ہے۔ جن سے انجیل کا حق اور خدا کا کلام ہونا صاف صاف معلوم اور یقین ہوتا ہے پس کیا مولوی صاحب نے ان کا جواب دیا ہے کبھی نہیں بلکہ ایک بات بھی ان کے رد میں نہیں لکھی ہے ۔ . . پھر قرآن کے حق میں مولوی صاحب نے آیا جرات کی کہ کہے وہ بات صحیح نہیں ہے جو میں نے عثمان کے قرآن کی تالیف اور جمع کرنے اور اگلے نسخوں کے جلانے کے باب میں کتاب مشکات سے نکال دیا ہے یا تبار یا کہ وے نشانیاں جن کو میں نے میزان الحق کے تیسرے باب کے شروع میں حق نبی کی پہچان کے واسطے مسطور کیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں پائی گئیں یا کہہ سکا کہ ماریہ اور زینب کے گذارشات حق نہیں اور وے آیات اور حدیث جن کو میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گنہگار ہونے کی بابت مذکور کیا۔ قرآن اور محدثوں کی کتابوں میں بعینہ ویسا ہی پائی نہیں جاتی ہیں۔ یا اس نے کوئی معجزہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جو قرآن (مجید) میں تفصیل وار مذکور ہو قرآن سے لاسکا۔ چنانچہ معجزات مسیح اور حواریوں کی انجیل میں تفصیلاً مسطور ہوئے ہیں یا انکار کرسکا کہ قرآن کی آیات میں بہشت مجازی طور پر بیان ہوا۔ اور یہ کہ جہاد کا حکم ہوا اور (قرآن میں کہا ہے کہ خدا نے جن اور انس کو جہنم کے واسطے پیدا کیا ہے اور آیا مولوی صاحب نے ان دلیلوں کے جواب کو ادا کیا جن سے میں نے ثابت کیا کہ قرآن کی عبارت خواہ بے مثل بے مانند ہو خواہ نہ ہو کسی وجہ سے اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی ہے اور یہ کہ قرآن ایک جمع آوری ہے توریت اور انجیل سے اور یہود اور عیسائیوں کی حدیثوں سے اور قدیم عربوں کی عادتوں اور قصوں سے،

اور آیا کہہ سکا کہ وے اعمال غیر مناسبہ جو میں نے میزان الحق کے ۲۱۳ صفحہ سے ۲۲۲ تک مذکور کئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سرزد نہیں ہوئے کبھی نہیں صاحب موصوف نے ان باتوں کا جواب دیا نہ انکار کیا . . . اب اس صورت میں کہ مولوی صاحب نے جواب ادا نہیں کیا پس جواب الجواب کا بھی مقام نہیں ہے تس پر بھی اس راہ سے جواب دیدوں گا کہ اپنی کتابوں سے وہی بات جو مباحثہ کے شامل ہیں میں منتخب کر کے اور کچھ تفصیل دے کے اس رسالہ میں پیش کروں گا اور امید ہے کہ صاحب انصاف اور حق جو آئندہ مقصودوں کو غور سے پڑھکر سمجھے گا اور معلوم کرلے گا کہ ان کے ضمن میں مولوی صاحب کے سب اعتراض کا کافی اور شافی جواب دیا گیا ہے ۔"

اس کتاب میں پادری فنڈر نے توریت اور انجیل کے چند صحیفوں کے مصنفین کے متعلق شبہ کا اظہار کیا ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس نے ان کو تصنیف کیا ہے کہ جن صحیفوں کے مصنفین کا پتہ نہیں ہے تو ان کو کیا الہامی کہا جا سکتا ہے ؟ پادری صاحب کی عبارت یہ ہے ۔

"توریت کے سب صحیفے نبیوں کے وسیلے سے عبرانی زبان میں لکھے گئے ہیں ۔ موسیٰ کے ایام سے تقریباً پندرہ سو برس مسیح کے پہلے تھا ۔ ملاکی نبی تک تقریباً چار سو برس قبل از مسیح نبوت کی اور عہد عتیق کا آخری نبی تھا ۔ مگر بعض صحیفوں کی بابت معلوم نہیں کہ کون سے نبی کے ہاتھ سے لکھے گئے ہیں ۔ مثلاً ایوب ، روط ، سلاطین وغیرہ کے حق میں یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ کس نبی نے ان کو لکھا ہے اور بعض کتب میں اور نبیوں کی بات بھی داخل ہے ۔ مثلاً کتاب زبور میں ایسے زبور بھی ہیں

جو داؤد کے نہیں ہیں اور ویسا ہی موسیٰ کی پانچویں کتاب کے آخر فصل جس میں موسیٰ کی وفات کی خبر ہے کسی اور نبی سے اس کتاب کا الحاق کیا گیا ... انجیل کے صحیفے حواریوں کے ہاتھ الہام کی راہ سے لئے گئے اور ان کے سب مصنفوں کے نام معلوم ہیں مگر عبرانیوں کا خط کہ اس کے حق میں بالیقین تمام نہیں کہہ سکتے کہ کون سے حواری نے اس کو لکھا ہے اغلب یہ ہے کہ پولس حواری نے اسکو لکھا۔ متی کی انجیل کی بابت بعض علماء نے یہ گمان کیا کہ شاید متی نے اس کو عبرانی زبان میں لکھا ہو اور بعد اس کے خود اس نے یا حواریوں کے کسی مرید نے اس کا ترجمہ یونانی زبان میں کیا ہے۔ لیکن اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ متی نے اپنی انجیل کو نہ عبرانی بلکہ یونانی زبان میں لکھا ہے۔ بعض نامجات کے حق میں مثلاً عبرانیوں کا نامہ دوسرا پطرس کا نامہ، دوسرے تیسرے یوحنا کے نامے اور یعقوب اور یہودا کے نامے، اور مکاشفات کے حق میں بعد از قدما کچھ شبہ رکھتے تھے کہ آیا فی الحقیقت یا حواریوں کے لکھے ہوئے ہیں کہ نہیں اور اسی سبب سے یہ صحف اول ہی سے کہ وے نامجات انجیل کے اور صحیفوں کی مانند حواریوں کے ایام میں اس قدر مشہور و معروف نہ تھے اور اگلے عیسائی جب تک ان پر تمام یقین نہ ہوا کہ فلاں صحیفہ حواری کا ہے اس کو انجیل سے نہیں ملاتے تھے۔ چنانچہ اسی تحقیق اور تدقیق کے بموجب ان سب جعلی کتابوں سے جن کو "ابوکریفیکل" انجیل کہتے ہیں اور مصنف ان کو جھوٹ کی راہ سے کسی حواری یا حواری کے کسی شاگرد کی تصنیف بتلاتے تھے ان سب سے انکار کلی کرتے تھے۔ لیکن نامے مذکور بالا رفتہ رفتہ عموماً مسیحی جماعتوں میں مشہور ہو کر سب کو یقین ہوا کہ وے صحیفے فی الواقع حواریوں کے ہیں پس آخر وے بھی کتاب انجیل سے ملائے گئے اور

سب نسخے انجیل سے مجلد ہوئے ہیں (۴۹)"

اس کتاب میں بھی پادری فنڈر نے بعض تحریفوں کو تسلیم کیا ہے اور بعض کو مشتبہ قرار دیا ہے ۔

" اگرچہ ہم لوگ قائل کہ بعض حروف اور الفاظ میں تحریف وقوع میں آئی ہے اور بعض آیات کی بابت مقدم اور موخر اور الحاق کا شبہ ہے تو بھی انجیل کو بے تحریف و بے تبدیل کہتے ہیں ۔ اس لحاظ سے اس کا مضمون اور مطلب نہیں بدل گیا (۵۰)"

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شرکت

مولانا رحمت اللہ صاحب کی کتب ردِ نصاریٰ کی تالیف جہاد بالقلم اور ۱۸۵۴ء کا آگرہ کا مناظرہ جو جہاد باللسان تھا وہ جہاد بالسیف جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ دہلی کے علمی طبقے اور خصوصاً لال قلعہ کے شہزادوں پر مولانا رحمت اللہ صاحب کی علمی قابلیت اور ردِ نصاریٰ میں وسیع معلومات اور حاجی امداد اللہ صاحب کی روحانیت کا اثر تھا اور یہ لوگ ان حضرات کے معتقد و مرید تھے اور جس طرح ہر ہندوستانی عیسائی مشنریوں کی ان حرکتوں کو قوم و ملت کے لئے خطرناک سمجھتا تھا اسی طرح دہلی والے اور لال قلعہ کے شہزادے ان سے پریشان تھے۔

چنانچہ جب مرزا فخرو ولی عہد بہادر شاہ ظفر کو معلوم ہوا کہ مولانا رحمت اللہ صاحب ردِ نصاریٰ میں ایک کتاب ازالۃ الشکوک تصنیف فرما رہے ہیں تو اس وقت انہوں نے ان کے پاس دہلی کے عیسائیوں کے چھ سوالات روانہ کئے کہ آپ ان کا جواب بھی اس کتاب میں شائع فرماویں۔ چنانچہ مولانا صاحب نے ان کے کہنے کے مطابق ازالۃ الشکوک میں ان چھ سوالات کے جواب شائع کئے۔ اس کے بعد مرزا فخرو کے حکم سے آگرہ کے مناظرہ کی روئیداد البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف طبع ہوئی اور انہی کے حکم سے ہندوستان

کے اطراف واکناف میں ان کی اشاعت ہوئی۔

من وعن یہی پوزیشن دہلی میں حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی تھی۔ ان کے مریدوں میں دہلی کے شہزادے بھی تھے چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں۔

"اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) جب بھی دہلی تشریف لاتے تو حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے پاس قیام فرماتے اور استاد الکل مولانا مملوک علی کے شاگرد سیدنا امام الکبیر مولانا قاسم بھی زیارت سے بہرہ یاب ہوتے۔ خلاصہ یہ کہ دہلی سے نانوتہ، نانوتہ سے دہلی جاتے ہوئے بھی حضرت حاجی صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضری کے مسلسل مواقع آپ کو ملتے رہتے اور یوں بھی جب کبھی حاجی صاحب دہلی تشریف لاتے تو قدرتی تائید ہی کی اس کو ایک شکل سمجھنا چاہیئے کہ دہلی جہاں عرض کر چکا ہوں شاہی خانوادے کے بھی بعض ارکان حاجی صاحب کے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے اسی دلی میں بجائے کسی اور جگہ فروکش ہونے کے اسی گھر کو قیام گاہ بنانے کا شرف بخشا جاتا تھا۔ جہاں سیدنا امام الکبیر کو حاجی صاحب کے ساتھ تعلقات کے تر و تازہ کرنے کے مواقع بہ آسانی مل جاتے تھے"۔ [۱]

۱۸۵۴ء کے اکبر آباد کے مناظرہ کے دوسرے ہیرو ڈاکٹر وزیر خانصاحب تھے اور اس مناظرہ میں شریک ہونے والوں میں مولوی فیض احمد رسوا بدایونی بھی تھے۔ ان حضرات کے یہ تعلقات جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ممد ثابت ہوئے اور انہوں نے متفق ہو کر اس جنگ آزادی میں بہت نمایاں اور اہم پارٹ ادا کیا۔

جب میرٹھ کے مجاہدین نے دہلی میں جنگ آزادی کا بگل بجایا۔ چونکہ مولانا رحمت اللہ

---

[۱] سوانح قاسمی اول ص ۲۸۵

صاحب کا دہلی کے علمی طبقے اور لال قلعہ کے شہزادوں پر اثر تھا اور ان سے تعلقات بھی تھے، اس وقت بہادر شاہ ظفر اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی جنگ آزادی کا نقشہ بنانے میں حصہ لیا اور جنگ میں شمولیت فرمائی اور ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب اور مولوی فیض احمد بدایونی کے ساتھ دہلی کی جنگ آزادی میں شریک ہوئے۔ اور شاملی اور کیرانہ کا معرکہ بھی مولانا رحمت اللہ صاحب اور حاجی امداد اللہ صاحب نے باہمی مشوروں سے سر کیا اور ان میں سے ہر شخص نے حتی الامکان جنگ آزادی کو کامیاب کرنے کی کوشش کی مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں جو انقلابی کارنامے انجام دیئے ہیں وہ ان حضرات کے باہمی مشوروں اور پروگرام کے مطابق پایۂ تکمیل تک پہنچے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کی وہ دور اندیش ہستی تھی جنھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انگریزی حکومت جب تک قائم رہے گی ہندوستانیوں کے مذہب تمدن اور معاشرت کا خاتمہ کرتی رہے گی اور اپنی تہذیب و تمدن ہندوستانیوں پر مسلط کر کے عیسائی مذہب پھیلائے گی اس لئے اس حکومت کا زور ہر میدان میں خواہ وہ قلمی ہو لسانی ہو اور میدان جنگ ہو اس میں توڑنا چاہیئے۔ ایسے باشعور اور خوددار انسان سے جبکہ ملک میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند ہو گیا ہو۔ یہ توقع کرنا وہ اس جنگ آزادی کو ایک تماشا سمجھے گا اور اس میں شامل نہ ہوگا انتہائی غلط ہے۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس سنہری موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور وہ دہلی میں جنگ آزادی کے ابتدائی زمانہ میں آئے جس کا ذکر مولانا ذکاء اللہ صاحب نے اپنے محتاط انداز میں کیا ہے۔

"سب سے اول مولوی رحمت اللہ کیرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔ وہ بڑے فاضل تھے عیسائی مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعہ کے پاس مولوی حیات کی

مسجد میں اترے اس دانشمند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامہ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن کو چلا گیا"[1]

دہلی کے ان ابتدائی ایام میں جبکہ میرٹھ کے مجاہدوں نے دہلی پہ حملہ کیا تھا اور انگریزوں کا قلع قمع کر دیا تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر کوئی انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ جہاد کے حالات نہیں تھے۔ اس سے بہتر اور کیا حالات ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انہی حالات کو دیکھ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس جنگ آزادی میں حصہ لیا جس کی تصدیق وتائید روزنامچہ عبداللطیف سے ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

۳۰ جون کمتر از روز برآمده بود که آویزش دلنشیں سپاہ نصیر آباد آمد۔ آئین سپاہ گری بجا آورد وبکوہیچہ ملاقی شد وبے ہزیمت خورد دہم امروز کہ بیشتر از روز رفتہ بود کہ مردم نجیب آباد کہ بشمار دو صد میر سیدند باقتدائے مولوی رحمت اللہ کیرانہ نژاد بمنازعت برآمدند و براجعت در آمدند۔ (۶۸)

۳۰ جون کچھ دن چڑھے نصیر آباد کے لشکر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور سپہ گری کا حق ادا کیا۔ لیکن شکست کھائی اور آج ہی دن ڈھلے دوسو اہل نجیب آباد مولوی رحمت اللہ کرانوی کی قیادت میں پہنچے اور آمادہ پیکار ہوئے لیکن پھر واپسی اختیار کی

اس عبارت سے اندازہ لگایئے کہ جو شخص ۳۰ جون ۱۸۵۷ء کو مرد میدان بنا ہو اس نے ابتدائی زمانہ میں جبکہ بغاوت کے شباب کا زمانہ تھا شمولیت نہ کی ہو گی اور جبکہ وہ دہلی میں ایسے وقت آ بھی گیا ہو۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کے نبیرہ اور مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے ناظم مولانا محمد سلیم صاحب کے پاس حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانے کے

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند جلد سوئم ص ۶۷۵

تحریر کردہ وہ کاغذ ہیں جس میں دہلی کے فوجی سپاہیوں، جمعداروں اور رسالداروں کی تعداد اور ان کی تنخواہ کا ذکر ہے جو آپ کے ساتھ معرکہ آزادی میں شریک تھے۔

کاغذ اول

نام	عدد	تنخواہ فی کس	تنخواہ مجموع
سپاہیان	۹٦۸	سے ر	۵۲۰۸
جمعدار	۱۰۰	یعہ / ۸ ر	۱۲۵۰
نائب صوبیدار	۲۰	مہعہ ر	۵۰۰
صوبیدار	۱۰	صہ ر	۵۰۰
صوبیدار بہادر	۲ / ۱۰۰۰	ما ر	۲۰۰ / ۷٦۵۸
امیر ہزارہ	۱	صما ر	۵۰۰ / ۸۱۵۸

کاغذ دویم :-

نام	عدد	تنخواہ فی کس	تنخواہ مجموع
سوران	۹۷۹	للعہ ر	۱۷۳٦۰
جمعدار	۱۰۰	سعہ ر	۲۰۰
نائب رسالدار	۲۰	صعہ ر	۱۰۰۰
رسالدار	۱۰	عا ر	۱۰۰۰
رسالدار اعلیٰ	۲	۱۲	۲۰۰ / ۲۳۷٦۰
امیر ہزارہ	۱	الـعـ	
متفرق	۲	ما	

حالات واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رحمت اللہ صاحب دہلی کی جنگ آزادی

۱۸۵۷ء میں ابتدا سے آخر تک شریک رہے

اس جنگ کے دوران جو انقلابی فتویٰ شائع ہوا تھا۔ اس کے بارے میں خیال تھا کہ اس پر دستخط کرنے والے جناب مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی تھے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بارے میں انگریز سمجھتے تھے کہ اسکے بانی مبانی وہابی علماء اہل حدیث تھے چنانچہ مولانا ابوسعید محمد حسین صاحب نے اس الزام کی تردید کرنے کے لئے ایک مضمون بعنوان "غدر اور علماء اہلحدیث" اپنے رسالہ اشاعت السنۃ لاہور میں شائع کیا جس میں انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران انقلابی فتویٰ دہلی میں تقسیم ہوا تھا اور اسکی حسب ذیل نقل ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کے صادق الاخبار دہلی میں شائع ہوئی تھی۔

"کیا فرماتے ہیں علماء دین اس امر میں کہ انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں۔ اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں۔ اور وہ لوگ جو اور شہر اور بستیوں کے رہنے والے ہیں انکو بھی جہاد چاہیئے یا نہیں بیان کرو۔ اللہ جزا دے۔

جواب: درصورت مرقومہ یہ فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اسکی فرضیت کے واسطے چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات و حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اطراف و حوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں۔ باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جاویں مقابلہ سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائیگا اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً و غرباً فرض عین ہوگا اور جو عدو بستیوں پر ہجوم اور قتل و غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر فرض ہو جائے گا بشرط ان کی طاقت ہے۔ دستخط و مواہیر"

رحمۃ اللہ، سید محمد نذیر حسین، نور جمال، عبدالکریم، سکندر علی۔ مفتی صدرالدین۔ مفتی اکرام الدین، محمد ضیاء الدین، احمد سعید، محمد عنبر خاں، محمد کریم اللہ، سعید شاہ نقشبندی عبدالقادر، مولوی عبدالغنی، محمد علی، سرفراز علی، سید محبوب علی جعفری، محمد حامی الدین مولوی سعیدالدین، فریدالدین، سید احمد، الٰہی بخش۔ محمد انصار علی، حفیظ اللہ خاں،

نورالحق ، محمد رحمت علی خاں عدالت العالیہ ، محمد علی حسین قاضی القضات سیف الرحمٰن ، محمد ہاشم سید عبدالحمید ، سید محمد۔

اس فتوے پر دستخط کرنے والے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی نہیں تھے۔ بلکہ دہلی کے مولانا رحمت اللہ صاحب تھے۔ لیکن اس فتوی کے مرتب کرنے میں مولانا رحمت اللہ صاحب شامل تھے۔ مولانا ابوسعید صاحب کا یہ مضمون دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اس لئے اس کو پورا نقل کیا جاتا ہے۔

غور اور توجہ سے پڑھیں۔

واضح ہو کہ مفسدہ ۱۸۵۷ء میں اس گروہ کے کسی ایک (لائق شمار و اعتبار) کی شراکت و سازش بغاوت کرنے یا اس کے ترغیب دلانے میں پائی نہیں گئی۔ کوئی دعوی نہیں کر سکتا اور نہ اس کا ثبوت دے سکتا ہے کہ کوئی مولوی یا مقتدی یا رئیس اس گروہ کا اس مفسدہ میں شریک تھا اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں فلاں شخص (بہادر شاہ یا فیروز شاہ یا بخت خاں وغیرہ) جو اس بغاوت کے بانی مبانی یا اس کے معاون تھے اہل حدیث یا وہابی تھا۔ اس موقع پر علماء دہلی کا جن میں اس وقت کے اکابر اہل حدیث بھی داخل ہیں، فتوی جہاد پر دستخط یا مواہیر کرنا اور بعض مولویوں کا جیسے مولوی عبدالقادر لدھیانوی اور ان کے بیٹے سیف الرحمٰن وغیرہ اور مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور مولوی سرفراز علی گورکھپوری اور مولوی فضل حق خیرآبادی وغیرہ کا اس ہنگامہ میں شریک ہونا کچھ کچھ شکوک و ظن پیدا کرتا ہے اور مخالف کو بات کہنے کا موقع دیتا ہے۔ لہذا ان باتوں کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ بے شک علماء دہلی نے فتوی جہاد پر مواہیر کی ہیں مگر بخوف گولی و شمشیر کے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب باغی فوج دہلی میں آکر جمع ہوئی اور بخت خاں بریلی سے آیا اور مولوی سرفراز علی اور مولوی

رحمت اللہ اور مولوی عبدالقادر مع اپنے فرزندوں کے بخت خاں کے ساتھ
شامل ہوئے تو بخت خاں نے ان لوگوں سے جہاد کا فتویٰ لکھوایا پھر اس پر
علماء دہلی کے دستخط و مواہیر ثبت کرانا چاہا۔ ایک روز بخت خاں مع افسران
باغی فوج جامع مسجد دہلی میں آیا اور سپاہیوں کی معرفت شاہ احمد سعید شاہ
عبدالعزیز خانقاہی اور مفتی صدرالدین اور نواب قطب الدین خاں صاحب
اور مولوی کریم اللہ اور مولوی فریدالدین اور مولوی ضیاءالدین اور مولوی نوازش علی
اور مولوی رحمت اللہ دہلوی (یہ مولوی رحمت اللہ کیرانوی ہیں) اور مولوی
حفیظ اللہ اور مولوی سید محمد نذیر حسین صاحبان کو بلوایا۔ پھر مولوی سرفراز علی
نے بحکم بخت خاں وہ فتویٰ پڑھ کر سنایا جب وہ فتویٰ تمام ہوا تو بخت
خاں وغیرہ باغی افسروں نے علماء کو حکم دیا کہ اس فتویٰ پر اپنے دستخط
کردیں ورنہ سب قتل کئے جائیں گے۔ پس سب نے بخوف جان کرہاً و
جبراً دستخط کردئیے اور اگر وہ دستخط نہ کرتے تو اسی وقت سب تلوار سے قتل
کئے جاتے یا توپ سے اڑائے جاتے۔ ہمارے خیال میں اگر وہ انگریز دجہ
اہل حدیث پر اس مجبوراً شرکت کے سبب حرف گیری کر رہے ہیں، اس موقع
پر ہوتے اور اس فتویٰ کی موافقت پر مجبور کئے جاتے تو تلواروں کو دیکھ کر
اظہار موافقت کرتے اور اس فتویٰ پر دستخط کرتے۔ ہمارے اس دعوے پر
کہ انھوں نے جبراً دستخط کئے ہیں دلی ارادہ سے نہیں کئے۔ ایک بڑی روشن دلیل
یہ ہے کہ وہ لوگ دستخط کرکے پھر گھر سے باہر نہ نکلے اور اس جہاد میں شریک
نہ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب گورنمنٹ انگلشیہ کا دہلی پر دوبارہ تسلط ہوا تو گورنمنٹ
نے ان دستخط کرنے والے مولویوں کو بری الذمہ قرار دیا۔ نہ کسی کو پھانسی دی نہ
کسی کا گھر لوٹا۔ باوجودیکہ باغیوں کے مددگاروں کو پھانسی دینا اس وقت کا

عام رول تھا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ ان ہی مجبور ہو کر دستخط کرنے والے مولویوں سے مولوی حفیظ اللہ خاں اور مولوی نذیر حسین اور ان کے بیٹے مولوی شریف حسین اور ان کے شاگردان مولوی محمد صدیق پشاوری اور مولوی عبد اللہ مرحوم غزنوی (جن کی اولاد وقبائل اب امرتسر میں آباد ہیں اور اس سلطنت کو امن و آزادی کی نظر سے اپنے قدیم وطن غزنی و کابل سے بہتر سمجھ کر پھر وہاں جانا نہیں چاہتے) انے ایک میم کو زخمی پاکر امن دیا اور اپنے گھر میں لے جاکر اس کے زخموں کا علاج کر کے جب موقع پایا سرکاری کیمپ میں پہنچا دیا۔ جس پر ان کو سرکار کی طرف سے انعام و اکرام بھی ہوا۔ اور اگر ان کا اس فتوے پر مہر کرنا دلی ارادہ سے ہوتا تو یہ خیر خواہانہ کام ان سے کیوں ہوتا۔ ان کو انگریزوں کی ایسی حالتِ ضعیف میں انگریزوں سے کیا ڈر تھا اور کیا طمع و توقع۔ اس بیان کی تصدیق کے لئے ہم دو چٹھیاں انگریزی معہ ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ ان چٹھیوں کی نقل جو ہمارے پاس دہلی سے پہنچی ہیں، اس میں بعض الفاظ مشتبہ ہیں۔ ان کو ہم نے بدلنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہاں بعض الفاظ بطور اختصار چھوڑ دیے ہے۔

نقل چٹھی ڈبلیو جی۔ واٹر فیلڈ صاحب بہادر قائم مقام کمشنر سابق

دہلی ۲۷ ستمبر ۱۸۵۷ء: مولوی نذیر حسین اور ان کے پسر مولوی شریف حسین نے معہ دیگر مردم خاندان کے مسٹر لیسن کی میم کی غدر میں جان بچائی تھی اس وقت یہ اس کو اپنے گھر لے گئے تھے جس وقت میں وہ زخمی پڑی تھی سو اپنے مکان میں ساڑھے تین مہینے تک رکھا۔ آخر کار سرکاری کیمپ میں پہنچا دیا۔ ان کے بیان سے ظاہر ہوا کہ سرکاری انگریزی چٹھیاں اس آگ سے جل گئی ہیں جو ان کے مکان میں لگی تھی۔ میں خیال کرتا ہوں یہ امر صحیح ہے ان کے پاس چٹھیاں

نوابی چیمبرلین صاحب اور جنرل برٹن صاحب اور کرنل ٹیلر صاحب وغیرہ کی تھیں اور مسٹر لین کی میم کے آنے کی کل حقیقت مجھ کو یاد ہے۔ ان کو دو سو روپیہ ایک مرتبہ اور چار سو ایک مرتبہ انعام ملا اور سات سو روپیہ بعوض گرجانے مکانات کے ملا پس یہ خاندان قابل لحاظ اور مہربانی کے ہے۔

نقل چٹھی میجر جی ای ینگ صاحب بہادر کمشنر

میں نے بچشم خود دیکھا اور میم صاحبہ سے بھی سنا۔ فی الحقیقت یہ سرٹیفکٹ درست ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ مولوی نذیر حسین اور شریف حسین نے ان کی جان دشمنوں سے بچائی۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۸۱ء

یہ اس فتویٰ جہاد پر علماء دہلی کے مہر و دستخط کرنے کا جواب ہے۔ اب رہا بعض علماء پنجاب و ہندوستان کا اس مفسدہ ۱۸۵۷ء میں شریک ہونا اس کا جواب یہ ہے کہ منجملہ ان علماء کے جو اس مفسدہ میں شریک تھے اہل حدیث ایک بھی نہ تھا۔ بلکہ اکثر ان میں سے ایسے تھے جو اہل حدیث سے مخالفت کے مدعی تھے اور ان کی ذریات و اتباع اب تک اس گروہ سے عداوت کا دم مارتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑے مولوی فضل حق خیر آبادی ہیں ان کی عداوت و مخالفت اس گروہ سے شہرۂ آفاق ہے۔ وہ مولوی اسمٰعیل کے (جو اس گروہ کے پیشوا تھے) مدت العمر مخالف رہے اور امکان نظیر پیغمبر کے مسئلہ میں ان کی تکفیر کرتے رہے۔ وہ فوت ہوئے تو ان کے بیٹے عبدالحق بحکم "میراث پدر خواہی علم پدر آموز" اس کام میں لگے اور اب تک اس خاندان کی ذریات و اتباع اس گروہ کی مخالفت کے مدعی موجود ہیں۔

مولوی عبدالقادر لودہانہ والے بھی اس گروہ کی چال پر نہ تھے۔ وہ تو فوت ہو گئے ہیں۔ ان کے خیالات کا کوئی تجربہ و مشاہدہ چاہیئے تو ان کے

فرزندوں کو جواب لودہانہ میں ہیں آکر دیکھ لے۔ کیسے ممبروں پر بیٹھ کر اہل حدیث کی تکفیر کرتے ہیں۔ اس گروہ سے اپنی اور اپنے باپ کی مخالفت ظاہر کر رہے ہیں۔ اس باب میں انہوں نے چند رسائل بھی لکھے ہیں۔ از انجملہ ایک رسالہ انتصار الاسلام ہے جس میں اس گروہ کے مسائل مذہبی کا بہت تحقیر و توہین کے ساتھ رد ہے۔ ایک رسالہ انتظام المساجد باخراج اہل الفتن والمفاسد ہے جس میں اس گروہ کو اپنی مسجدوں سے نکال دینے اور ان کو کافر و مرتد سمجھنے کی وصیت و تاکید فرمائی ہے۔ صوبہ بہار میں اس رسالہ پر عمل بھی ہو چکا ہے جس کا ذکر ہم نے ضمیمہ اشاعۃ السنہ نمبر ۱ جلد ۷ میں کیا ہے جس کو اس بیان میں شک ہے وہ ان رسائل کا مطالعہ کرے۔ ایسا ہی مولوی رحمت اللہ اور مولوی سرفراز علی کا حال ہے۔ پھر اس مقام میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے...... یہ مقام اس تاریخی حالات کی تفصیل سے اجنبی ہے حاصل مطلب یہ کہ ان لوگوں میں ایک شخص بھی اہل حدیث کے عمل و عقیدہ پر نہ تھا۔ پھر ان لوگوں کا اس مفسدہ میں شریک ہو جانا اہل حدیث پر الزام قائم ہونے کا باعث کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس بات سے ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ جس مذہب پر وہ لوگ ہیں اس مذہب یا مذہب اہل حدیث کے سوائے اور بھی اسلامی مذاہب کی رو سے مخالفت گورنمنٹ جائز ہے۔ حاشا وکلا ہم کسی مذہب کو اس مخالفت کی تہمت نہیں لگاتے۔ بلکہ مقصود ہمارا اس بات سے صرف اسی قدر ہے کہ ان لوگوں کا فعل (خواہ کسی نیت و سبب سے ہوا ہو) اہل حدیث کا فعل نہیں ہو سکتا۔ رہا یہ امر کہ انہوں نے یہ کام (غدر میں شریک ہونا) کیوں کیا؟ آیا یہ ان کو مذہب کی ہدایت تھی یا کوئی اور وجہ ہوئی اس میں ہم تو یہی کہیں گے (گو ہم ان کے مذہب پر نہیں ہیں) کہ اس فعل

میں ان کے مذہب کا دخل نہیں ہے۔ ان کو مذہب نے غدر و فساد کی ہدایت نہیں کی بلکہ طمع دنیوی اور بدنیتی نے ان کو یہ جرأت دلائی (چنانچہ مولوی فضل حق کا بہادر شاہ سے ان ایام میں خیر آباد کی سند لکھوا لینا) اس دنیا طلبی پر دلیل ہے یا یہ کہ انہوں نے اپنی رائے میں غلطی کی۔ یا کوئی اور وجہ ان کے دماغ میں پیدا ہوئی۔ الغرض ان کو جو ہدایت ہوئی خیال سے ہوئی۔ مذہب سے نہیں ہوئی۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ جو ان دنوں ایک شخص مکلیں نامی نے ملکہ معظمہ قیصر ہند پر باوجود عیسائی ہونے کے گولی چلائی تھی اس فعل کو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ مذہب کی ہدایت تھی۔ اس قسم کی وجہ ان لوگوں کے فعل کی پیدا ہو سکتی ہے۔ مفسدہ ۱۸۵۷ء میں شمولیت کا جواب بھی ادا ہوا

اشاعت السنتہ لاہور جلد ۵ نمبر ۱"

مولانا رحمت اللہ صاحب دہلوی کے ایک اور دستخط ۱۸۶۰ء کے فتوے پر ہیں جو ۲۹ دسمبر ۱۹۶۰ء کے کوہ نور میں شائع ہوا تھا اور جامع مسجد کے اس قضیہ پر لیا گیا تھا۔ کہ کیا جامع مسجد دہلی میں تبرکات رکھنے ضروری ہیں۔ یہ فتویٰ ان ایام کا ہے جبکہ مولانا رحمت اللہ کرانوی وارنٹ گرفتاری کی وجہ سے یا تو روپوش تھے یا مکہ معظمہ میں ہجرت فرما گئے تھے۔ فتویٰ کی عبارت یہ ہے اور اس کا عنوان ہے "نقل فتویٰ علمایان دین شہر دہلی در بارہ جامع مسجد"

"سوال کیا فرماتے ہیں علمایان دین اس صورت میں کہ جامع مسجد مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن گئی ہے۔ اب حاکمان وقت نے کسی کے دین اور مذہب سے ان کو مزاحمت اور تعرض نہیں اور نہ پہلے تھا اور نماز و اذان اور اقامت جمیع اعباد و شعائر اہل اسلام علی الاعلان ان کے عہد میں بخوبی جاری تھے اور جاری ہیں از راہ نصفت و عدالت کے حکم دیا کہ اہل اسلام بدستور جامع مسجد میں نماز پڑھا کریں مگر بعض مسلمان یہ کہتے ہیں کہ تبرکات منسوبہ

حضرت سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بدستور سابق اس میں رکھے جاویں
اور صورت درگاہ کی قرار پاوے اور اکثر اہل اسلام مانع اس امر کے ہیں
اور حکام کی طرف سے تاکید ہے کہ آپس میں مسلمان اتفاق کر کے مسجد
اپنے تصرف میں لادیں ورنہ مسجد نہ ملے گی ۔ پس یہ عذر تبرکات کے رکھنے
کا جو جانب بعض اسلام سے ہے حال میں اور اس وقت ٹھیک ہے یا نہیں"۔
"جواب: یہ عذر ٹھیک نہیں اور خلاف مصلحت وقت ہے ۔ اول تبرکات
باسناد صحیحہ کہاں بلکہ بیشتر وضعی ہیں اور وہ وضع بھی اب نہیں رہی
وضع ثانی ہے ۔ دوسرے یہ کہ مسجد واسطے فرائض اور مکتوبات کے ہے
نہ واسطے زیارت تبرکات کے ۔ گو یہ اسناد ضعیفہ ثابت ہی ہو جاویں بلکہ اکابر
اہل اسلام سنن و نوافل بھی مسجد میں ادا نہ کرتے تھے اپنے گھر میں پڑھتے تھے ۔
تیسری یہ کہ اس وقت میں ایسی تکرار باہم نہ چاہیئے بلکہ تمام اہل قبلہ کو چاہیئے کہ
آپس میں اتفاق کریں اور متفق علیہ کو اختیار کریں ۔ مختلف فیہ کو چھوڑ دیں۔
چوتھے یہ کہ ایک امر زائد کی تکرار سے مقصود اصلی و مہتم باللسان یعنی صلوٰۃ
اور امامت و جماعت کو چھوڑ دینا خلاف دینداری ہے اور بموجب فساد
کہ اس نزاع و تکرار و مذہبی میں مسجد پھر مسلمانوں کو نہ ملے گی اور ہمیشہ
کفِ افسوس ملتے رہیں گے"

اس فتوی پر کل دس دستخط ہیں جن میں سات دستخط مفتی صدرالدین، مولوی محمد قطب الدین
خواجہ ضیاءالدین، سید محبوب علی جعفری، سید محمد نذیر حسین کے ساتھ مولوی رحمت اللہ دہلوی
کے وہ دستخط ہیں جو فتوی جہاد پر تھے ۔ تین دستخط محمد نقی خاں، محمد یوسف اور محمد اسمعیل
کے اس پر ایسے جو فتویٰ جہاد پر نہیں تھے
دہلی کی جنگ آزادی کے ایام میں مولوی رحمت اللہ صاحب کے ساتھ دہلی میں ڈاکٹر

محمد وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی تھے اور یہ دونوں بھی دہلی کے معرکۂ آزادی میں حصہ لے رہے تھے۔ ڈاکٹر محمد وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی دونوں آگرہ سے دہلی میں ساتھ آئے تھے۔ چنانچہ مولوی ذکاء اللہ صاحب مولوی فیض احمد صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولوی فیض احمد آگرہ میں صدر بورڈ کا سررشتہ دار تھا اور باغی ہو کر دہلی میں آیا تھا اسکو اور مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کو عدالت کا کام سپرد ہوا تھا۔[۵۱] مولوی فیض احمد ضلع بلند شہر اور ضلع علی گڑھ کی تحصیل زر مالگذاری کے لیے مقرر ہوا اور حسین بخش ازبکی بھی ضلع علی گڑھ کی مالگذاری کے لیے مقرر ہوا اور ولی داد خاں کے نام حکم بھیجا گیا کہ وہ ان دونوں آدمیوں کے کام میں امداد کرے۔ راؤ گلاب سنگھ رئیس کچیسر کے نام حکم تھا کہ وہ بارہ ہزار روپیہ جمع سرکاری کے حسین بخش اور فیض احمد کو ادا کرے۔ ظہور علی خاں رئیس دھرم پور محمد داؤد خاں رئیس بھیکم پور اور راجہ دسن سنگھ کے نام احکام تھے کہ وہ زر مالگذاری فیض احمد اور حسین بخش کو ادا کریں۔"[۵۲] مولوی عبدالحق (خلف مولوی فضل) کے ہمراہ بھی مولوی فیض احمد صاحب لگان وصول کرنے کی غرض سے گوڑگانوہ گئے تھے۔

غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط میں بھی مولوی فیض احمد صاحب کے تحصیل زر کا ذکر ہے۔[۵۳]

"بنام فیض احمد سے ضلع بلند شہر و علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے پر مقرر کیا گیا۔

بنام گلاب سنگھ حسین بخش اور فیض احمد کے ہمراہ بارہ ہزار روپیہ آمدنی بھیجی جائے۔"

بنام عبداللطیف خاں پوری اسکی آمدنی حسین بخش اور فیض احمد کے ہمراہ بھیجی جائے۔ بنام محمد ظہور علی خاں جنوری والا اور اس کی آمدنی حسین بخش اور فیض احمد کے ہمراہ بھیجی جائے۔"

---

۵۱ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ۵۲ ایضاً ص ۶۹۱ ۵۳ غدر کی صبح و شام ص ۲۲۲ ۵۴ روزنامچہ عبداللطیف ص ۷۵

دہلی کی جنگ آزادی میں جنرل بخت خاں کے آنے کے بعد ایک جان پڑ گئی تھی۔ بہادر شاہ ظفر نے ان کو جنگ کا کل مختار بنا دیا تھا۔ انہوں نے اپنی معاونت و مشورہ کے لئے ڈاکٹر وزیر خاں کو اپنے ساتھ رکھا اور معرکوں میں بھی بھیجا۔ ڈاکٹر وزیر خاں کی جنگ آزادی میں شرکت کا پتہ روزنامچہ عبداللطیف خاں سے بھی لگتا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں

۱۲ وزیر خاں ڈاکٹر شاطر اکبر آبادی را خواہش سورش در گرفت امروز با مردم سورش گر نعرہ اشتعال آمیز و آتش زن شد چوں شعلہ کارزار انگریزاں آزار جاں فتنہ انگیزاں شد جائے فرار شہر شد۔ ۷۵

اکبر آباد کے چالاک ڈاکٹر وزیر خاں کی طبیعت سورش و فساد کی طرف مائل ہوئی۔ آج انہوں نے فسادیوں کے ساتھ اشتعال آمیز نعرہ لگایا اور اک آگ سی لگا دی۔ جب انگریزوں کی لڑائی کا شعلہ فتنہ انگریزوں کی جان کا آزار بن گیا تو بھاگ کر شہر میں آ گئے۔

دہلی سے ہندوستان کے دوسرے مقامات پر جنگ آزادی کو چلانے اور کامیاب کرنے کے لئے لوگ جاتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے آگرہ میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے واسطے اپنے اختیار کے حصول کے لئے بہادر شاہ ظفر سے خواہش کا اظہار اور دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا۔ اس کا ذکر بھی روزنامچہ عبداللطیف خاں میں ہے۔

۲۶ جولائی۔ امانت علی تھانیدار انگریزی سرلسبر و کار تھانیداری آوردہ سر بسر کار شاہی نہادہ خواستگار شد۔ تھانیدار شد و عبدالحق بگور گانوہ و تفضل حسین بہ سنپت بہ تحصیلداری مامور شدند سعادت خاں و اکبر خاں ابراہیم علی خاں و غلام علی خاں و غلام رسول خاں و محمد علی خاں

امانت علی تھانیدار انگریزی۔ تھانیداری کے منصب کا ارادہ کر کے سرکار شاہی میں حاضر ہوا اور تھانیداری کا خواستگار ہوا۔ چنانچہ تھانیدار بنا دیا گیا۔ اور عبدالحق کو گور گانوہ کا اور تفضل حسین کو سونی پت کا تحصیلدار مقرر کیا گیا۔ سعادت خاں، اکبر خاں، ابراہیم علی

لہ روزنامچہ عبداللطیف خاں ص ۷۵

خاں و رشتہ داراں تاج محل و فضل حسین خاں	خاں، غلام علی خاں، غلام رسول خاں محمد علی خاں
وزیر خاں و نند ہاری لال منا صاحب جلیلہ را	اور تاج محل کے رشتہ دار اور فضل حسین خاں
امیدوار شدند	اور وزیر خاں بڑے بڑے عہدوں کے
	امیدوار ہوئے۔

چنانچہ صاحب "تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند" نے ڈاکٹر وزیر خاں صاحب کی اودھ کی صوبیداری کی تقرری کے بارے میں لکھا ہے

"اودھ کا صوبیدار ڈاکٹر وزیر خاں کو مقرر کیا تھا جو آگرہ کا سب اسسٹنٹ سرجن تھا اور باغی ہو کر دہلی آیا تھا اور بخت خاں کا بڑا دوست۔ مگر وہ گیا نہیں۔ (۶۸۹)"

یہاں بھی منشی ذکاء اللہ صاحب کو بھول ہوئی۔ انہوں نے حسب عادت احتیاط سے کام کیا۔ حالانکہ ڈاکٹر وزیر خاں صوبیدار اودھ بننے کے بعد آگرہ پہنچا اور وہاں پہنچکر ایسا انتظام کر آئے تھے کہ جولائی ۱۸۵۷ء میں مجاہدین کی جنگ کی وجہ سے آگرہ کے تقریباً تمام انگریز آگرہ کے قلعہ میں محصور ہو گئے تھے اور تین مہینے تک قلعہ میں محصور رہے اور اکتوبر کے وسط میں ان کو رہائی نصیب ہوئی۔

جب آخری حملہ ڈاکٹر وزیر خاں کے زیر کمان کشمیری گیٹ کے ایک محاذ پر انگریزی فوج پر ہوا جس میں شاہی فوج نے بے مثال بہادری اور جرأت کا ثبوت دیا لیکن کشمیری گیٹ کے دوسرے محاذ پر مرزا مغل برسر پیکار تھے۔ وہاں مجاہدین کو شکست ہوئی جس کی وجہ سے جنگ کا نقشہ ہی پلٹ گیا اور انگریزوں کا دہلی پر قبضہ ہو گیا۔ اس وقت جنرل بخت خاں کے مشورہ پر ڈاکٹر وزیر خاں اپنی فوج کو لے کر علیحدہ ہو گئے اور جنرل بخت خاں ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد بدایونی[1] مقبرہ ہمایوں میں بہادر شاہ ظفر سے جا کر ملے ان کو

---

[1] مولانا فیض احمد بدایونی

حالات سے باخبر کیا اور اپنے ہمراہ چلنے کو کہا۔ لیکن بادشاہ نے زینت محل کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے چلنے سے انکار کیا۔ بہادرشاہ ظفر اگر یہ بات مان لیتے تو شاید کچھ صورت بدل جاتی۔ بادشاہ کے انکار کر نے کے بعد جنرل بخت خاں ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے دہلی کو خیرباد کہدیا۔ چنانچہ "باغی ہندوستان" کے مؤلف لکھتے ہیں۔

"بادشاہ جو اس درمیان میں قلعہ سے نکل کر مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزیں ہو چکے تھے مع متعلقین گرفتار کر کے قلعہ میں نظر بند کر دیئے گئے۔ تین شاہزادوں کو قلعہ میں داخل ہوتے ہی گولی کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے سروں کو خوان پوش سے ڈھک کر خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے بطور تحفہ پیش کیا گیا۔ انہیں میں مرزا مغل بھی تھے۔ جنرل بخت خاں اپنی فوج اور توپ خانے کو نکال لے گئے۔ بادشاہ سے کہا کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں مگر وہ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے تھے آمادہ نہ ہوئے۔ جنرل بخت خاں ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد وغیرہ سب لکھنؤ چلے گئے (۱۵۷)"

دہلی کو خیرباد کہنے کے بعد جنرل بخت خاں، ڈاکٹر محمد وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے فوج کو جمع کرنے کے جتن کئے اور وسط فروری ۱۸۵۸ء کو فیروز شاہ کے ساتھ شہر لکھنؤ کے باہر پہنچے۔ ان کی آمد کی اطلاع جب حضرت محل کو پہنچی تو انھوں نے ان کو دوشالے اور رومال کے خلعت کے ساتھ پانچ ہزار روپے دعوت کے بھیجے۔ ان حضرات کے ساتھ پانچ ہزار تلنگے، ۵ ضرب توپ، ایک ہوٹ، چوبیس پنی میگزین، پچاس ہاتھی تھے۔

اس فوج کو جلال آباد کے مورچہ پر لگا یا گیا ۲ر مارچ ۱۸۵۸ء کو جنرل اوٹرم نے پانچ ہزار فوج کے ساتھ ان پر حملہ کیا۔ مجاہدین نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بہادری کے جوہر دکھائے لیکن کامیابی نصیب نہیں ہوئی مگر ان کی شجاعت اور اولوالعزمی کا سکہ انگریزی فوج پر بیٹھ گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد جب یہ لوگ شہر لکھنؤ میں آئے تو ان کے لئے ایک علیحدہ مکان کا

چتر منزل میں بندوبست کیا گیا۔ ان کے استقبال کے لئے مولوی میر مہدی اتالیق نواب جرأ زالدولہ دنواب ممتاز الدولہ گئے۔ ۵ اشرفیاں نذر کیں۔ پانچ سو روپے دعوت کے اور کئی کشتی پوشاک پارچہ سفید خلعت میں دیئے کئی دن کے بعد مرزا بلاقی داماد شاہ دہلی اور مرزا کوچک بہادر شاہ ظفر کے بیٹے ان سے ملنے کے لئے ملکہ گنج میں آئے۔[1]

۱۹ رجب مطابق ۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو جنرل مارٹن کی کوٹھی کے قریب مجاہدین نے مورچہ قائم کیا۔ دوسرا مورچہ بخت خاں ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد صاحب نے چکرانولی کوٹھی کی طرف لگایا۔ یوسف خاں، ممو خاں کے بھائی کو حکم ہوا کہ وہ اپنی فوج لے کر کمک کو جائیں رسد رسانی کا کام شرف الدولہ غلام رضا کے سپرد ہوا۔ جنگ شروع ہوئی تو طرفین سے خوب مقابلہ ہوا مولوی احمد شاہ نے ککرال پر تیسرا مورچہ قائم کیا۔ سلطان پور سے انگریزوں کی جو تازہ فوج آئی تھی اس کا نواب شرف الدولہ سے مقابلہ ہوا۔ یہ ککرال پر اپنے ساتھیوں سمیت کھڑے تھے۔ توپ کا گولہ ان کے ہاتھی پر لگا۔ یہ گھبرا گئے اور اپنے گھر واپس چلے آئے۔ اُدھر محلات پر گولہ باری ہونے لگی تو بھگدڑ مچ گئی۔ چکراولی کے مورچہ پر انگریزی فوج کا دباؤ پڑنے لگا تو شاہ صاحب داد شجاعت دیتے رہے۔ حضرت محل بھی ممو خاں کے ساتھ فوج کے لڑانے میں سرگرمی دکھا رہی تھیں۔ شاہ صاحب نے اپنے مورچے کا رنگ بگڑتے دیکھا تو اپنے ساتھیوں سے کہا جسے ہمارا ساتھ دینا منظور ہو وہ علیحدہ ہو جائے۔ جاں نثار علیحدہ ہو گئے۔ سب نے ڈٹ کر لڑنے اور نہ بھاگنے کی قسم کھائی مورچہ کو بدلا۔ سرائے معتمد الدولہ میں آکر ٹھہرے۔ عیش باغ میں ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ شاہزادہ فیروز شاہ اور مولوی فیض احمد صاحب کو مع تلنگوں کے پل پر مقرر کیا۔ مگر نواب ممو خاں کی جلد بازی اور گھبراہٹ اور بے موقع میدان سے ہٹنے کی وجہ سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ حضرت محل برجیس قدر کو لے کر لکھنؤ سے نکل کھڑی ہوئیں اور شاہ صاحب، ڈاکٹر وزیر خاں، فیروز شاہ اور مولوی فیض احمد کو اپنے ہمراہ لے کر بدایوں روانہ ہو گئے۔[2]

---

[1] قیصر التواریخ دوم ص۲۱۲ [2] ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء ص۲۳۹

شروع اپریل ۱۸۵۸ء کو بدایوں میں نیاز محمد خاں کو یہ خبر ملی کہ محسن علی خاں جس کو ہوپ گرانٹ نے شکست دیدی ہے۔ بریلی جاتے وقت بدایوں سے گذرے۔ اس خبر سے نیاز محمد خاں، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے جنگی فضا اور ماحول کو سازگار بنانے کے لئے جہادی فتوی بدایوں میں شائع کرایا اور ڈاکٹر وزیر خاں کو دوسرے درجہ کا کمانیر بنایا۔[۱] اور تین سو آدمی بریلی سے طلب کئے۔ یہ انتظام کرکے مجاہدین نے حملہ کا ارادہ کرلیا۔

۲۷ر اپریل کو جنرل سی مع ولسن لونی تارپور کے گھاٹ سے گنگا عبور کرکے اوسہت کی طرف آیا۔ اس کے ساتھ دو سو نوجوان پنجابی، ۶ بلوچ پلٹن ڈھائی سو گیارہ دیسی پلٹن اور چھ بھاری اور ہلکی توپیں تھیں۔ کپتان گون کو متعین کیا گیا کہ ککرالہ گی مٹرک سے چار میل کے فاصلہ پر جہاں نواب خان بہادر خاں کی فوج ہے۔ یا تو اُن کو بھگا دے یا گرفتار کرلے۔

۲۹ر اپریل کو جنرل سی چاندنی والی راتوں میں تیزی کے ساتھ فوج لے کر چلا اور اوسہت کے قریب پہنچ گیا۔ انگریزی فوج کے ککرالہ پہنچنے سے ایک دن پہلے جھم کے ایک باغ میں جہاں قصبہ کھلیان کی مجاہدین حفاظت کر رہے تھے وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے جن میں معمر لوگ بھی تھے۔ چھوٹے خاں نے سوار کی بہت آؤ بھگت کی۔ دوران گفتگو یہ بات واضح ہوگئی کہ قصبہ کے لوگ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ سوار کو یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی اور اہل قصبہ کثرت سے جمع ہوگئے۔ سوار کے رفقا بھی ارد گرد سے آگئے۔ اب قصبہ والوں کو اس بات کا علم ہوگیا کہ یہ سوار شہزادہ فیروز ہے۔ لوگوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

انگریزی فوج نے آدھی رات کو ککرالہ کی طرف رُخ کیا اور آدھا راستہ طے کرکے دم لیا تاکہ پیدل فوج بھی آکر ان سے مل جائے۔ جب پیدل فوج آگئی تو اس کو حکم ملا کہ وہ آہستہ آہستہ چلے۔ جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ صبح صادق کا وقت تھا کہ مجاہدین کا ایک گروہ آتا

---

[۱] کنز التاریخ ص ۴۲۱

ہوا نظر آیا۔ جنھوں نے چار توپیں سر کیں مگر کوئی دشمن زخمی نہیں ہوا۔ انگریزوں نے جوابی توپوں کے فیر کئے۔ مجاہدین نے موقع پا کر انگریزی فوجوں کو تلوار پر رکھ لیا اور کلہ بکلہ لڑائی شروع ہو گئی[1]۔ انگریزی فوج نے مجاہدین کی شمشیر زنی کی تاب نہ لا کر درختوں کی آڑ میں توپیں چلائیں جن سے مجاہدین کو کافی نقصان ہوا۔ لیکن اسی کے ساتھ گولہ انداز کے نشانہ سے "جنرل سی" کا سر اُڑ گیا اور کسی مجاہد کی تلوار نے اس کا خون پیا[2]۔

سورج نکلنے پر کرنل جونسن مع پیادہ فوج کے آگودا۔ اس فوج نے ککرالہ کے مجاہدین کو گھیرے میں لے لیا جس کی وجہ سے ایک ہزار محبان وطن شہید ہوئے۔ فیروز شاہ اور ڈاکٹر وزیر خاں کے ساتھیوں نے کچھ سامان اور فوج لے کر پچھم اور موضع گھبوائی سے پورب کی جانب ایک جھاڑی والے ٹیلہ کی آڑ سے مورچہ لگایا۔ پھر بھی ناکامی ہوئی۔ بدایوں کی طرف مجاہدین روانہ ہوئے توپ خانہ نے دور تک ان کا تعاقب کیا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر لکھتا ہے۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یہ "سرفروش جماعت ڈاکٹر وزیر خاں کے رفقاء (مولوی فیض احمد بدایونی اور شہزادہ فیروز شاہ) کی تھی"۔

ککرالہ کے معرکے کے بعد شہزادہ فیروز شاہ، مولوی فیض احمد بدایونی اور ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ بریلی پہنچ گئے۔ فیروز شاہ نواب خان بہادر خاں کے پاس رہ گئے۔ اور مولوی فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں شاہ احمد اللہ صاحب کے پاس شاہجہانپور چلے گئے[3]۔

۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو شاہجہانپور میں جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی۔ فرنگی گرجا میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اسی اثنا میں ہندوستانی فوجیوں نے شہر پر حملہ کر دیا اور قلعہ پہنچ کر نواب غلام قادر کو ناظم شہر مقرر کیا اور سند نظامت نواب خان بہادر خاں سے حاصل کی۔ اس دوران میں بخت خاں نواب فرخ آباد مع فیروز شاہ اسماعیل خاں فتح گڈھ کی ناکامی کے بعد شاہجہانپور پہنچ گئے[4]۔ مولانا

---

[1] کنز التاریخ ص ۳۴۳ [2] ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء ص ۲۴۰ [3] مولانا فیض احمد بدایونی ص ۳۹ [4] تاریخ بغاوت ہند آگرہ اکتوبر ۱۸۵۹ء

احمد اللہ شاہ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد رسوا بدایونی پہلے آچکے تھے۔ مولانا احمد اللہ شاہ نے منتشر فوج کو جمع کیا اور ۲۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو بجھیریہ کے مقام پر انگریزوں سے مقابلہ ہوا۔ نواب نظام علی خاں سکنہ شہباز نگر جو فوج کے اس وقت کمانڈر تھے انہوں نے انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دیے اور بالآخر جنگ لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ انگریز کامیاب ہوئے۔ شہر کی حفاظتی فوج احمد اللہ شاہ کے سپرد تھی۔ جب انگریزی فوج شاہجہاںپور کی طرف بڑھی تو شاہ صاحب نے شہر خالی کر دیا۔ انگریزی فوج نے پرانی جیل کے پاس مورچہ لگایا۔ شاہ صاحب نے تین روز کے بعد پلٹ کر حملہ کیا اور یہ حملہ ۳ مئی سے ۹ مئی ۱۸۵۸ء تک جاری رہا۔ محصورین کی حالت نہایت نازک ہو رہی تھی۔ جنرل جونس ایک فوج لے کر آیا۔ لیکن وہ شاہ صاحب کے مضبوط مورچہ پر حملہ نہ کر سکی۔ بے ترتیب لڑائیاں ہوتی رہیں کہ اس عرصہ میں شاہ صاحب کی مدد کے لئے فیروز شاہ اور حضرت محل کی فوجیں آگئیں۔ ۱۵ مئی ۱۸۵۸ء کو شاہ صاحب نے دشمن پر سخت حملہ کیا مگر انگریزی فوج کو نقصان نہیں پہنچا۔ ۲۸ مئی کو سر کالن کیمبل بڑی کثیر فوج لے آیا۔ اس وقت سب کی یہ رائے ہوئی کہ یہاں سے ہٹ کر محمدی پور کی گڑھی پر مورچہ لگایا جائے وہاں شاہ صاحب نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ وزیر جنگ جنرل بخت خاں مقرر ہوئے۔ قاضی القضات مولوی سرفراز علی جونپوری نانا راؤ پیشوا دیوان بنے۔ کونسل کے اراکین مولوی لیاقت علی الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی اور مولوی فیض احمد بدایونی۔ شاہزادہ فیروز شاہ منتخب ہوئے سکہ شاہ صاحب کے نام کا جاری ہوا[1]

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ ‏ حامی دیں محمد احمد اللہ بادشاہ

سر کالن کیمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کر دیا تو خوب مقابلہ رہا۔ باہمی نفاق کی وجہ سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور یہاں بھی جنگ میں ناکامی ہوئی شاہ صاحب راجہ بلدیو سنگھ کے کہنے پر ۱۵ جون ۱۸۵۸ء کو پرگنہ پویان میں سوار ہوئے۔ تنہا ہاتھی پر سوار تھے۔ بلدیو سنگھ کے

[1] تاریخ شاہجہانپور اول ص ۱۳۷

بھائی نے پھاٹک بند کر کے شاہ صاحب پر گولیوں کی ایک ساتھ بوچھاڑ کی سینہ چھلنی ہوگیا اور جاں بحق ہو گئے۔ ڈاکٹر وزیر خاں حجاز پہنچے اور مکہ معظمہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے پاس مقیم ہوئے۔ وہیں مطب کھولا اور زندگی کا آخری حصہ مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ گذارا وہیں فوت ہوئے اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے "

جنرل بخت خاں ایسے روپوش ہوئے کہ یہ بھی پتہ نہ لگا کہ ان کا انتقال کہاں ہوا۔ مولانا فیض احمد بدایونی کے بارے میں غالب خیال تو یہی ہے کہ وہ فرنگیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے اس کا بھی امکان ہے کہ وہ روپوش ہو گئے ہوں کہاں انتقال ہوا۔ اس کا بھی پتہ نہیں چل سکا۔

ضلع مظفر نگر کے قصبوں میں خاندانی رشتہ داریاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ نانوتہ۔ کیرانہ اور کاندھلہ کے خاندانوں میں حاجی امداد اللہ صاحب مولانا رحمت اللہ صاحب کرانوی اور مولانا ابوالحسن صاحب کاندھلوی کی آپس میں رشتہ داریاں ہیں۔ چنانچہ مولانا احتشام الحسن صاحب مؤلف "حالات مشائخ کاندھلہ" . . . . . حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے خاندان سے اپنی رشتہ داری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس خاندان کے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ سے روحانی اور ایمانی تعلق کے علاوہ رشتہ داری کا تعلق بھی قائم تھا۔ حضرت مفتی الٰہی بخش کی صاحبزادی کی نواسی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی اہلیہ تھیں اور حضرت حافظ صاحب کی بھتیجی حضرت مولانا مظفر حسین کی اہلیہ تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی نسلی رشتے ان بزرگوں سے قائم تھے اور قصبہ تھانہ بھون کے جن مجاہدین نے نمایاں طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں، سر فروشی کی سب کے ساتھ رشتہ داری تھی۔ قرابت و یگانگت

تھی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کرانوی مہاجر مکی (جنھوں نے کرانہ سے
علم جہاد بلند کیا) سے بھی رشتہ اور قرابت کے تعلقات وابستہ تھے اور
وہ اتحاد و یگانگت تھی جس کی بنا پر ایک ہی خاندان شمار ہوتا تھا (١٦١)"

اس خاندانی مناسبت کی بنا پر بھی ١٨٥٧ء کی جنگ آزادی کا مولانا رحمت اللہ صاحب
اور ان کے رفقاء نے کیرانہ میں اور حاجی امداد اللہ صاحب اور ان کے رفقا نے شاملی اتھانہ بھون
میں آپس میں مل کر ایک محاذ قائم کیا اور باہمی مشوروں سے یہ دونوں جنگیں لڑی گئیں جس کے
بارے میں مولانا سلیم صاحب نبیرہ مولانا رحمت اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"پرگنہ کیرانہ و شاملی میں زمیندارہ شیوخ اور مسلمان گوجروں کے ہاتھوں میں تھا
جن میں دیانت داری کے ساتھ جوش بھی موجود تھا۔ تھانہ بھون اور کیرانہ کا
ایک محاذ قائم کیا گیا۔ مجاہدین کی جماعت مدافعت اور مقابلہ کرتی رہی۔ شاملی
کی تحصیل پر حملہ کیا گیا۔ پرگنہ کے چاروں طرف اس مجاہدانہ تحریک کا اثر عام
ہو چکا تھا۔ تھانہ بھون میں حاجی امداد اللہ صاحب اور مولوی عبد الحلیم تھانوی
مع رفقا اور نواح کیرانہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ مرحوم گورہ فوج کا مقابلہ
کر رہے تھے"[1]

جب ہندوستان میں ١٨٥٧ء کی جنگ آزادی شروع ہو گئی تو ضلع مظفر نگر میں بھی
یہ چنگاری پھیلی اور حاجی امداد اللہ صاحب نے اس سلسلہ میں اپنے ساتھیوں اور عقیدتمندوں
سے تبادلہ خیال کیا۔ جناب شیخ محمد نے اپنی بے سروسامانی کا ذکر فرما کر جہاد کی مخالفت کی۔
جس پر مولانا قاسم نانوتوی نے جواب دیا کہ کیا ہم "اصحاب بدر سے بھی زیادہ کمزور ہیں"۔
امیر امداد اللہ صاحب نے طرفین کی گفتگو سننے کے بعد فرمایا۔ الحمد للہ انشراح
ہو گیا۔ اب جہاد کی تیاری شروع کی جائے۔ امیر امداد اللہ صاحب نے امامت قبول
کی اور مولانا قاسم نانوتوی سپہ سالار قرار پائے۔ معاون قاضی، مولانا رشید احمد گنگوہی

[1] ایک مجاہد معمار ص٢٤

مقرر ہوئے ۔اس طرح قصبہ تھانہ بھون دارالسلام قرار پایا۔[1]

قاضی سعادت علی خاں خلف نجابت خاں رئیس اعظم تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے دو صاحبزادوں عبدالرحیم خاں اور عنایت علی خاں نے بھی اپنے قصبہ کی جنگ آزادی میں نمایاں طور پر حصہ لیا ۔عبدالرحیم صاحب کو سہارنپور سے ہاتھی منگانے کے لئے بھیجا گیا تاکہ دہلی میں کمک بھیجی جائے ۔چنانچہ عبدالرحیم صاحب اپنے چند احباب کے ساتھ سہارنپور پہنچے اور سرائے میں کسی دوست کے پاس قیام کیا ۔کسی مخبر نے ضلع حکام کے پاس اس بات کی اطلاع پہنچادی ۔چنانچہ ان کی گرفتاری کے لئے گارد آیا ۔جو عبدالرحیم صاحب اور ان کے ہمراہیوں کو گرفتار کرکے لے گیا اور جیل میں بند کردیا اور چند روز کے بعد عبدالرحیم صاحب کو پھانسی دے دی گئی ۔

اس واقعہ سے تمام ضلع میں انگریزوں کے خلاف اور نفرت پھیل گئی اور جب قاضی عبدالرحیم صاحب کے بڑے بھائی عنایت علی صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی کے پھانسی پانے کی اطلاع ملی تو بہت رنجیدہ اور مغموم ہوئے اور بھائی کا انتقام لینے اور جنگ آزادی کو کامیاب کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ۔

اتفاق کی بات ہے اس وقت چند فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جارہے تھے ۔قاضی عنایت علی خاں کو اس کی اطلاع ملی ۔یہ جذبۂ جہاد سے مست اپنے رفقاء اور تھانہ بھون کے لوگوں کو ساتھ لیکر شیر علی خاں کے باغ کے سمت سڑک پر جا پڑے اور جب سوار سامنے سے گذرے تو ان کا سامان لوٹ لیا اور ایک سوار زخمی ہوکر مشرق کی سمت جنگل کی طرف بھاگا ۔مگر تھوڑے ہی فاصلہ پر گھوڑے سے گر کر مرگیا ۔[2]

اس بغاوت کی اطلاع مظفر نگر کے حکام کو پہنچی تو حکام نے شاملی پر فوج کشی کا حکم دیا ۔

---

[1] سیرت حاجی امداد اللہ اور ان کے خلفاء ص۱۰۱ [2] تذکرۃ الرشید جلد دوم ص۴۳

جس پر عنایت علی خاں صاحب نے علی الاعلان بغاوت کا علم بلند کر دیا اور شاملی کی طرف انگریزی فوج کی جانے کی خبر پا کر نقارہ بجایا گیا اور جتھے کے جتھے تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑے تحصیل کے اہلکاروں کو قتل کیا، خزانہ لوٹا اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا۔ چنانچہ جب حاکم شاملی وہاں پہنچا اور اس نے ہر چار طرف نعشوں اور قصبہ کی ویرانی و بربادی کو دیکھا تو غصہ سے تھرا اٹھا اور آخر یہ کہہ کر "تھانہ بھون بھی اسی طرح مسمار کرا کے چھوڑوں گا" مظفر نگر چلا گیا۔ اس کی اس بات سے قصبہ اور اطراف قصبہ میں بغاوت کی لہر اور پھیل گئی۔

قاضی عنایت علی خاں صاحب اپنے قصبہ کے معاملات و تصفیے طے کیا کرتے تھے جب وہ شہید ہو گئے اور بغاوت پھیل گئی تو عوام حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور ان سے قاضی بننے اور عدالت کرنے کے لئے کہا جس کو آپ نے منظور کیا۔ چنانچہ اس کے بارے میں صاحب تذکرۃ الرشید نے تحریر کیا ہے۔

"عام باشندگان قصبہ کی یہ حالت ہوئی کہ ان کا مربی و منتظم بادشاہ سر سے اُٹھ گیا اور شرعی و طبعی ضروریات و مخصمات میں بھی کوئی خبر گیر ان کا نہ رہا جس کی رائے پر عمل کریں۔ پس یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گزران دشوار ہے ... اس لئے آپ ہمارے دینی سردار ہیں۔ دنیاوی نظم حکومت کا بھی بار اپنے سر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی تنفیے چکایا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیحضرت کو ان کی درخواست کے موافق اُن کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ نے دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق قاضی شرع بنکر فیصل بھی فرمائے۔ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) اقدس سرہ دس برس ہوئے اعلیحضرت کو اپنے دین و دنیا کا سردار بنا ہی چکے تھے۔ ہمیشہ آمد و رفت رہتی تھی ... اعلیٰ حضرت کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضایا میں مولوی کی ضرورت تھی

کہ حق بات میں اعانت کرتا رہے۔ اس لئے آپ (مولانا رشید احمد گنگوہی

اور مولانا محمد قاسم صاحب مع دیگر خدام کے یہیں رہ پڑے ۔" (۱۳۸)

جب انگریزی فوج قصبہ میں پھیلنی شروع ہوگئی تو مجاہدین نے ان کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا اس پر آشوب زمانہ میں جبکہ عام لوگ احتیاطی طور پر گھروں میں بیٹھنے کو بہتر سمجھتے تھے اور پریشان و سراسیمہ رہتے تھے۔ حاجی امداد اللہ صاحب اور ان کے رفقا پر کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو جب کسی ضرورت کے لئے شاملی، کیرانہ یا مظفر نگر جانے کی ضرورت ہوئی تو انتہائی اطمینان کے ساتھ جاتے اور آتے تھے۔ ان ایام میں آپ کو انگریزی فوج سے مقابلہ بھی کرنا پڑتا تھا جو غول کے غول پھرتے تھے۔ ان حضرات کے پاس تلواریں رہتی تھیں۔

ایک مرتبہ حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا رشید احمد گنگوہی، حافظ ضامن صاحب اور مولانا قاسم صاحب کا انگریزی فوج سے مقابلہ ہوا۔ یہ حضرات اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گئے اور یہ قلندر و درویش صفت ہاتھوں میں تلواریں لئے جم غفیر فوج کے سامنے ایسے جمے رہے۔ گویا زمین نے ان کے پاؤں پکڑ لئے۔ مقابلہ ہوا کافی دشمنوں کا خاتمہ کیا۔ دونوں طرف گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی کہ حافظ ضامن صاحب کے زیر ناف ایک گولی لگی اور شہید ہو گئے۔ اسی طرح مولانا قاسم کے بھی گولی لگی اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کنپٹی پر گولی لگی تھی اور دماغ پار کر کے نکل گئی۔ حاجی امداد اللہ صاحب نے آگے بڑھ کر زخم پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔ "کیا ہوا میاں" عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا تو کہیں گولی کا نشان تک نہ تھا اور تعجب یہ تھا کہ خون سے تمام کپڑے تر تھے [1]

مولانا یعقوب نے بھی اس جنگ آزادی میں مولانا قاسم کی شرکت کا ذکر کیا ہے۔

"اسی عرصہ میں غدر ہو گیا۔ بعد رمضان احقر کو سہارنپور لینے کو تشریف لائے چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے۔ اس وقت راہ چلنا بدون ہتھیار اور سامان

---

[1] تذکرۃ الرشید جلد اول ص ۷۵

کے دشوار تھا۔ جب احقر دہلی پہنچا، چند ہنگامہ مفسدین کے پیش آئے جس میں
مولانا (قاسم) کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی۔ اسی زمانہ میں ہمارے بھائی
ہم عمر اکثر بندوق اور گولی لگانے میں مشق کرتے رہتے تھے۔ ایک دن آپ
مسجد میں سے آئے کہ ہم گولیاں لگا رہے تھے اور نشانہ کی جائے پر ایک نیم
کا پتہ رکھا تھا اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا تھا۔ قریب سے بندوق
لگاتے تھے۔ گولیاں مٹی کی تھیں۔ مولوی (قاسم) صاحب نے فرمایا کہ بندوق
کیونکر لگاتے ہیں۔ مجھے بھی دکھلاؤ۔ کسی نے ایک فیر کی اور قاعدہ نشانہ کا ذکر
کیا۔ تب بندوق ہاتھ میں لے کر فیر کی صاف گولی نشانہ پر لگی اور وہ سب مشاق
کتنی دیر سے لگا رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔ حاصل یہ کہ اس طوفان بے تمیزی سے سب
لوگ گھبراتے تھے۔ ہم نے کبھی مولانا (قاسم) کو گھبراتے نہ دیکھا۔ ۔ ۔ چند بار نوبت
مقابلہ کی آگئی۔ اللہ رے مولوی صاحب ایسے ثابت قدم، تلوار ہاتھ میں اور
بندوقچیوں کا مقابلہ۔ انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ بندوق ماری جس کے
سینے سے ایک مونچھ اور کچھ داڑھی جل گئی اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا۔ اور
خدا جانے گولی کہاں گئی۔ اگر گولی نہ بھی تو اتنے پاس سے سنکھ بھی بس تھا۔ مگر
حفاظت الٰہی بر سر تھی کچھ اثر نہ ہوا۔"[1]

جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور اس اطلاع کے ساتھ یہ خبر بھی قصبہ میں پہنچی کہ
علی الصباح انگریزی فوج تھانہ بھون پہنچ جائے گی تو لوگ بہت پریشان ہوئے اور تھانہ بھون
کو چھوڑنے لگے۔ قاضی عنایت علی خاں بھی تھانہ بھون کو خیر باد کہہ کے نجیب آباد کی طرف
روانہ ہوئے۔ اس کے بعد ان کا پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں گئے اور کہاں فوت ہوئے۔
چنانچہ صبح ہوئی تو وہ بلائے بے درماں اپنے ساتھ لائی۔ تھانہ بھون کو سرکاری فوج

---

[1] سوانح عمری مولانا قاسم ص ۱۷،۱۶

گھیر لیا اور شرقی جانب سے گولہ باری شروع کر دی۔ دن نکلنے پر فوج قصبہ میں داخل ہوگئی اور قتل و غارتگری اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ رات کی تاریکی چھانے سے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے کھول دیے گئے اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی گئی۔ اس کس مپرسی کے عالم میں اطراف واکناف کے دیہاتوں نے لوٹ مار شروع کر دی الغرض رات کے آنے سے پہلے ضلع کے حاکم کے اس قول پر عمل ہوا کہ "شاملی کی طرح تھانہ بھون مسمار کرا کے چھوڑ دوں گا۔

اس ظلم کے بعد قصبہ میں گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے وارنٹ جاری ہو گئے۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ تھانہ بھون کے فساد کے اصل بانی یہی اشخاص تھے اور شاملی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا جس نے بستی کے دکانوں کے چھپر تحصیل کے دروازہ پر جمع کئے اور اس میں آگ لگا دی یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے ابھی آگ بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ ان نڈر ملانوں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانہ سرکار کو لوٹا۔[1]

حاجی امداد اللہ صاحب تھانہ بھون روانہ ہونے کے بعد گنگوہ میں مولانا رشید احمد صاحب سے ملاقات کرتے ہوئے پنجلاسہ ضلع انبالہ پہنچے اور راؤ عبداللہ خاں جو وہاں کے بڑے زمیندار اور سرکار کے باعتماد لوگوں میں تھے آپ کے بڑے جاں نثار خادم اور مشہور مرید تھے۔ آپ ان کے اصطبل اسپان کی ویران و تاریک کوٹھری میں مقیم ہوئے۔ ایک روز اسی کوٹھری میں آپ نے وضو فرما کر چاشت کی نماز کے ارادہ سے مصلیٰ بچھایا اور جو لوگ وہاں موجود تھے ان سے فرمایا۔ آپ لوگ جائیں میں نفلیں پڑھ لوں۔ جس وقت یہ لوگ اور راؤ عبداللہ صاحب آپ کو تحریمہ باندھے نوافل میں مشغول چھوڑ کر کوٹھڑی سے باہر نکلے اور دروازہ بند کر کے اصطبل کے دروازہ کے قریب پہنچے تو سامنے دوش کو آتے ہوئے دیکھا یہ ہکا بکا کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ مخبر بلا کا پتلا تھا جس نے عین وقت پر روپوشی کی کوٹھڑی تک معین کر دی تھی۔

[1] تذکرۃ الرشید جلد اول ص۷۶

چنانچہ دوڑ کر اصطبل کے پاس پہنچی۔ افسر نے مسکرا کر راؤ صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں اور اپنے بے وقت آنے کو چھپانے کے لئے گھوڑے سے اترا اور یہ کہکر کہ "میں نے آپ کے ایک گھوڑے کی تعریف سنی ہے اس لئے بلا اطلاع یکایک آنے کا اتفاق ہوا"۔ اس اصطبل کی جانب قدم اٹھائے اور اس کوٹھری کے دروازے کھولتے ہوئے معلوم کیا کہ "اس کوٹھری میں کیا گھاس بھری جاتی ہے" اس وقت راؤ عبداللہ کی عجیب حالت تھی۔ ان کی اپنی گرفتاری کا یقین ہو گیا تھا۔ لیکن اللہ رب العزت کا کرشمہ دیکھیے کہ جس وقت کوٹھری کا دروازہ کھلا تو تخت پر مصلیٰ بچھا ہوا تھا لوٹا رکھا ہوا تھا۔ اور نیچے وضو کا پانی بکھرا پڑا تھا۔ لیکن آپ کا پتہ نہیں تھا۔ اس نے اصطبل کے چاروں طرف نظر دوڑائی اور باہر نکل آیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر یہ کہہ کر رخصت ہوا۔

"راؤ صاحب معاف کیجیے آپ کو اس وقت ہماری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانی پڑی لیکن ہمیں آپ کا کوئی گھوڑا پسند نہیں آیا"

جب وہ افسر چلا تو آپ واپس آئے اور کوٹھری کو دیکھا حاجی امداد اللہ صاحب سلام پھیر چکے ہیں اور مصلے پر مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں[۱]

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب انبالہ تنگری پنجلاسہ وغیرہ مواضعات و قصبات میں پوشیدہ رہ کر ۱۲۷۴ھ کو ہجرت کر کے کراچی سندھ کے راستے مکہ معظمہ پہنچ گئے اور وہیں سکونت اختیار کی اور ۱۲ / ۱۳ جمادی الآخر ۱۳۱۷ھ کو انتقال ہوا جنت المعلیٰ میں مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے ہم پہلو دفن ہوئے[۲]

مولانا محمد قاسم کی بھی گرفتاری کے لئے تلاش ہوئی۔ آپ دیوبند اور انبیٹھ وغیرہ میں روپوش رہے جس زمانہ میں دیوبند میں روپوش تھے۔ ایک روز جبکہ زنانہ مکان کے کوٹھے پر مردوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ زینہ پر آ کر آپ نے فرمایا۔ پردہ کر لو۔ یہ کہکر آپ باہر چلے گئے رہے[۳]

---

[۱] تذکرۃ الرشید جلد اول ص ۷۹ [۲] انوار العاشقین [۳] سوانح عمری مولانا محمد قاسم ص ۱۹

آپ راستے میں جا رہے تھے کہ پولیس مل گئی ۔ جو آپ کی تلاش میں تھی۔ ایک سپاہی نے آپ ہی سے پوچھا۔ مولوی قاسم کہاں ہیں۔ آپ نے ایک قدم بڑھا کر پچھلے پاؤں کی جانب نظر ڈالی اور فرمایا "ابھی تو یہاں تھا" یہ فرما کے آپ آگے چلے گئے۔ پولیس نے مکان پر جاکر تلاشی لی اور ناکام واپس ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے کچھ دن مسجد میں گذارے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ گرفتار کیا گیا اور چھ مہینے جیل میں رکھ کر تفتیش کرکے آپ کو چھوڑا۔ اسیری کے چھ مہینے آپ نے مظفر نگر جیل میں گذارے۔

کیرانہ کے لوگوں نے بھی شاملی کی تحصیل کو لٹوانے میں برابر کا حصہ لیا تھا اور کرانہ میں بھی انگریزی فوج سے ان لوگوں نے مقابلہ کیا جس میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ چودھری عظیم الدین، مولانا کے بھائی حکیم اکبر علی صاحب، حکیم محمد امین الدین انصاری صاحب، شیخ فرید الدین صاحب عرف پیرجی فدو اور شیخ حمید الدین صاحب عرف پیرجی بدّو وغیرہ نے حصہ لیا۔ کیرانہ میں چونکہ مسلمان گوجر زیادہ تھے اسلئے انکی قیادت چودھری عظیم الدین صاحب نے مولانا رحمت اللہ صاحب کے ہمراہ کی۔ اس زمانہ میں عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم و تربیت کے لئے کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا اور اعلان ہوتا تھا "ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا"

اس جملہ کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا اور پروگرام بنانا ہوتا وہ عوام کو بتایا جاتا۔ کیرانہ کے محاذ پر بظاہر شکست کے آثار نظر نہیں آتے تھے ۔ مگر بعض ابنائے وطن کی زمانہ سازی اور مخبروں کی سازش نے حالات کا رُخ بدل دیا۔

کیرانہ میں انگریزی فوج اور توپ خانہ داخل ہوا ۔ محلہ دربار کے دروازہ کے سامنے توپ خانہ نصب کیا گیا اور فوج نے محلہ دربار میں محاصرہ کرنے کے بعد قتل و غارتگری کا سلسلہ شروع کردیا جس میں شیخ حمید الدین عثمانی عرف بدّو وغیرہ شہید ہوئے ۔ ہر گھر کی تلاشی لی گئی اور عورتوں، بچوں، بوڑھوں کو فرداً فرداً گھر سے نکالا گیا [1]

[1] ایک مجاہد معمار صفحہ ۳
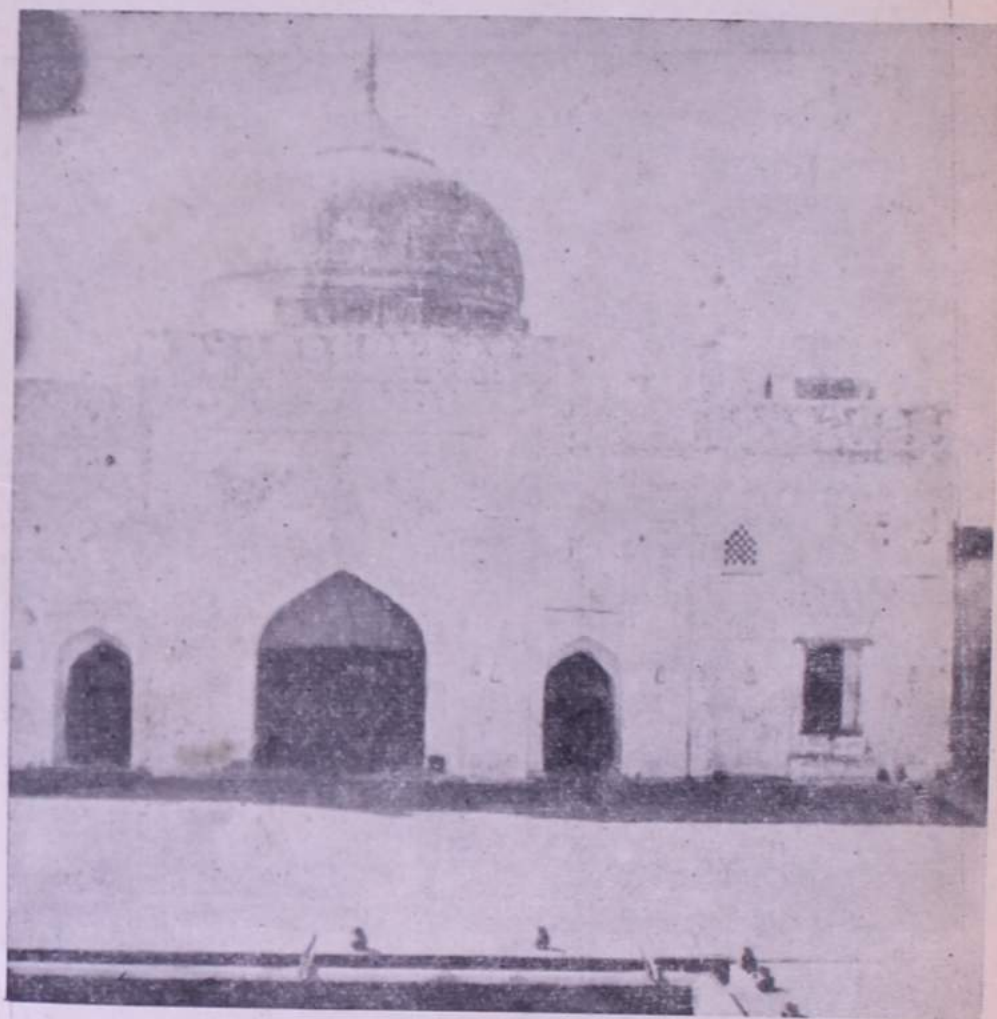
دربار کی تاریخی مسجد۔ دائیں جانب وہ دریچہ نظر آرہا ہے۔
جہاں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کچھ وقت کیلئے روپوش رہے تھے
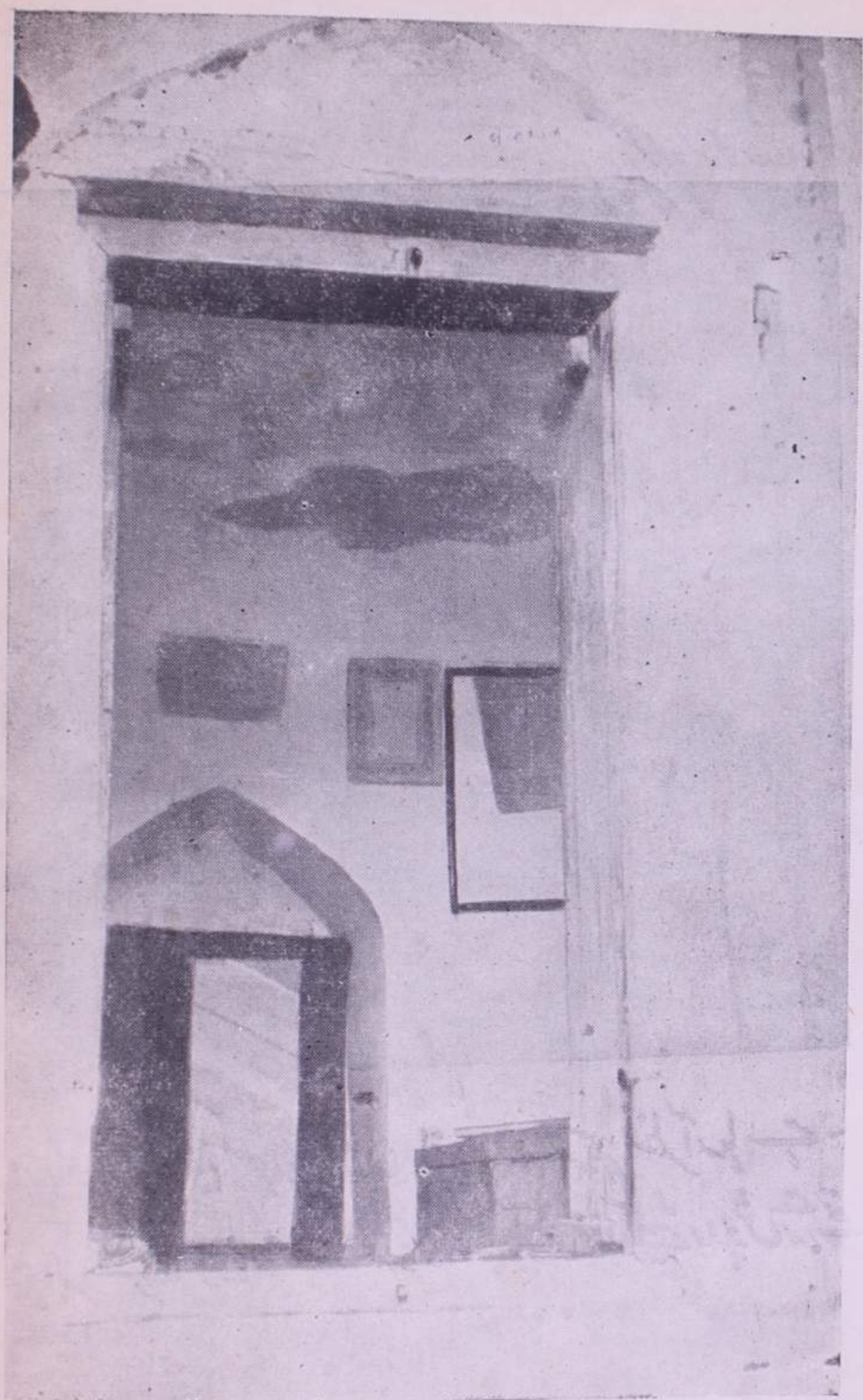
مسجد دربار کا وہ حجرہ جہاں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب روپوش رہے

مولانا رحمت اللہ صاحب پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے تحصیل شاملی کو لٹوانے میں حصہ لیا۔[1] ان کے بھی وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ مخبر نے اطلاع دی کہ مولانا صاحب دربار میں روپوش ہیں۔ اس وقت آپ دربار والی مسجد کے بالائی حصہ کی ایک کوٹھری میں جو جنوبی حصہ میں ہے تشریف فرما تھے جب آپ کو فوج کی آمد کی اطلاع ہوئی تو آپنے اس حجرہ کی کھڑکی سے چھلانگ لگائی۔ مسجد میں آپ کے ساتھی موجود تھے۔ انکے ساتھ پنجیٹھ گاؤں میں پہنچے۔ یہاں بھی آپ کی تلاش کے لئے کثیر تعداد میں فوج پہنچ گئی اور اس نے چاروں طرف سے گاؤں کا محاصرہ کر لیا اور گاؤں کے ذمہ دار لوگوں سے کہا کہ مولانا رحمت اللہ کو ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ ہم تمہارا گاؤں جلا کر خاک کر دیں گے گاؤں والوں نے انکار کیا کہ "ہم مولانا کو جانتے نہیں اور نہ ہی وہ ہمارے گاؤں میں ہیں۔ گاؤں کی تلاشی لی گئی۔ مگر مولانا کا ان کو پتہ نہ چلا اور نہ وہاں سے دستیاب ہوئے۔

پنجیٹھ کے مکھیا نے جب گاؤں میں فوج دیکھی تو اس نے مولانا کو مشورہ دیا کہ کھرپا لیکر کھیت میں گھانس کاٹنے چلے جائیں۔ انگریزی فوج اسی کھیت کی پگڈنڈی سے گذری حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب فرمایا کرتے تھے۔ میں گھانس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں اور میں ان کو اپنے پاس سے گذرتا ہوا دیکھتا تھا۔

جب مولانا رحمت اللہ صاحب گاؤں سے گرفتار نہیں ہوئے تو انگریزی فوج نے گاؤں کے حسب ذیل چودہ اشخاص کو گرفتار کیا۔

الٰہی داد صاحب[1]، شہداد[2]، علی بخش[3]، نعمت[4]۔ نہار[5]۔ بہار[6]۔ کرم علی[7]۔ بھوب شاہ[8]۔ چترو[9]، کریم الدین[10]، شہید الدین عرف سہی[11]، دہدارہ[12]، صندل[13]، محمد تقی[14]

جب مولانا رحمت اللہ صاحب کو ان چودہ آدمیوں کی گرفتاری کا علم ہوا تو آپنے

---

[1] فرنگیوں کا جال ص ۲۳۳

چودھری عظیم الدین صاحب سے فرمایا۔ ان چودہ آدمیوں کو اور ان کے رشتہ داروں کو میری وجہ سے تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ میں اپنے آپ کو فوج کے حوالے کردوں، تاکہ ان لوگوں کی تکلیف اور پریشانی دور ہو جائے اور یہ چودہ آدمی رہا ہو جائیں چودھری حاجی عظیم صاحب نے جواب میں کہا مولوی صاحب یہ تو چودہ آدمی ہیں۔ اگر پورا گاؤں بھی گرفتار ہو جائے گا اور ان کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا تو ایسے وقت بھی آپ کو فوج کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ ان چودہ آدمیوں کی رہائی کے بارے میں مولانا رحمت اللہ صاحب پیشگوئی فرما چکے تھے کہ چھ مہینے کے بعد یہ لوگ فلاں تاریخ کو رہا ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہ لوگ چھ مہینے گذرنے کے بعد اسی تاریخ کو رہا ہوئے۔

جتنے دن مولانا رحمت اللہ صاحب اس گاؤں میں رہے وہ گاؤں والوں کو وعظ و نصیحت اور تلقین کرتے رہے اور ان کے عقائد و خیالات کو بھی درست کیا۔ اس گاؤں کی میتیں پہلے گاؤں سے دور لیجا کر دفن کی جاتی تھیں۔ یہ لوگ گاؤں میں میتوں کو دفن کرنا برا سمجھتے تھے۔ آپ نے ان لوگوں کو سمجھایا اور گاؤں میں میتوں کو دفنانے کی تلقین کی تو اس وقت سے گاؤں کی میتوں کے دفنانے کا سلسلہ شروع ہوا۔

انہی ایام میں مولانا رحمت اللہ صاحب نے چودھری عظیم سے فرمایا " اب میں ہندوستان میں نہیں رہوں گا۔ تمہارا مجھ پر ہی نہیں بلکہ تمام قوم پر احسان ہے۔ میری طبیعت چاہتی ہے کہ میں دو کنوئیں تمہارے نام کر دوں " چودھری صاحب نے کہا مولوی صاحب مجھ کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہے۔ اگر میں آپ سے اپنے نام دو کنوئیں کرا لوں گا تو خدائے تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا کہ قوم کی آزادی کے لئے بھی لالچ میں پھنس گیا۔

چودھری عظیم نے اپنے گاؤں میں مولانا رحمت اللہ صاحب کو ایک روایت کے مطابق چھ سات روز اور دوسری روایت کے مطابق ایک مہینے تک پوشیدہ رکھا اس گاؤں

کے قریب جنگل ہی جنگل تھے۔ دن میں اکثر مولانا جنگل میں چلے جاتے تھے اور رات کو گاؤں میں رہتے تھے۔ چودھری حاجی عظیم صاحب اس پریشان کن زمانے میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے ہمراہ رہے اور جب تک مولانا کو انہوں نے جہاز پر سوار نہیں کرا دیا اس وقت تک ان سے علیحدہ نہیں ہوئے۔[1]

عجب اتفاق کی بات ہے کہ چودھری عظیم صاحب کے خلاف اس جنگ آزادی کی شرکت کے سلسلہ میں انگریزوں کو کوئی اطلاع نہیں پہنچی۔ اس لیے ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ چودھری عظیم ایک نیک دل اور خدا ترس زمیندار تھے پنجیٹھ کی مسجد انہوں نے ہی بنوائی تھی جس کے آج کل حافظ منظور احمد صاحب امام ہیں۔ چودھری عظیم صاحب مسلمان گوجر تھے جن کے اجداد غالباً حضرت نظام الدین کے زمانہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ چنانچہ کیرانہ میں شاہ نجم الدین صاحب خلیفہ حضرت نظام الدین کا مزار ہے۔

چودھری عظیم صاحب مولانا رحمت اللہ صاحب کی ہجرت کرنے کے ایک یا دو سال بعد حج بیت اللہ کے لئے گئے اور مکہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے ہاں مقیم ہوئے۔ انہوں نے ایک سال تک چودھری حاجی عظیم صاحب کو وہیں رکھا اور آنے نہیں دیا اور بڑی تکریم و عزت کے ساتھ دو حج کرنے کے بعد حاجی عظیم صاحب کو ہندوستان روانہ کیا۔ پنجیٹھ میں ان کا انتقال ہوا وہ اپنے خاندانی قبرستان میں آرام فرما ہیں۔ ان کی قبر کی چار دیواری پختہ تھی لیکن اب شکستہ حالت میں ہے۔

چودھری عظیم صاحب کے والد کا نام بارہ اور ان کے بھائی کا نام باقر تھا عظیم صاحب کے تین بیٹے نعمت، نورنگ، تقی تھے۔ نورنگ اور تقی لاولد فوت ہوئے نعمت کے دو صاحبزادے رحمت اور فتح ہوئے۔ فتح کے دو لڑکے شہباز عرف باچھ دوسرے تمیرا ہوئے۔ شہباز اور تمیرا حیات ہیں شہباز کی عمر اسی سال کی ہے اور تمیرا کی

---

[1] متحدہ محاذ۔ دہلی ۲۷ ستمبر ۱۹۶۴ء

عمر ساٹھ سال ہے۔ شہباز کے تین لڑکے مکھن، علی نواز اور محمد ہوئے۔ محمد کا انتقال ہو گیا
محمد کے ایک صاحبزادے بشیر الدین اور بشیر الدین کے دو لڑکے صافہ اور سادہ ہوئے۔
تمبرا کے دو لڑکے علی جنگ دوسرے کلّا ہوئے۔ علی جنگ کے تین فرزند لیاقت۔ نواب
اور اصغر ہوئے۔ کلّا کے تین لڑکے حسن، عباس اور جمشید علی ہوئے۔ باقر صاحب کی اولاد
کے نام نہیں معلوم ہو سکے۔ پنجیٹھ گاؤں میں تقریباً چھ سو کے قریب مسلمان رہتے ہیں جن
میں چودھری عظیم صاحب کی ہی اولاد چار سو کے قریب ہے[1]

جب مولانا رحمت اللہ صاحب کو انگریزی فوج گرفتار نہ کر سکی تو اُن پر مقدمہ چلایا
گیا اور مفرور باغی قرار دے کر گرفتاری کے لئے ایک ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا۔
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں ایک مجذوب تھانہ بھون میں رہتے
تھے۔ جب مولوی رحمت اللہ صاحب کی گرفتاری کا حکم ہوا اور ان کا ارادہ ہجرت کا
ہوا تو لوگوں نے کہا۔ مجذوب صاحب سے ذرا مشورہ لینا چاہیے۔ چنانچہ ان کی خدمت
میں گئے اور عرض کیا۔ انہوں نے فرمایا "جاؤ کچھ نہیں ہوگا" اس کے بعد مزید اطمینان
کے لئے مولوی رحمت اللہ صاحب ان کے پاس گئے۔ تب مجذوب صاحب نے فرمایا
چلا جا یہاں سے نہیں رہ سکتا فاضل ہو کر اور اپنے والد صاحب کا نام لے کر کہا کہ
تین روپیہ اُن کی طرف سے اور چھ روپیہ میری طرف سے بھی تجھے ملتے رہیں گے"
مولوی رحمت اللہ صاحب نے ہجرت کا قصد کر لیا اور اس تاریخ سے نو روپیہ ماہوار
ان کو برابر ملا کئے۔ اس میں کبھی فرق واقع نہیں ہوا[2]

اس پُرآشوب دور میں جبکہ علماء ہند کا ممتاز اور باوقار طبقہ اور حضرت حاجی امداد اللہ
صاحب جیسے مجاہد ہجرت فرمار ہے تھے۔ انہی ایام میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب

---

[1] اخبار متحدہ محاذ دہلی، ۲۷ ستمبر ۱۹۶۲ء [2] تذکرۃ الرشید جلد دوم ص ۲۷۵

چودھری محمد عظیم کی تعمیر کردہ پنجپیٹھہ کی جامع مسجد
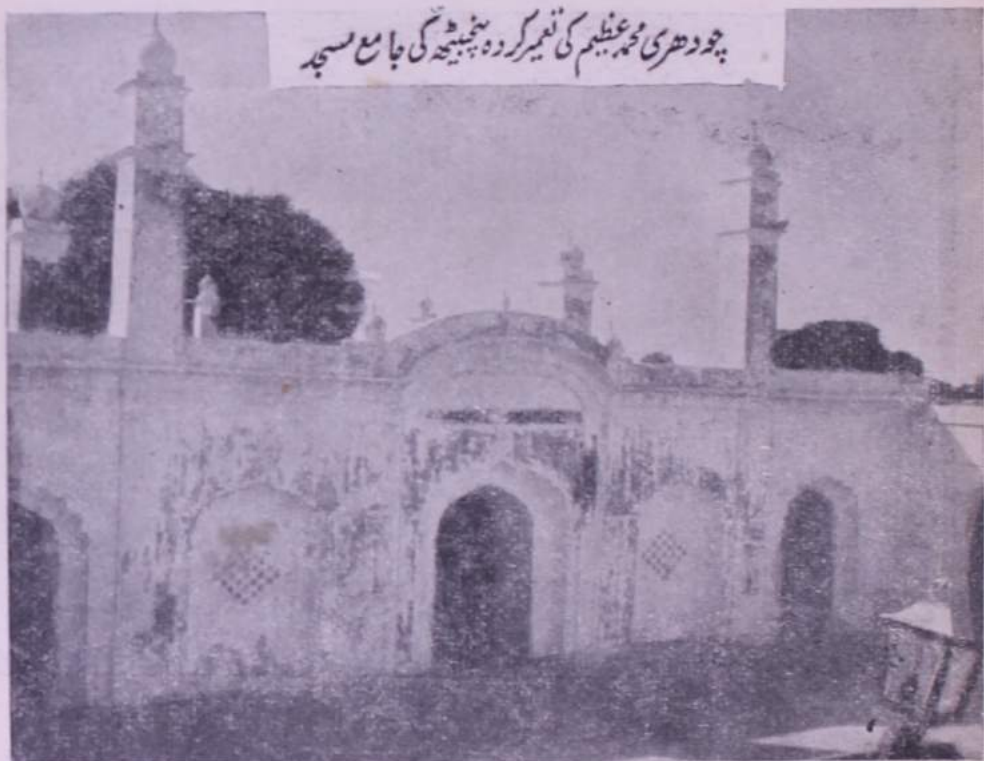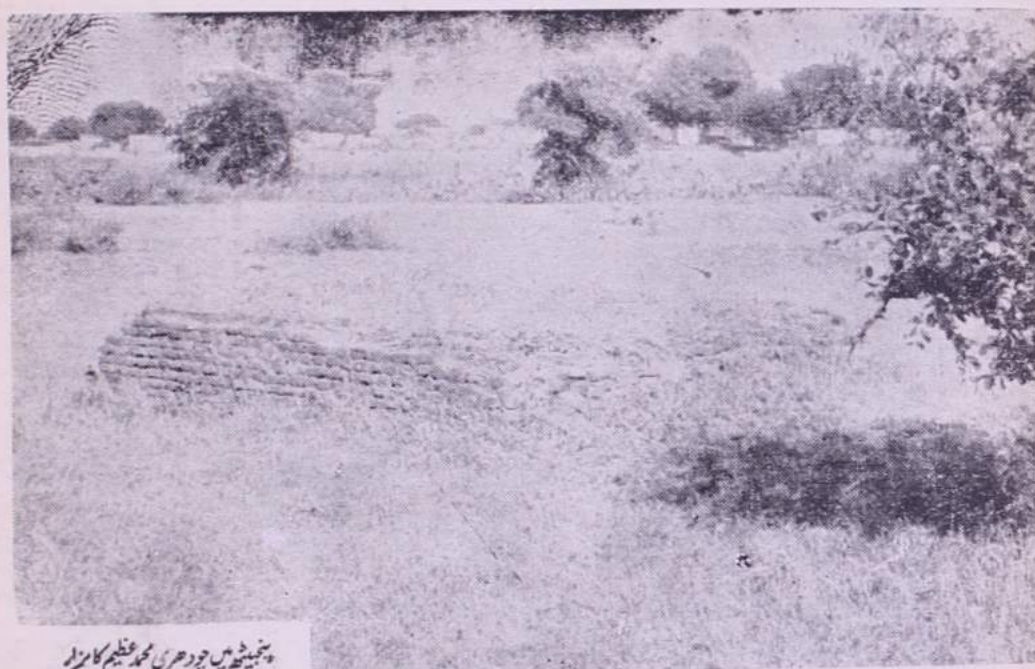
پنجبیٹھ میں چودھری محمد عظیم کا مزار

بھی اپنا نام مصلح الدین رکھ کر دہلی سے روانہ ہوئے اور جے پور، جودھپور کے مہیب اور خطرناک جنگلوں کو پا پیادہ طے کرتے ہوئے سورت پہنچے۔ سورت سے حج کے لئے روانہ ہوئے۔ اس وقت جہاز کا سفر آسان نہ تھا۔ بادبانی جہاز چلا کرتے تھے۔ سورت سے جدہ تک تین مہینے میں بحری سفر طے ہوتا تھا اور سال بھر میں صرف ایک جہاز ہوا کی موافقت کے زمانہ میں سورت سے چلتا اور اسی طرح جدہ سے آیا کرتا تھا۔ ایک خط کا محصول چار روپیہ تھا۔ جو لوگ ہجرت کے ارادہ سے ترک وطن کرتے تھے وہ دنیاوی تعلقات اور باہمی علائق زندگی کو دل سے نکال دیا کرتے تھے یہ حقیقت ہے کہ ان ہی بزرگوں اور مجاہدین کا جگرہ تھا جو یہ سفر برداشت کرتے تھے[1]

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی روانگی اور فوجداری مقدمہ کے بعد آپ کی اور آپ کے چچا نانا یا شیخ امین الدین صاحب۔ شیخ ولی اللہ صاحب اور شیخ شکر اللہ صاحب کی جائیداد ضبط ہو کر نیلام ہوئی۔ خاص طور پر پانی پت میں کمال الدین مخبر کی شناخت پر جو جائیداد قرق کر کے نیلام کی گئی۔ وہ ڈپٹی کمشنر کرنال کے فیصلہ مورخہ ۳۰ رجنوری ۱۸۶۲ء کے مطابق حسب ذیل تھی

(۱) سرائے کھجور، جس کی قیمت سرکاری طور پر ڈپٹی کمشنر کرنال کے کاغذات میں پانچ سو روپے ہے۔

(۲) سرائے چوڑھے۔ جس کی قیمت سرکاری طور پر ڈپٹی کمشنر کرنال کے کاغذات میں پانچ سو روپے ہے۔

(۳) سرائے شیخ فضل الٰہی (۴) سرائے قصابان (۵) سرائے لوہ آباد (۶) سرائے بالیان

یہ سب سرائیں اور وسیع قطعات زمین اور مکانات ایک ہزار چار سو بیس روپے میں نیلام ہوئے جن کی قیمت لاکھوں روپے کی تھی۔ مزروعہ علاقے اور زراعتی زمینوں اس

---

[1] فرنگیوں کا جال ص ۲۳۴

سکنائی جائیداد کے علاوہ ہیں ، جو بحق سرکار ضبط ہوئیں ۔ مذکورہ بالا سرائیں جس قیمت پر نیلام ہوئیں وہ بھی ملاحظہ ہو ۔

سرائے کھجور ۲۴۲ روپے سرائے لوہ آباد ۱۵ روپے ۔ سرائے چوڑھے ۵۶ روپے اور سرائے قصابان ۱۴ روپے

کاغذات جائداد نیلام شدہ انڈکس مشمولہ کا یہ عنوان ہے [1]

" انڈکس مشمولہ مثل فوجداری مقدمہ عرضی کمال الدین ساکن کیرانہ حال پانی پت مولوی رحمت اللہ باغی "

[1] ایک مجاہد معمار ص ۳۲

رحمت اللہ بیت اللہ میں

ایک طویل اور آلام ومصائب سے بھرے سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوتے اللہ پہ شاکر توکل پر تکیہ کئے صبر کے مجسمے اور سر بکف مجاہد اسلام مرکز اسلام مکہ معظمہ میں پہنچے تاکہ اللہ رب العزت کے گھر کے زیر سایہ خدمت اسلام کی کوئی سبیل نکال سکیں۔ اس انقلابی جماعت کے اکثر افراد نے مکہ معظمہ کو اپنی آماجگاہ بنایا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکہ معظمہ پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ رباط داؤدیہ جو باب العمرہ کے متصل ہے۔ حجرہ میں سکونت پذیر تھے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب علی الصباح مکہ معظمہ پہنچے۔ طواف کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ سعی میں بھی حضرت حاجی صاحب کے آپ شریک رہے۔ ان ہر دو ارکان سے فارغ ہونے کے بعد یہ دونوں حضرات رباط داؤدیہ میں آئے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سلطان عبد العزیز خان کی خلافت کا دور تھا اور مسجد حرم میں سید احمد دحلان شیخ العلماء مرجع حلقہ درس کا عام تھا اور امیر مکہ شریف عبداللہ بن عون محمد تھے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اکثر حرم میں تشریف لے جاتے تھے اور سید احمد دحلان کے درس میں بھی شریک ہوتے تھے۔ سید صاحب چونکہ شافعی المذہب تھے۔ ایک روز دوران سبق کسی مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے اپنے مذہب کی ترجیح کے ساتھ دلائل احناف کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی۔ درس کے اختتام پر

حضرت مولانا صاحب سید احمد دحلان سے پہلی مرتبہ ملے اور ایک طالب علم کی حیثیت سے اس مسئلہ کے متعلق اپنی تشفی چاہی۔ تھوڑی دیر کے تبادلہ خیالات کے بعد ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص طالب علم نہیں ہے۔ انہوں نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں۔ آپ نے مختصر طور پر اپنے حالات بتائے جس پر سید صاحب نے آپ کو دوسرے روز دعوت کے لئے اپنے گھر پر بلایا۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے ہمراہ سید صاحب کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا نے حاجی امداد اللہ صاحب کا تعارف کرایا اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے تمام واقعات اور خاص طور پر رد نصاری کی جدوجہد اور مناظرہ اکبر آباد کے حالات بیان کئے۔ جن کو سن کر یہ بہت مسرور ہوئے اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب سے بہت دیر تک بغلگیر رہے۔ اسی ملاقات میں حضرت مولانا صاحب کو انہوں نے مسجد حرم میں درس کی اجازت دی اور علماء مسجد حرم کے دفتر میں آپ کا نام درج کرایا۔[1]

پادری فانڈر ہندوستان سے ۱۸۵۸ء میں قسطنطنیہ پہنچا۔ سلطان عبدالعزیز صاحب کا عہد تھا۔ ترکی اور انگلستان کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ پادری فانڈر نے سلطان سے بیان کیا کہ ہندوستان میں میرا ایک مسلمان عالم سے مناظرہ ہوا تھا جس میں عیسائیت کی فتح اور اسلام کی شکست ہوئی تھی۔ علمائے اسلام لاجواب ہوئے جن کی وجہ سے مسلمان عیسائی دین قبول کر رہے ہیں۔ ان باتوں سے سلطان کو بڑی تشویش ہوئی انکی خواہش ہوئی کہ پادری فانڈر کی بات کی اصلیت معلوم کی جائے۔ سلطان نے شریف مکہ کو فرمان جاری کیا کہ حج کے زمانہ میں ہندوستان سے جو علماء اور باخبر و معتبر اصحاب آئیں ان سے پادری فانڈر کے مناظرہ اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات معلوم کر کے ہم کو مطلع کیا جائے۔ امیر مکہ نے شیخ العلماء سید احمد دحلان سے اس فرمان کا

---

[1] ایک مجاہد معمار ص ۲۳

ذکر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جس عالم سے پادری فانڈر کا مناظرہ ہوا ہے وہ عالم خود یہاں موجود ہیں۔ چنانچہ دوسرے دن شیخ الاسلام مولانا رحمت اللہ صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر امیر مکہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس ملاقات کے بعد امیر مکہ نے فوراً بارگاہ شاہی میں مناظرہ اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات اور مولانا رحمت اللہ کی موجودگی کے بارے میں لکھ کر بھیجدیا۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب خاص اعزاز واکرام کے ساتھ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں شاہی مہمان کی حیثیت سے روانہ ہوئے۔ جب وہاں پہنچے تو شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائے گئے۔ سلطان عبدالعزیز بکمال التفات شاہانہ روزانہ آپ کو بعد نماز عشاء شرف باریابی عطا فرماتے۔ اس مخصوص صحبت میں اکثر خیرالدین پاشا تونسی صدر اعظم اور شیخ الاسلام وغیرہ اکابر سلطنت بھی شریک ہوتے تھے۔ جب پادری فانڈر کو مولانا رحمت اللہ صاحب کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ قسطنطنیہ سے چلا گیا۔ سلطان نے ان ملاقاتوں میں مناظرہ کے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پورے حالات نہایت دلچسپی کے ساتھ سنے اور مناظرہ کے نتیجہ سے بہت خوش ہوئے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کی اس جلیل القدر دینی خدمت کی یہ قدر افزائی فرمائی کہ آپ کی واپسی کے وقت خلعت فاخرہ کے ساتھ تمغہ مجیدی درجہ دوم اور گراں قدر وظیفہ کی امداد سے سرفراز فرمایا۔[1]

مولانا رحمت اللہ صاحب کی ملاقات کے بعد سلطان عبدالعزیز خانصاحب نے عیسائی مشنریوں کے فتنہ وفساد کو روکنے کے لئے سخت قدم اٹھائے جس کا ذکر پنجاب ریلیجس بک ڈپو سوسائٹی انارکلی لاہور کی مطبوعہ کتاب صلیب کے علمبردار مؤلفہ پادری برکت میں ہے کہ

"قسطنطنیہ میں کتب مقدسہ اور دیگر مذہبی کتابیں اس جگہ فروخت

---

[1] فرنگیوں کا جال ص ۲۳۵

کی جاتی تھیں۔ جہاں مقدس کرسٹم نے کلیسائی ابتدائی صدیوں میں وعظ کی منادی کی تھی اور جو اب مسجد بنادی گئی تھی ایک روز یک لخت بلغیر اطلاع سلطان ترکی کے حکم سے ترکی مسیحی قید کر دیئے گئے اور مسیحی کتب مقدسہ ضبط کی گئیں اور مسیحیوں کی عبادت گاہوں اور دکانوں پر جہاں ان کتب کی فروخت ہوتی تھی قفل لگا دیئے گئے۔ ترکی گورنمنٹ نے ذیل کے احکام صادر کر دیئے۔

"ترکی گورنمنٹ اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ اسلام پر کسی طرح کا حملہ بر سر بازار یا بازار کے طور پر کیا جائے وہ مشنریوں کو یا ان کے کارندوں کو اسلام کے خلاف منادی کرنے کی اجازت نہیں دیتی اور اس طرح کی ہر کوشش ترکی گورنمنٹ کی نظر میں قومی مذہب پر حملہ تصور کیا جائے گا وہ کسی مباحثہ کی کتاب کو بر سر بازار یا بازار کے طور پر تقسیم کرنے یا فروخت کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ برطانوی سفیر نے ان ذلت آمیز احکام پر رضامندی ظاہر کر دی گو بعد میں بصد مشکل دکانیں کھلوائی گئیں"۔ [۱]

اسی کتاب "صلیب کے علمبردار" سے پادری فانڈر اور مولانا رحمت اللہ صاحب کا قسطنطنیہ میں مباحثہ کرانے کی نبیاری کی تصدیق ہوتی ہے۔ پادری برکت اللہ لکھتا ہے

"قسطنطنیہ میں اس کی (پادری فانڈر) کی بیوی کی حالت نہایت خراب ہو گئی اور وہ ۱۸۶۵ء میں اپنے بیوی بچوں کو انگلستان چھوڑنے چلا گیا۔ ۱۸۷۰ء میں جب فرنچ ملتان گیا تو وہاں کے ایک مولوی نے جو مولوی رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں کا دوست تھا اس کو بتایا کہ جب قسطنطنیہ میں ڈاکٹر فانڈر کی وعظ کی منادی اور کتابوں کا شہرہ ہوا۔ تو سلطان نے مولوی رحمۃ اللہ کو بلوا بھیجا تاکہ

---

[۱] صلیب کے علمبردار ص ۱۲

ڈاکٹر فانڈر سے مباحثہ کرے۔ لیکن مولوی رحمۃ اللہ کے دارالخلافہ میں پہنچنے سے پہلے ڈاکٹر فانڈر وفات پاچکا تھا۔" ۱۲۲

مؤلف "صلیب کے علمبردار" کا یہ کہنا کہ مولانا رحمت اللہ قسطنطنیہ پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ اس سے قبل پادری فانڈر کا انتقال ہوگیا تھا۔ صحیح نہیں ہے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب ۱۸۶۴ء میں قسطنطنیہ پہنچے ہیں اور بقول مؤلف صلیب کے علمبردار پادری فانڈر نے ۱۸۶۵ء میں قسطنطنیہ چھوڑا اور انتقال یکم دسمبر ۱۸۶۵ء کو ہوا۔ گویا پورے ایک سال کا فرق ہے۔

سلطان عبدالعزیز صاحب کی خواہش اور خیرالدین پاشا کی تحریک پر رجب ۱۲۸۰ھ میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اظہار الحق مرتب کرنی شروع کی جو آخر ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ میں چھ ماہ کی قلیل مدت میں لکھ کر سلطان کی خدمت میں آپ نے پیش کی اور اس کتاب میں سلطان کا ذکر کرنے کے بجائے حسب ذیل الفاظ میں شیخ العلماء سید احمد دحلان کا ذکر آپ نے فرمایا۔[1]

"سیدی و سندی مولانا السید احمد بن زینی دحلان ادام اللہ فیضہ الی یوم المقیم فاھرلی ان اترجم باللسان العربی ھذہ المباحث الخمسۃ من الکتب التی الفت فی ھذا الباب لانھا کانت اما بلسان الفرس واما بلسان مسلمی الھند"

شیخ العلماء کے ذکر پر خیرالدین پاشا نے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب سے فرمایا کہ آپ نے امیر المومنین کی خواہش پر یہ کتاب تحریر کی ہے مگر اس کے مقدمہ میں آپ نے شیخ العلماء کا ذکر کیا ہے حالانکہ ان کی جگہ پر امیر المومنین سلطان عبدالعزیز

---

[1] اظہار الحق ص ۲

کا نام آنا چاہیئے تھا۔ مولانا نے بلا تکلف اور بلا جھجک یہ جواب دیا۔

"اس خالص مذہبی خدمت میں کسی دنیاوی غرض ومقصد کا کوئی شائبہ نہ آنا چاہیئے۔ اسکے علاوہ مکہ معظمہ میں خود شیخ العلماء مجھ سے ان حالات کے قلمبند کرنے کی خواہش کر چکے تھے اور ابتدائی مواد کی ترتیب کا کام بھی شروع کر دیا تھا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف کا اصل سبب شیخ العلماء ہیں کیسی وجہ سے اگر وہ مجھے امیر مکہ تک نہ پہنچاتے تو میری رسائی یہاں تک نہ ہوتی اور اس خدمت کا موقع نہ ملتا" [1]

مولانا صاحب کی اس صاف گوئی اور قدر شناسی کا خیر الدین پاشا پر بہت اچھا ہوا اور یہ دلائل سن کر قائل ہو گیا۔

قیام قسطنطنیہ کے زمانہ میں اکثر علماء و فضلاء اور مختلف الخیال و مختلف العقائد و مذاہب کے لوگ شاہی مہمان خانہ میں اکٹھے ہوتے تھے جن سے مولانا رحمت اللہ صاحب کا مذہبی و سیاسی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ یورپ کی سائنسی معلومات و تعلیم کے اثرات یہاں تک بھی پہنچ چکے تھے۔ اسی کی روشنی میں آپ نے بعثت و نبوت، حشر و نشر، نزول وحی وغیرہ امور کو عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اور "تنبیہات" کے نام سے ان امور پر ایک رسالہ لکھا۔ جس کی تالیف ۱۲۸۱ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور یہ رسالہ خیر الدین پاشا تونسی صدر اعظم کے حکم سے چھپا تھا۔ یہ رسالہ مصری عربی اظہار الحق جلد اول کے صفحہ ۱۲۱ سے ۳۵۰ تک اور جلد دوئم کے صفحہ اول سے صفحہ ۳۴۴ کے حاشیہ میں شائع ہوا۔ جس کی تنبیہ اول کی وضاحت آپ نے فرمائی

"وھذہ الرسالۃ مشتملۃ علی اثنی عشر تنبیھا و سمیتھا بالتنبیھات، وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب التنبیہ الاول،

---

[1] ایک مجاہد معمار ص ۳۵

فی اثبات الاحتیاج الی البعثۃ و النبوۃ علی رائ المحققین
من الفلاسفۃ قد ثبت بالضرورۃ ان نوع الانسان
یحتاج الی المصالح الفردیۃ الکثیرۃ التی لابقاءلہ بدونہا
مثل الغذاء واللباس والمسکن والآلات وغیرہا" (۲۲)

مولانا رحمت اللہ صاحب نے مسجد حرم میں قسطنطنیہ سے واپس آنے کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے مولانا صاحب نے معقول سے طلبہ کو واقفیت کرائی اور علی الخصوص ریاضی میں علم ہیئت کا درس جاری کیا جو حجاز کی تعلیم میں غیر معروف تھا۔ مستقل طور پر صرف کا علم درس میں داخل نہیں تھا۔ بلکہ نحو کے ساتھ صرف کی ابتدائی معلومات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مولانا صاحب نے صرف کی تعلیم کو نحو سے علیحدہ کیا۔ اسی کے ساتھ یہاں آپ نے درس و تدریس کے طریقے اور مقامی اہم ضرورتوں پر کافی غور کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ یہاں ایسے مدرسہ کی بنیاد رکھی جائے جو مرکز اسلام مکہ معظمہ کی شان کے مطابق ہو۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے جاننے والے علماء ان کے مدرس ہوں اور ایسا نصاب تعلیم رائج کیا جائے جو دینی اور دنیاوی ضروریات کا کفیل ہوتا ہو اگرچہ حکومت عثمانیہ ان حرم کے علماء و فضلا کی حوصلہ افزائی میں لاکھوں روپے صرف کر رہی تھی جو مسجد حرم میں درس دے رہے تھے مگر ان میں جو نقائص پائے جاتے تھے وہ یہ تھے۔

(۱) علماء اپنے درس کو کسی نظام اور کام کو ضابطہ کے تحت انجام نہیں دے رہے تھے۔

(۲) کوئی مخصوص نصاب تعلیم رائج و مقرر نہیں تھا اور جو کچھ پڑھایا جاتا تھا وہ طلبہ میں کسی قسم کی قابلیت واستعداد پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

(۳) طریقہ تعلیم نہایت ابتر و خراب حالت میں تھا اور سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ کتاب کی عبارت کو خود استاد پڑھتا اور خود ان کے مطالب بیان کرتا تھا۔ شاگرد

اس کو استاد کا ایک وعظ سمجھتے اور ذہن و دماغ سے کام نہیں لیتے تھے۔ استاد سے کسی مسئلہ کو سمجھنے یا کسی شبہ کو دور کرنے کو معیوب سمجھا جاتا تھا اور اس کو بے ادبی تصور کیا جاتا تھا۔

(۴) جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی ان میں تفسیر حدیث، فقہ اور نحو پر تمام عمر صرف ہونے کے باوجود قابلیت ولیاقت کا فقدان رہتا تھا۔ ہندوستان میں تفسیر جلالین جو سال بھر میں پڑھائی جاتی ہے وہاں اس کی مدت سات سال تھی۔ دیگر علوم و فنون کے حصول کا کوئی رجحان یا شوق بالکل نہیں تھا۔

(۵) ان مہاجرین کی اولاد کا جو ممالک اسلامیہ سے ہجرت کر کے آتے تھے۔ کسی قسم کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ان کی اولاد جہالت کا شکار بنتی تھی نہ وہ دنیا کے کسی کام کے تھے اور نہ دین کے۔

(۶) ہر سال اسلامی دنیا کے دور دراز مقامات سے بڑی تعداد میں مثلاً شیدان علوم مکہ معظمہ کو سرچشمہ دین سمجھ کر علوم دینیہ کے حصول کے شوق میں آتے تھے کہ اس سرچشمہ سے سیراب و فیضیاب ہوں۔ مگر یہاں اس زمانہ میں ایسے لوگوں کے لئے کوئی بندوبست نہیں تھا۔ نہ قیام و طعام کا انتظام تھا۔ نہ درس و تدریس کے لئے کوئی سبیل تھی[1]

ان تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد مولانا رحمت اللہ صاحب نے حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی لٹی ہوئی درسگاہ کے زمین حرم پر پھر احیاء کا ارادہ کیا اور مہاجرین کی اولاد اور اہل عرب کے بچوں کو تعلیم دینے اور دستکاری سکھانے کے لئے ایک صنعتی اسکول کے قیام کا خاکہ اپنے ذہن میں رکھا تاکہ یہ لوگ ابتدائی تعلیم پانے کے بعد بھکاری نہ بنیں اور افلاس و تنگدستی کی پریشانیوں کا شکار نہ ہوں۔

---

[1] فرنگیوں کا جال ص ۲۳۵

اس اہم ضرورت کی طرف مولانا صاحب نے مکہ معظمہ کے ہندوستانی مہاجرین اور مخیر حضرات کی توجہ مبذول کرائی۔ اس سلسلے کی متعدد نشستیں بھی ہوئیں اور یہ طے پایا کہ جناب نواب فیض احمد خاں صاحب رئیس ضلع علی گڑھ جو مکہ معظمہ کے ہندوستانی مہاجرین میں مالی اعتبار سے ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے سکونتی مکان میں مدرسہ کھولا جائے۔ جس کو ہندوستانی مہاجرین کے با اثر اور معزز لوگوں کی حمایت حاصل ہو۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں اس مدرسہ کو قائم کرنے اور تعلیمی کاموں کو چلانے کے لئے پہلی اپیل یہ کی گئی

"حمد و نعت کے بعد یہ عرض ہے کہ اکثر ہندیوں اہل توفیق کی ہمت سے حرمین شریفین زادہما اللہ شرفا میں بعضے بعضے خیر کے کام جیسے رباطین اور سبیلیں تیار ہو گئیں ہیں پر اب تک کوئی مدرسہ ان کی طرف سے یہاں نہیں ہے۔ حالانکہ اور کاموں سے یہ کام بھی بڑا خیر کا کام ہے۔ اس لئے یہ عرض ہے کہ جو اس امر میں شریک ہوں وہ اپنا نام مع اس رقم کے جو انہیں ماہانہ دینا منظور ہو۔ لکھدیں اور تھوڑے بہت کا خیال نہ کریں کہ تھوڑا اکٹھا ہو کے بہت ہو جاتا ہے اور اس مدرسہ کی تدریس اور خرچ کے قوائد ان لوگوں کی رائے سے مقرر ہوں گے جو اس امر کے لئے بمشورہ مقرر کئے جائیں گے۔ فقط

المرقوم یکم ماہ رمضان سنہ ۱۲۹۰ھ

محمد حسین شیخ المطوفین ہند	رحمۃ اللہ	محمد احسن
سے روپیہ	عگ ماہانہ	عگا ماہانہ
ارادت حسین	احمد حسن	جعفر حسین
عہ ماہانہ	ملعہ سالانہ	تا قیام مکہ سے رماہانہ
میاں عبد الکریم	حافظ عبد اللہ	زین العابدین
۳ قرش ماہانہ	۳ قرش ماہانہ	۲۰ دیوانی
محمد فیض احمد خاں	محمد فضل اللہ عفی عنہ	محمد جیون عفی اللہ عنہ
عمہ روپے ماہانہ	عیر ـ ماہانہ	عہ ماہانہ

میاں جان	عبدالرحیم عطار	عنایت اللہ
عہ ماہانہ	۴ر ماہانہ	۳ قرش ماہانہ
عبدالرحیم عطار	عبدالوہاب	اسماعیل
پاؤ مجیدی ماہانہ	لعہ ماہانہ	۳ قرش ماہانہ
عبدالقادر شیخ المطوفین بنگالہ	عبدالعزیز عفی اللہ عنہ	عبدالرحمٰن عطار بنگالی
عہ	عہ ماہانہ	ربع روپیہ ماہانہ
جان محمد میمن عطار	حافظ قادر بخش	نظام علی چاء فروش
ربع ریال ماہوار	تا قیام مکہ ربع مجیدی ماہانہ	ربع ریال ماہانہ
امیر علی	عبدالجبار نبیرہ شاہ عبدالستار	محمد احسن الدین
۳ر ماہانہ	۴ر قرش ماہانہ	ربع ریال
منشی عزیز الرحمٰن	عبدالحی کاتب بنگالی	عبداللہ
۳ قرش ماہانہ	۲ر قرش ماہانہ	نصف روپیہ ماہانہ
فدا محمد	شیر محمد خاں	میاں قاسم
عہ ر ماہانہ	۴ر قرش ماہانہ	۲ر قرش ماہانہ
کمترین علی جان عفی اللہ عنہ	عبدالرحمٰن خوردہ فروش	داود ملا کوکنی
ربع ریال ماہانہ	۴ر قرش ماہانہ	ربع مجیدی ماہانہ
کمال الدین	عبدالوہاب	حکیم محبوب علی
عہ ماہانہ	ربع مجیدی	۸ر ماہانہ
ابراہیم علی	محمد نذیر	عبدالحمید
۸ر ماہانہ	۳ قرش ماہانہ	۳ قرش ماہانہ
حافظ عبدالحکیم مشہور پہلوان	حکیم عبدالعزیز	فدوی محمد اعظم
ربع ریال ماہانہ	۳ قرش ماہانہ	نیم قرش

علی بخش سمکری	قدرت اللہ	غازی
۳ قرش	۴ر ماہانہ	۴ر ماہانہ
عبداللہ گرفروش	سید عبدالعلی	مہتاب بیگ
ایک عشرین	ربع ریال ماہانہ	عہ ماہانہ
منشی نجم الدین	محمد کامل مطوف	محمد ابراہیم
ار ماہانہ	عہ ماہانہ	۴ر ماہانہ
امیر حاجی	عبدالکریم مجمع دار	حاجی محمد
۴ر ماہانہ	۴ر ماہانہ	عہ ماہانہ
عبدالرحمن خیاط	مولوی خلیل الرحمن	لال محمد صباغ
ربع مجیدی ماہانہ	۴ر عہ	ربع مجیدی للہ
عباس خاں	فقیر امداد اللہ چشتی	سید حسن علی زمزمی
ربع مجیدی	حق المقدور عہ	سہ
محمد اسمٰعیل بن حکیم ملا نواب	ابراہیم بن حسین سطاح	شیخ فریہ
۲ قرش	عا	۴ر
زور آور خاں	شیخ رمضان مزین	عباس خاں سیجی
ایک قرش	۳ رقرش	۲ قرش
حافظ عبدالغفور خیاط	عبداللہ اسمٰعیل سندھی	عیسیٰ و حمزہ
۴ قرش	ربع ریال	للعہ ریال یکمشت
مسماۃ سکینہ	میر امداد علی نعیصی القادری	ملا نواب
ار قرش ماہوار	عہ ماہوار	عہر
عبدالصمد کتبی	زینب معرفت سکینہ	وزیرا معرفت سکینہ
۴ر ماہوار	ایک قرش	ایک عشرین

شبو معرفت سکینہ	ضیاء الدین بنگالی	زوجہ ضیاء الدین مذکور
ایک عشرین	ربع مجیدی	۲ قرش
ثانی مولوی محمد اسمٰعیل	حافظ عبداللہ نابینا مدرس دوم	حافظ اسداللہ مطوف
۳ - قرش	ایک قرش	۲ر
علی پنجابی مطوف	کاظم علی خاں	عبداللہ بستاں
۴ر	۳ قرش	۲ر
نورن بی	علی بن عبداللہ سندھی	احمد بن عبدالخالق سندھی
۲ر	۵ ¾ قرش	۵ ¾ قرش
ابراہیم بن قاسم سندھی	عبدالمولی خیاط سندھی	حاجی مقیم بن اللہ رکھا سندھی
۵ ¾	۳ قرش	۳ قرش
محمد حبیض	گاما البساطی	محمد خلیل احمد خاں
ے رسالانہ	۴ر	ایک قرش
مولوی عبدالخالق عطا بنگالی	نور محمد مجلد	مولوی عبدالسلام
ربع مجیدی	۳ قرش	نصف روپیہ
بی بی شہر بانو	زوجہ جناب شاہ امداداللہ	محمد جان
ایک روپیہ از یکم شوال	۲ قرش	۲ر ذی الحجہ سے
عبدالکریم بنگالی	حاجی شریعت اللہ	محمد ناصر بنگالی
۲ر ذی الحجہ سے	۲ر ذی الحجہ سے	۲ قرش یکم ذی قعدہ سے
منشی ظفر اللہ صاحب	منشی ممتاز علی	منشی نوازش حسین
عہ	عہ ۲ر محرم سے	صہ یکم محرم سے
میاں محمد علی	محمد جاوا خیاط	مقصود علی
۲ قرش	ربع ریال	۳ر

مولوی رحیم علی	محمد عثمان نجار	احمد کنسار	محمد خاں صباغ
عہ ر	۳ قرش	عہ ر	عہ ر

حرم شریف میں مولانا کے تلامذہ

مسجد حرم میں مولانا کا حلقہ درس مرجع خواص وعوام بنا۔ مسجد حرم کی تدریس کے زمانہ میں اور مدرسہ صولتیہ کے ابتدائی عہد میں جن اصحاب کو حضرت مولانا رحمت اللہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ اس کی فہرست تو کافی طویل ہے لیکن چند ممتاز علماء کے نام حسب ذیل درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) شریف حسین بن علی سابق امیر مکہ و بانی حکومت ہاشمیہ

(۲) شیخ احمد عبداللہ مرداد۔ شیخ الائمہ والخطباء مسجد حرم

(۳) عبدالرحمٰن سراج مفتی احناف و شیخ العلما مکہ معظمہ

(۴) عبدالرحمٰن حسن عجیمی

(۵) عبداللہ الغمری مدرس مسجد حرم

(۶) حسن عبدالقادر طیب۔ مدرس مسجد حرم

(۷) اسعد احمد دہان۔ قاضی مکہ معظمہ

(۸) امین محمد مرداد۔ نائب قاضی مکہ

(۹) عبدالرحمٰن دہان۔ مدرس مسجد حرم و صدر مدرس مدرسہ صولتیہ

(۱۰) حسن کاظم۔ مدرس مسجد حرم

(۱۱) مولوی عبدالستار دہلوی۔ مدرس مسجد حرم

(۱۲) شیخ عبداللہ احمد ابوالخیر قاضی مکہ و مدرس مسجد حرم

(۱۳) عبدالحمید بخش فلکی

(۱۴) سید حسن دحلان۔ مدرس مسجد حرم

(۱۵) شیخ عبدالرحمن شیبی کلید بردار خانہ کعبہ

(۱۶) محمد حسین خیاط۔ بانی مدرسہ خیریہ مکہ معظمہ

(۱۷) عابد حسین مالکی۔ مفتی مالکیہ مکہ معظمہ

(۱۸) احمد نجار مرحوم، قاضی طائف

(۱۹) شیخ محمد حامد مرحوم، قاضی جدہ

(۲۰) محمد سعید بابصیل۔ مدرس مسجد حرم

(۲۱) مولانا بدر الاسلام۔ مدرس مدرسہ صولتیہ و مہتمم کتب خانہ حمیدیہ قصر یلدز قسطنطنیہ

(۲۲) شیخ عبداللہ زوادی مرحوم مفتی شافعیہ۔ مکہ مکرمہ

(۲۳) حسب اللہ مرحوم۔ مدرس مسجد حرم

(۲۴) محمد علی زین العابدین مرحوم، مدرس مسجد حرم

(۲۵) صالح کمال مرحوم۔ مدرس مسجد حرم

(۲۶) محمد علی کمال مرحوم۔ مدرس مکہ معظمہ

(۲۷) درویش عجیمی مرحوم 〃 〃

(۲۸) بکر رفیع مرحوم 〃 مسجد حرم

(۲۹) مولوی نذیر احمد صاحب بنگالی۔ مہاجر مکہ معظمہ

(۳۰) مولوی عبدالرحمن صاحب۔ مہاجر مکہ معظمہ

(۳۱) مولوی ضیاء الدین بن عبدالوہاب صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ باقیات الصالحات مدراس

(۳۲) مولانا قاری عبداللہ صاحب صدر مدرس شعبہ تجوید قرآن۔ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ

(۳۳) شیخ القراء مولانا قاری عبدالرحمن صاحب الہ آبادی

(۳۴) مولانا عبداللہ قاضی صاحب مرحوم مورخ مکہ معظمہ و مہتمم کتب خانہ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ

(۳۵) حکیم محمد اسماعیل نواب صاحب مرحوم۔ مکہ معظمہ کے مشہور طبیب و عالم

(۳۶) مولانا محمد سعید صاحب مرحوم - سابق ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ

(۳۷) عبد اللہ سراج مرحوم، مفتی احناف وقاضی القضاۃ و وزیر اعظم حکومت ہاشمیہ حجاز

(۳۸) سلیمان حسب اللہ مرحوم - مدرس مسجد حرم

(۳۹) مولوی عبد الخالق اسلام آبادی - بانی مدرسہ اسلامیہ دار الفائزین مکہ معظمہ

(۴۰) شیخ محمد صالح میمنی مرحوم - مورخ مکہ و از مقربین شریف عدن امیر مکہ

مکہ میں ردِّ نصاریٰ کی تعلیم

ابتدائے زندگی سے مولانا رحمت اللہ صاحب نے ردِّ نصاریٰ کا بیڑا اٹھایا تھا - وہ زندگی بھر جاری رہا - چنانچہ آپ نے مکہ معظمہ میں ہجرت کرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رکھا جس کا ذکر میرے والد ماجد مولوی شرف الحق صاحب صدیقی نے اپنے حج کے سفرنامہ میں کیا ہے یہ حج انھوں نے ۱۳۰۵ھ میں کیا تھا۔

"حاجی امداد اللہ صاحب نے حافظ عبد اللہ سے فرمایا مولوی شرف الحق کو مولوی رحمت اللہ کے یہاں پہنچا دو - ان کے ہمراہ مولوی صاحب کے مدرسہ میں پہنچا - مولانا ایک چھوٹے سے تہ خانہ میں بیٹھے تھے - پہلے سلام کیا خط دیا - مولانا نے پڑھوایا بہت مہربانی اور شفقت سے پیش آئے اور خط سن کر فرمایا کہ تم اپنا اسباب یہاں لے آؤ - میں نے عرض کیا کہ میرے ہمراہ اور لوگ ہیں - غرض کھانا اس روز مولانا صاحب کے ہمراہ کھایا - مولانا رحمت اللہ صاحب کے ہاں بھی لوگ حافظ عبد اللہ صاحب کی معرفت امانتیں رکھتے ہیں، مولانا کی بصارت جا چکی ہے اس وجہ سے یہ کام سے معذور ہیں - کتب ردِّ نصاریٰ ہندوستان سے بڑی تعداد میں ان کے پاس پہنچتی ہیں - مولانا محمد علی مونگیری کی دو کتابیں میرے سامنے آپ کے پاس آئی تھیں - مولانا رحمت اللہ مغفور کتب ردِّ نصاریٰ کے بہت شائق تھے - مجھ سے ان کتب کے بعض مقامات مولانا نے سنے تھے - مولوی دین خاں صاحب اور حاجی احسان اللہ نے ازالۃ الاوہام شروع کر رکھی

تھی وہ تہہ خانہ میں پڑھائی جاتی تھی۔ اظہار الحق بھی مولانا کے ہاں ہوتی تھی۔ اکثر واقعہ آگرہ کے مناظرہ کے خوب وضاحت اور تفصیل سے فرماتے تھے۔ اور مولانا صاحب اپنے پوتے کو بھی سبق دیتے تھے۔ ان صاحبزادے کا نام سعید ہے۔ نام کا بھی سعید ہے بلکہ افعال سے بھی سعید ہے۔ اپنے ماں باپ کا ایک لڑکا ہے۔ مشن کے مدرسہ انبالہ میں پڑھتا تھا مولانا کے بھائی کا بیٹا ہے۔ مولانا نے مشن کے اثر نصرانیت کی تعلیم سے بچانے کے لئے ہند سے حجاز بلا لیا ہے محنتی اور نیک بخت ہے خدا اس کی عمر میں برکت عطا فرماتے کتب اظہار الحق اور ازالۃ الاوہام کا سبق مولانا کے ہاں صبح و شام ہوتا تھا۔ علمی گفتگو ہوتی تھی۔ ان کے کلام سے مستفید ہوتا تھا۔ مسلمانوں کی بہبودی اور بہتری کی باتیں ہوتی تھیں . . . مولانا صاحب اب بھی کتب ردّ نصاری کے مشتاق ہیں۔ اگر ان کی بصارت پھر آجائے وہ اب بھی ایک کتاب جامع لکھنے کو تیار ہیں "

مولانا رحمت اللہ صاحب کا انتقال

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی قوت بصارت ۱۳۰۵ھ میں زائل ہو چکی تھی۔ اس وقت سے آپ بہت کمزور رہنے لگے تھے۔ مدرسہ صولتیہ کا کام بڑے انہماک کے ساتھ فرماتے تھے۔ ہر وقت اسی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ نہ دن دیکھتے اور نہ رات کی پرواہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپ ایک سال بیمار رہ کر ۵۰ سال کی عمر میں مکہ معظمہ میں ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ کو بروز جمعہ فوت ہوئے۔ آپ کے انتقال کی خبر ہندوستان کے ہر ایک اخبار میں چھپی۔ چنانچہ ہم شحنۂ ہند میرٹھ ۲۴ جون ۱۸۹۱ء سے آپ کے فوت ہونے کی خبر نقل کرتے ہیں

"پنچ کے نامہ نگار مکہ معظمہ نے لکھا ہے کہ مولوی رحمت اللہ صاحب مہاجر ہندی جو یہاں معزز مدرسین میں سے تھے ایک برس علیل رہ کر ۲۲ رمضان شریف بروز جمعہ کو انتقال کیا اور جنت المعلی میں محمود پاشا کے

قریب مدفون ہوئے۔"

جس احاطہ میں مولوی رحمت اللہ صاحب دفن ہوئے اس میں حسب ذیل حضرات کی بھی قبور ہیں۔

(۱) محمود پاشا (۲) حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب (۳) حضرت حاجی امداداللہ صاحب (۴) نواب عبدالعلی خاں رئیس چھتاری بلند شہر (۵) شمس العلما مولانا محمد حسین الہ آبادی کے والد ماجد (۶) مولانا عبدالحق صاحب شیخ الدلائل مصنف اکلیل شرح مدارک التنزیل (۷) مولوی عزیز بخش صاحب بدایونی (۸) مولانا حضرت نور صاحب صدر مدرس مدرسہ صولتیہ (۹) مولوی عبداللہ غازی صاحب سابق مہتمم کتب خانہ مدرسہ صولتیہ شاگرد مولانا رحمت اللہ صاحب (۱۰) شیخ عبدالحکیم صاحب سابق خزانہ مدرسہ صولتیہ۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کی اہلیہ بروز دوشنبہ ۶ رجب ۱۳۱۳ھ میں فوت ہوئیں۔[1]

مولانا رحمت اللہ صاحب کی پوری زندگی رد نصاریٰ، مذہب کی خدمت، اور خلق کے ساتھ ہمدردی میں گذری۔ صحیح بات کہنے سے آپ کبھی نہیں چوکے بلا جھجک کبھی مشورہ بھی کبھی غلط نہیں دیا اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت نیک کام کرائے۔

خانہ کعبہ کی مرمت میں شرکت

سلطان عبدالحمید کے عہد میں خانہ کعبہ اس وقت کھولا جاتا تھا جب اس میں مرمت کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلطان عبدالحمید کو معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ کے اندرون حصہ میں مرمت کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اس کام کے لئے

[1] مکتوبات امدادیہ ص۱۴

پھر علماء کو منتخب کیا جس میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب بھی تھے۔ اس مرمت کے لئے انجنیروں نے مخصوص مسالہ بنایا تھا جو جلد خشک ہو جاتا تھا۔ اور علماء کے لیے ایک خاص قسم کا عمامہ تیار کیا گیا جس کو پہنکر وہ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور اسکی درستگی کی۔

انگریزوں کو عدن میں جگہ نہ دینے کا مشورہ

سلطان عبدالحمید کے دور میں انگریزوں نے حکومت ترکی سے عدن میں جہازوں کے کوئلہ رکھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ مانگی تھی جب مولانا صاحب کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے سلطان کو ایک خط لکھا کہ بحری اعتبار سے عدن بڑی اہم جگہ ہے اگر آپ نے انگریزوں کو یہ جگہ دیدی تو بہت خطرناک ثابت ہوگی اور اس طرح پورے عدن پر انگریز قبضہ کرلے گا اور اس کا اثر دوسرے ممالک اسلامیہ پر بھی پڑے گا۔ اس مشورہ پر سلطان نے توجہ نہیں دی اور جگہ دے دی جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ انگریز عدن پر قابض ہے اور عرب ممالک کے لئے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ عدن کو آزاد کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

نہر زبیدہ کی مرمت میں حصہ

ملکہ بغداد خلیفہ ہارون رشید کی بیوی زبیدہ خاتون کا دائمی صدقہ جاریہ نہر زبیدہ کافی خراب و خستہ ہوگئی تھی۔ جس کی مرمت کی ضرورت پیش آئی۔ اسی زمانہ میں سیٹھ عبدالواحد صاحب عرف "واحد سیٹھ" مکہ معظمہ آئے ہوئے تھے۔ اس سلسلہ کی ایک مشاورتی مجلس مدرسہ صولتیہ میں منعقد ہوئی۔ سیٹھ عبدالواحد صاحب باہمت و مخیر دولت مند تھے۔ اس مجلس میں طے ہوا کہ نہر زبیدہ کی از سر نو اصلاح اور مرمت ہونی چاہیے۔ چنانچہ مرمت کرانے اور حکومت سے اجازت لینے کے لئے ایک بورڈ قائم کیا گیا۔ جس میں مہاجرین مکہ معظمہ کے ہر طبقہ سے نمائندے لئے گئے اور اس کی صدارت کے لئے مولانا رحمت اللہ صاحب کا نام تجویز ہوا مگر آپ نے

اپنے شاگرد رشید مولانا شیخ عبد الرحمٰن سراج مفتی احناف شیخ العلماء مکہ معظمہ کو اس بورڈ کا صدر مقرر کیا اور خود نائب صدر کی حیثیت سے اس کام کی ذمہ داری لی۔ سیٹھ عبد الواحد نہر زبیدہ کے خزانچی اور تحویلدار مقرر ہوئے اور یہ صدقہ جاریہ ان بزرگوں کی کوششوں سے دوبارہ جاری ہو گیا۔[1]

ہندوستان کے مسلمانوں کا اعتماد

حضرت حاجی امداد اللہ اور مولانا رحمت اللہ صاحب کی شخصیتیں ہندوستان سے مکہ معظمہ میں ہجرت کرنے کے بعد بھی اسی قدر ہر دلعزیز اور قابل اعتماد تھیں جس طرح ہندوستان کے قیام کے زمانہ میں عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ ان حضرات کی طرف مکہ معظمہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کی نگاہیں لگی رہتی تھیں۔ ان کے ارشاد اور فرمان اور مشورہ کو دل میں جگہ دیتے تھے۔ چنانچہ آج سے ستر سال قبل عرب میں اور خاص طور پر حجاز میں زبردست قحط پڑا۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمان عربوں کی امداد کرنا چاہتے تھے حجاز میں اعانت اور امداد کس کے ذریعہ کی جائے۔ اس وقت ان ہی بزرگوں کے نام سامنے آئے اور مشیر قیصر لکھنؤ کے ایڈیٹر نے ۱۲ فروری ۱۸۹۰ء کے شمارے میں انہی کے نام نامی شائع کرے۔

"مکہ معظمہ صانہا اللہ شرفاً و تعظیماً کی تحریرات سے معلوم ہوا کہ ملک عرب قیامت کی مصیبت قحط سالی میں مبتلا ہے۔ انسان و دواب پر فقدان غلہ و حشیش سے عرصہ عالم تنگ ہو رہا ہے۔ یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ انسان غیر ماکول اللحم جانور مثل گربہ وغیرہ کے کھانے پر بحالت اضطرار مجبور و ناچار ہوئے ہیں۔ کاہ جس میں چند چوب مثل نرکل وغیرہ لگے ہوتے ہیں، ایک ریال قیمت پانے لگے۔ غرض ہر چہار طرف

---

[1] ایک مجاہد معمار ص ۵۳

شورالغیاث بلند ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

.... اس میں شک نہیں کہ ابھی تک ہند کے دولت مند اور عالی ہمت مسلمانوں کو خبر ہی نہیں ہوئی ورنہ ہمسائیگان الہیٰ وھموطنان ختمی پناہی کی امداد کے لئے ضرور بضرور کلکتہ بمبئی، رام پور، جونا گڈھ، ٹونک، بھوپال، بہاولپور، پٹنہ، دہلی کے علاوہ ہندوستان کے اور بہت سے نامی مقامات سے کافی چندہ جمع ہونا شروع ہوتا۔ اگرچہ عجلت کو کام فرما یائے اور فراہمی چندہ کے لئے جابجا انجمنیں قائم ہوں۔ روپیہ غلہ کے بھیجنے کا انتظام ہندوستان میں جناب مولوی رحمت اللہ صاحب وجناب حاجی امداد اللہ صاحب کے ذریعہ ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل جود و عطا کو توفیق خیر عطا کرے۔ آمین"

عرب کے قحط کے بارے میں لوگوں میں شک پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے انگریزی اخبارات اس سلسلہ میں خاموش تھے لیکن گورنمنٹ کے اشتہارات سے قحط کی تصدیق ہو گئی تھی تو ایک طبقہ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ارادہ حج فسخ کر دو۔ مگر اردو اخبارات نے بتایا کہ قحط ضرور پڑا ہے مگر اتنا نہیں جتنا پروپیگنڈا کیا گیا ہے۔ اس مخدوش حالات میں اور فریضہ کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے ایڈیٹر شیر قیصر نے ۹ر اپریل ۱۸۹۰ء کے پرچہ میں یہ مشورہ دیا ہے کہ مولانا رحمت اللہ سے حالات معلوم کرکے ان کے مشورہ پر عمل کیا جائے

"علاوہ اس کے لوگ انڈس کمپنی بمبئی نے اشتہار دیا ہے کہ جو حاجی حج کو جانا چاہیں وہ شوق سے آئیں۔ اس سال بھی برابر آگبوٹ جدہ کو روانہ ہوں گے۔ چنانچہ ۱۲ر اپریل، ۱۱ر مئی، ۲ر جون تاریخ روانگی آگبوٹ مقرر ہوئی۔ ان خبروں اور اشتہاروں کو دیکھ کر بعض شائقان حج تو اپنے ارادہ پر قائم ہیں .... حاجی و مہاجر عبدالرحیم جو کعبہ شریف کے

حلوائی ہیں۔ ان سے مہتمم مشیر قیصر سے بارہا ملاقات ہوئی۔ انہوں نے
قحط کی تصدیق کی اور جناب حاجی منشی خیرات علیخاں کے پاس جوناگڈھ
متعدد خطوط متواتر آئے اور آ رہے ہیں جن میں شدائد قحط کا بیان ہے
ایک خط میرے سامنے بھی آیا تھا جس میں ان کے کسی عزیز یا دوست
نے لکھا تھا کہ جدہ سے کعبہ شریف تک ساٹھ اونٹ راستے میں مرے
ہوئے میں نے دیکھے ہیں۔ اس پر قیاس کر کے منشی صاحب ممدوح کی
رائے تو یہ ہے کہ اس سال ہرگز نہ جانا چاہیئے۔ اس لئے کہ جس کے پاس
سرمایہ ہے ان کو راستہ میں غیر مامون ہونے سے لٹ جانے کا خوف ہے
اور جن کے پاس سرمایہ کم ہے ان کی ہر طرح کی خرابی ہے۔ لیکن بعض آدمی
تاہم اپنے شوق صادق سے باز نہیں آتے۔ حتّٰی کہ بعض رئیس جوناگڈھ
تک سے روانہ ہوئے اور مقامات میں لوگ عازم حج بیت اللہ ہیں
چونکہ ہزار آدمی کعبہ شریف میں ایسے ہیں۔ جن کی اسی پر گذر ہے کہ
حاجیوں کو مکان کرایہ پر دیتے ہیں اور سینکڑوں مساکین اور دکانداروں
کی معیشت کا سہارا حاجیوں کے سبب ہے۔ بس بعض لوگوں کی رائے
ہے کہ اگر حاجی نہ جائیں گے تو اہل حرم کو اور زیادہ نقصان پہنچے گا
اور سب قافلوں کا لٹنا یقینی نہیں۔ بہت سے قافلوں کے صحیح و سلامت
پہنچنے کی امید ہے۔ ایسی حالت میں مناع اللخیر بن کر حج سے روکنا نہیں
چاہیئے۔ خصوصاً ذی مقدور اور امراء کے جانے میں جبکہ ان کے پاس
روپیہ اور غلّہ بکثرت ہو اور سامان حفاظت بھی تو ان کو اختیار ہے۔
جہاں لٹ جانا احتمال ضعیف ہے۔ اگر احتمال قوی بھی تو خدا پر چھوڑ
دیا جائے۔ ہاں جن صاحبوں کو خوف ہو وہ نہ جائیں۔ اب جن کو زیادہ

اطمینان ہو وہ مولانا رحمت اللہ سے مشورہ فرمالیں ۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اور حاجی امداد اللہ مرحوم و مغفور

صرف عالم ہی نہیں بلکہ روحانی پیشوا بھی تھے ۔ ان کی دور رس نگاہیں بہت کچھ دیکھتی تھیں جو کتابی ملا یا عالم قطعاً نہیں دیکھ سکتا تھا ۔ یہ ہر دو حضرات انگریزوں کے سخت ترین مخالف تھے ان کی بقا کسی صورت سے نہیں چاہتے تھے ۔

جب حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب سے شرکت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا وہ فروری ۱۸۹۰ء کے مشیر قیصر میں درج ہے ۔ ان کی رائے کی تصدیق تجربہ نے بھی کردی کہ . . . ان تنگ نظر کانگریسیوں کے ساتھ جو قدم قدم پر فرقہ پرست دشمن ملک، اور پاکستانی ایجنٹ ہونے کا مسلمانوں کو خطاب دیتے ہیں کیسی مفید ثابت ہوئی ۔

"حاجی نواب عمر علی خاں صاحب رئیس باسودہ نے مشیر قیصر مطبوعہ ۳۰ جنوری ۱۸۹۰ء میں مولانا رحمت اللہ صاحب مہاجر مقیم مکہ معظمہ کا ایک خط چھاپا ہے جو کانگریس کی بابت ہے یہ خط نواب صاحب نے مولانا صاحب کو لکھا تھا ۔ اس کے جواب میں انھوں نے یہ تحریر فرمایا کہ اول تو کانگریس کے اصول سے اچھی طرح واقف نہیں ۔ تاہم اگر اس کے اصول اچھے بھی ہوں تو بعض وجوہ سے مسلمانوں کے حق میں مضر ہے ۔"

علمی طبقہ میں ردِ نصاریٰ کی کوششوں کا اعتراف

حیات شبلی کے دیباچہ میں علامہ سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں ۔

" انگریزوں کے برسر عروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز

ہوا۔ عیسائی مشنریوں نے اپنی نئی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ روئیں پر حملے شروع کر دیے۔ دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پاکر ان پر حملہ کی جرأت پائی اور سب سے آخر میں یورپین علوم وفنون اور تمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔ خدا نے عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب آگرہ اور اس کے بعد مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رحم علی صاحب منگلوری، مولانا عنایت رسول چڑیاکوٹی، مولانا سید محمد علی مونگیری وغیرہ اشخاص پیدا کئے جنھوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیئے۔ اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا وجود عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں تھا اور کون باور کر سکتا تھا کہ اس وقت میں پادری فانڈر کے مقابلہ کے لئے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود انہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کے لئے ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دے گا

مولانا الطاف حسین حالی نے بھی مولانا رحمت اللہ اور ان کے ساتھیوں کی عیسائیوں کی سازشوں اور ناپاک جد وجہد کو ختم کرنے کے لئے جو سعی کی اس کو سراہا اور اس زمانہ میں اُن کی ردِ نصاریٰ کی کتب کی اشاعت کو ضروری قرار دیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"ہندوستان میں اسلام خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ قحط کے دوران میں ان کو دبلا پتلا شکار پیٹ بھر ادل جاتا تھا مگر وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فربہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ دانت ان کا مسلمانوں پر تھا اس لئے ان کی منادیوں میں ان کے اخباروں میں ان کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھاڑ اسلام پر ہوتی تھی۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے برائیاں ظاہر کرتے تھے۔ بانی اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع و اقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب اور اکثر افلاس کے سبب ان کے دام میں آ گئے۔ اس خطرہ سے بلاشبہ علمائے اسلام جیسے مولانا آل حسن، مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم اور ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ متنبہ ہوئے۔ انھوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلہ میں لکھیں اور ان سے بالمشافہ مناظرہ کئے جس سے یقیناً مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ردِ نصاریٰ میں تالیف و تصنیف اور پادریوں سے مقابلہ و مناظرہ کا سلسلہ ایک جماعتی نہ سہی لیکن انتظامی شکل میں شروع ہو گیا تھا۔ قدرتی طور پر ہر جگہ مسجدیں تھیں۔ علمائے کرام کے وہ گڑھ تھے۔ اس انقلابی تحریک کے چلنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ رہنما کی ضرورت تھی، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے بہتر کون ثابت ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اس کی بنیاد ڈالی اور اس کام کے لئے دہلی آگرہ کو مرکز قرار دیا۔ یہاں بھی مولانا نے تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ انکی جماعت میں ہندوستان کے انتہا پسند اور حضرت اسماعیل شہید کے فدائی مسلمان تھے۔ جن کی تعداد کافی تھی۔

پادری فانڈر نے جس طرح ہندوستان میں ہندوستان کے مذاہب اور خاص طور پر اسلام کے خلاف کتابیں لکھنے کی پہل کی تھی اور ان کتابوں کے ذریعہ ایک فتنۂ عظیم برپا کیا تھا۔ اسی طرح مولانا آل حسن اور مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس فتنہ کا سدِ باب ایسا کیا تھا کہ عرصہ تک عیسائی مشنریوں نے سکوت اختیار کیا۔ اور ان کتابوں کے جواب نہیں دے سکے ۔ اور خاص طور پر مولانا رحمت اللہ صاحب عیسائی مشنریوں کے لئے بڑی پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے چنانچہ مولانا محمد علی منگیری اپنی تالیف مرآۃ الیقین میں مولانا رحمت اللہ صاحب کی کتب ردِّ نصاریٰ کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

"عرصہ بیس برس کا ہوا کہ اہلِ اسلام اور عیسائیوں میں بازارِ مناظرہ نہایت گرم ہوا تھا اور مولوی رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں نے اہلِ اسلام کی طرف سے جس زور شور سے تحریریں کی ہیں انہیں ہر منصف مزاج دیکھ کر اُن کی داد دے سکتا ہے۔ اس وقت میں جو ان کے مقابل پادری فنڈر صاحب تھے انہوں نے بہت کچھ زور مارا مگر مولوی صاحب نے ان کو مناظرہ تقریری اور تحریری میں کیا کیا عاجز کیا ہے کہ پادری صاحب کا دل ہی جانتا ہوگا۔ یا جن منصف مزاجوں نے اس مناظرہ کو دیکھا ہے وہ اس کیفیت سے بخوبی آگاہ ہیں مولانا صاحب نے بڑی بڑی کتابیں اس فن میں تصنیف کیں مثلاً (۱) ازالۃ الاوہام (۲) ازالۃ الشکوک (۳) اصح الاحادیث (۴) تقلیب المطاعن (۵) مُعدّل اعوجاج المیزان (۶) اظہار الحق وغیرہ ازاں جملہ ان کی ایک کتاب اعجازِ عیسوی ہے۔ عجب نادر کتاب ہے جس کی خوبی بیان نہیں ہو سکتی کسی مخالف کا زہرہ نہیں کہ اس کے جواب میں قلم اٹھا سکے یوں آئیں بائیں شائیں بکنے کو جس کے جی میں آئے بکے۔

جس وقت یہ کتاب لکھی گئی اس وقت بڑے بحاثہ پادری فنڈر صاحب

موجود تھے اور مدت تک بعد طبع اس کتاب کے زندہ رہے اور متعدد کتابیں مناظرہ میں لکھیں اور بہت کچھ خاک چھانی مگر اس کے جواب میں قلم نہ اٹھا سکے اور بعد اس کے چودہ برس تک کسی پادری کالے یا گورے نے اس کے جواب میں دم نہ مارا۔ بعد اس مدت کے ۱۸۶۸ء میں ایک کرسچن عماد الدین نے اپنی سرخروئی کے لئے اس کے مقابلہ میں لاف زنی کی اور آدھی تہائی کتاب کے جواب میں الٹی سیدھی تقریریں کیں اور چکنی چپڑی باتیں بنائیں تاکہ مشن کا تر لقمہ کسی طرح ہضم ہووے۔"

حافظ ولی اللہ لاہوری مؤلف "صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیطان" نے مولانا محمد علی مونگیری کی تائید کی ہے:

"اکبر آباد میں جناب پادری فنڈر اور مولوی رحمت اللہ کے درمیان باہم مباحثہ مذہبی ہوا۔ چنانچہ اس کا حال خاص و عام کو معلوم ہے کہ پادری صاحب مذکور نے کس طرح منحرف ہونے اناجیل مروجہ کا اقرار صاف کیا۔ بعد اس کے کسی پادری صاحب سے ہندوستان میں اتنی جرأت بھی نہ ہو سکی کہ نام کبھی بحث کا زبان پر لائے۔ مدت کے بعد ۱۸۶۷ء میں شہر امرتسر میں عماد الدین پانی پتی نے کہیں سے سر نکالا۔ چنانچہ چار علماء اہل اسلام اور پادریوں کے جن کی تفصیل مباحثہ دینی دیکھنے سے واضح ہوتی ہے اس احقر نے اس کا ایسا سر پھیرا کبھی سر بر آر نہ ہوا۔ اس وقت سے آج تک پھر کسی نے کبھی دم نہ مارا۔"

حجاز کے حکام کے خلاف وزیر اعظم کو خط

مولانا رحمت اللہ صاحب کے زمانہ میں حجاز پر ترکی حکومت کا قبضہ تھا۔ یہاں کے حکام کی بدعنوانیوں کو دیکھ کر مولانا نے وزیر اعظم ترکی کو ایک خط

لکھا تھا اور ان کی غفلت شعاری کی وجہ سے یہاں کی آراضی سے جو پیداوار ہونی چاہئے تھی وہ نہیں ہو رہی ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں مدینہ منورہ کی اراضی کا غلہ باشندگان مدینہ منورہ کی ضروریات پوری کرنے کے بعد شام وفارس کے لشکروں کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ حالت ہے کہ مدینہ منورہ کا غلہ مدینہ منورہ کے لئے پورا نہیں ہوتا۔ اس خط میں دوسرے مسائل کا بھی ذکر مولانا نے فرمایا ہے۔ چونکہ یہ خط بڑا اہم ہے اس لئے اس کو پورا نقل کیا جاتا ہے۔

"آفندم دام مجدکم۔ بقول حافظ شیراز

فقیر گوشہ نشینی تو حافظا مخروش　　　　امورِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

بادشاہ گرامی کہ بتاکید مرا فرمودند تاسف خورد لا دریں بارہ می کشایم دعائے حضرت سلطان خلد اللہ ملکہ و دعائے امرائے کبار۔ او در اغلب اوقات ورد زبان می دارم بعدش عرض می کنم کہ غالباً خرابی در ریاسات جمیع اہل اسلام عدم وحدت و اتفاق فیمابینہم از دو سبب است یکے شیوع جہل در رعایا و دویم عدم التفات امرار عظام و کلار فخام لبوئے ازالہ آن اگر این جہل از مسلمانان دور شود قومے از اقوام دنیا مثل شان یافتہ نشود سیاحے از عقلائے امریکہ کہ در اکثر اقالیم سیاحت نمودہ چہ خوش فرمودہ کہ بہ تجربہ ہر دم محقق شد کہ عیسائیاں چنداں کہ در علم می افزایند۔ ہماں قدر از دیانت و ست شمتہ سلوک بر مسلک بے دینی و دہریت می نمایند۔ مسلمانان ہر قدر کہ از جہل می برآیند ہماں قدر و دیانت می افزایند۔ پس در صورت دور شدن جہل ازیں قوم در رسوخ عقائد اسلامیہ در اذہان شان سوائے فلاح دین و دنیا از وشان متصور نیست خدا کند کہ امرائے ما را لسوئے این امر توجہ شود۔ و ما را از مطاعن مخالفین بعض آن ہا را خاصہ نطس فاسد شان انتظام درحق انتظام دولت علیہ ادہا اللہ رب البریہ است بجاتے دست دہد و امید قوی ست کہ عنقریب در عہد خلیفہ

رحمان سلطان زمان خلد اللہ ملکہ مطابق الہام حضرت شیخ محی الدین ابن العربی قدس سرہ
کہ وقت ملاقات آن الہام عرض نمودہ بودم ۔ چہرہ این شاہد مقصود ببینم ۔ حالا بعض اعتراضات
را کہ از بعض امرائے انگریز شنیدہ ام یا در جرائد شان دیدہ ام می نگارم ۔"

اوّل این سلاطین آل عثمان غفر اللہ لاسلافہم و بارک اللہ فی اخلافہم از قرون
متعددہ بر حرمین شریفین تسلط اند۔ فنا این زمان از عہدۂ انتظام را این ہر دو ہم کہ اعتقاد
عظمت و شرف ہر دو را اہل از جمیع معابد دنیا می دارند بر آمدہ اند و کسے کہ انتظام معبد
خود کردن نتواند ۔

انتظام باوجود اعتقاد این چنین عظمت کردن نتواند از او امید انتظام دیگر
جا چہ داشتہ آید !

دویم این کہ امرائے عظام این سلطنت سنیہ ادامہا اللہ رب البریہ ہمیشہ بر زبان
شان است کہ ما خرچ حرمین شریفین بطوع خاطر جہت اجر آخرت از قرون متعددہ
آن قدر بر ذمہ خود گرفتہ ایم کہ از سلاطین دیگر تا مدت قلیل ہم این تحمل اگر محال عادی نبود بلا
شبہ از مشکلات بود و این قول شان حق است ۔ چنانچہ بر ناظر تاریخ پوشیدہ نیست لاکن نقل
این تحمل از جہت غفلت امرائے فخام و کلائے عظام این دولت است ۔ زیرا کہ اگر ادنیٰ التفات
بسوئے آبادی اراضی ملک عرب بسوئے تفحص معادن این ملک کردندی مداخل این ہر دو ایشان را
خرچ بل از خرچ امالات دیگر ہم سکبدوش گردانید نمی بنید کہ ہمیں ملک است کہ در
عہد حضرات خلفاء رضی اللہ عنہم از اراضی نواح مدینہ منورہ غلہ برائے لشکر شاہ و فارس
می رفت و حالا آں اراضی ہماں آراضیست کہ غلہ او بہ اہل مدینہ ہم کفایت نمی کند . . .
کہ اراضی نواح مدینہ منورہ بلکہ اکثر اراضئ ملک عرب اگر توجہ کردہ شود صالح زراعت
و آبادیست ۔ و در خیالے این مملکت اکثر معادن آب حیات است کہ در ملک جہاں
دیگر نیستند اگر بعد تتبع دوسہ معادن نجم ذکوئلہ پتھر، یافتہ ہم شوند ۔ مداخل آنہا جمیع اخراجات

ایں مملکت بل اخراجات بعض ایالات دیگر را ہم کافی باشد چہ جائے معاون دیگر۔

سویم۔ اینکہ عراق عرب در تسلط دولت علیہ ادامہا اللہ رب البریہ ست در عہد نوشیرواں عادل جمیع مملکت فارس عموماً و عراقِ عرب و عراق عجم خصوصاً ایں چناں آباد بودند کہ نوشیرواں برائے امتحان دو سال ہفت دہی از سلطنت خود اعلان دادہ بود کہ ہرکس در جمیع ممالکِ فارس عموماً، عراقین خصوصاً پنجاہ جریب آراضی غیر معمور در یک جا نشان خواہد داد۔ انعام بست ہزار سکہ الوقت خواہد یافت لاکن شرط آنست کہ آں آراضی قابل زراعت باشد پس بطمع زر ہرچند کہ تفحص رفت ایں قدر جریب زمیں در یک جا یافتہ نشد۔ بعدش اعلان کرد کہ اگر یکجا نشان داون نتوانند در جاہائے متعدد بایں قدر نشان دہند۔ بعد تفحص تام در تمامے مملکت در جاہائے مختلفہ قریب چہل جریب یافتند وحالا ایں عراق عرب است ہماں عراق عرب است کہ تا مراحل صورت آبادی در دیدہ نمی شود و سوائے آواز بوم و شغال شنیدہ نمی شود آوازے دیگر شنیدہ نمی شود۔

چہارم آنکہ اقالیم سوڈان و زنگبار بحسب معاہدات حق دولت علیہ است و آراضی این ممالک بسیار صلاحیت عمارت دارد۔ دولت علیہ را بسبب عدم عمارت سوائے آمدنی بعض بنادر جمیع بندگان اچیزے دیگر حاصل نیست اگر ایں اراضی حق خراب از خرابات بودے انصاری آں چناں در آبادی او کوشیدے کہ ما داخل او بقدر ثلث مداخل ہند رسیدے۔

پنجم ایں قول امرار دولت است کہ السیف لایکون من الخشب والباشا لایکون من العرب۔ پس حیرت این معنی است کہ بصرہ سابق در حوزہ (قبضہ و تصرف) انتظام بعض بدویان بود در عہد حکومت او واو خبرگیری آنجا نداشت و عمارت می شد و ہرسال از بغلات و سکھائے و کشتی ہائے تجارت قریب چہار صد در بندرگاہ او می رسید بلدہ آباد بود و ہوائے بسیار بد نداشت۔ بعدش وقتے کہ دولت آنرا ضبط کرد

درو انتظام خود گرفت از خبر گیری . . . او غفلت شد کہ بسبب غفلت بند آب بشکست و دو ثلث آبادئی آن بلدہ خراب شد و آن بلدہ معدن وبا و امراض گشت و نقصان تجارت بآں درجہ رسید کہ در تمام سال قریب یکصد تغلہ بنسک و کشتی ہائے تجارت ہم نمی رسد پس انتظام امرار دولت ناقص از انتظام بدویاں است .

ششم۔ آں کہ قاعدہ انتظام است کہ اول در برو صحاری در عمارت اراضی صالحہ زراعت و در اندروں آبادئی بلاد۔ بتدریج صنائع و فنون می کوشند، بعدش بتدریج در خراج و آمدنی ہر دو شیئاً فشیئاً می افزانید و امرائے دولت از ہر دو عموماً و در اول خصوصاً غفلت می کنند وگرنہ مملکت دولت علیہ اداہما اللہ رب البریہ دریں وقت ہم زائد از مملکت فرانسہ است۔ پس کسے بالانصاف مداخل ہر دو ملک را ببیند و صنائع فنون ہر دو جا را ملاحظہ کند و ہم چنیں دیگر مطاعن مخالفین است کہ از زبان بعض شان شنیدہ ام یا در جرائد شان دیدہ ام۔ اگرچہ در جمیع آنہا اقوال آنہا را خالی از مبالغہ نمی دانم لاکن بلاشک بعض آنہا قابل قبول کردنی است و ایں ہمہ بطور حکایت از تحریر و تقریر مخالفین بحسب امر سامی نقل کردہ ایم۔ اگر در بعض غلطیت آں غلطے در منقول عنہ خواہد بود نہ در نقل و حکایت۔ واللہ اعلم۔ رحمت اللہ از مکہ

مولوی احمد الدین صاحب چکوالی نے حسب ذیل تاریخی قطعہ مولانا رحمت اللہ صاحب کی وفات پر کہا ؎

آہ از حین مصائب اختراں	مجمع اندوہ و رنج بیکراں
گشت صبر از خاطر غمدیدہ گم	ہست قول مثنوی شاہد برآں
بشنو از نے چوں حکایت می کند	کاین نے خامہ است دل را ترجماں
وز جدائیہا شکایت می کند	با زبان تیز و چشم خوں فشاں

کز نیستاں تا مرا ببریده اند | سخت حیرانم بدست این وآں
در فراقم مرد و زن نالیده اند | گریه ام شورے وے در حاضراں
سینه خواہم شرحه شرحه از فراق | گر کنم رنج نہانی را عیاں
تا بگویم ذکر درد اشتیاق | ز انتقال قبلۂ اہل دلاں
حضرت مخدومنا علم الہدیٰ | فیض بخش ناکسان و ناقصاں
فخر اہل الہند فی ملک العرب | بلکه در اسلامبول[1] از وئے نشاں
در عراق و ہند و مصر و شام و روم | در فضائل گشته ممتاز زماں
کاشتہار الشمس فی نصف النہار | فی بسیط الارض باللطف العیاں
زیر ایں گنبد ہزاراں ز اہل کمال | مشتہر گشتند اما نے چناں
ماتمش یک نیست بل صد ماتم است | ظلمتے آمد عیاں اندر جہاں
فوت عالم موت عالم گفته اند | سیما آنانکه نائد مثل شاں
بود در دنیا چراغ دین و دل | تاکه شیخ ملک حرمین گشت آں ۱۳۰۸ھ
روز جمعه بست و دوم از ماه صوم ۱۳۰۸ھ | رفت سوئے باغ شه یعنی جناں
غرق باده در رسول فیض حق | دام بالافضال فی کہف الاماں
چونکه الطاف جناب آمد بیاد | آں زبان بر دل رسد زخم گراں
زار مینالم ز حال زار خویش | چوں ندانم چارۂ اندوه جاں
لاجرم چوں نیست درماں غیر صبر | می نمایم بر دعا ختم بیاں
رحمة الله علی اسلافه | نعمة الله باد در اخلاف شاں

گو غریب الوطن تاریخ وصال
رحمة الله لدی خیر الجناں
۱۳۰۸

[1] دار الخلافت قسطنطنیه

مولانا رحمت اللہ صاحب کی خواہش تھی کہ وہ مدرسہ صولتیہ کے احاطہ میں دفن ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے مدرسہ کے اسی مقام پر اپنی قبر بنوائی تھی۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو اعزا اور مقربین نے آپ کی میت کو اسی قبر میں دفنانا چاہا لیکن حکام مانع ہوئے۔ چنانچہ اس واقعہ کا ذکر حضرت مولانا محمد سعید صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ نے مدرسہ کی روئیداد سنہ ۱۳۲۶ھ میں کیا ہے۔

"ہماری مشکلات کا اندازہ صرف ایک ادنیٰ بات سے ہو سکتا ہے کہ حکماً مجبور کیا گیا کہ کوئی سالانہ جلسہ یا اہل علم کا کوئی اجتماع مدرسہ میں نہ ہو سکے۔ اس قسم کے لغو اور بیکار احکامات اور سختیوں سے اس زمانہ کے حکام کا دلی منشار اور مقصود یہ تھا کہ ارکان مدرسہ کی ہمتیں لپست ہوں اور حامیان مدرسہ آخر مجبور ہو کر اپنی توجہ اس کام سے ہٹالیں اور یہ بنا بنایا کام جو روز بروز ترقی پر ہے کسی طرح برباد ہو جاتے۔ بانیٔ مدرسہ مولانا رحمۃ اللہ کی تمنا اور آرزو تھی کہ وہ اس مستعار اور محدود دی زندگی سے جب ابدی حیات اور دائمی مستقر کی طرف سفر کریں تو ان کا مرقد مدرسہ کے احاطہ میں ہو۔ جس کو انہوں نے اپنی زندگی میں بڑے شوق سے خود تیار کرایا تھا۔ آہ یہ خیال کس قدر درد انگیز ہے کہ مولانا کی دلی تمنا اور مدت العمر کی وہ دیرینہ آرزو دور سابق کے حکام کی بدولت ہمیشہ کے لئے پائمال ہو گئی اور مولانا اپنی بنائی قبر میں جو مدرسہ کے احاطہ میں خاص اسی دن کے تیار کی تھی دفن نہ ہو سکے۔ جن مقامی حکام نے مولانا کو مدرسہ کے احاطہ میں دفن نہ ہونے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد اس محسن قوم اور خادم ملت کی قبر پر سینکڑوں وہ ہندوستانی جن کو

مرحوم سے عقیدت اور خاص تعلق تھا - فاتحہ کی غرض سے آتے رہیں گے اور مرحوم کی اس علمی یادگار کو عظمت و محبت کے ساتھ دیکھنے کا ذریعہ یہ قبر بنے گا - اس مصلحت نے ان حاکموں کو مجبور کیا کہ وہ بغیر کسی وجہ اور قانونی حجت کے مرحوم کو مدرسہ میں دفن نہ ہونے دیں " (ص۴و۵)

مدرسہ صولتیہ

سنہ ۱۲۹۰ھ میں حج بیت اللہ کے لئے کلکتہ کی ایک مخیر و باہمت اور خدا ترس خاتون صولت النساء بیگم اپنی صاحبزادی اور داماد کے ساتھ مکہ معظمہ آئیں۔ ہمدرد قوم اور نیک انسان کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ حرمین میں ایسا کام کر جائے جو صدقہ جاریہ کے طور پر قائم رہے۔ صولت النساء صاحبہ کا مکہ معظمہ میں ایک رباط (سرائے) تعمیر کرانے کا ارادہ تھا۔ ان کے داماد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے مسجد حرم کے درس میں شرکت کرتے تھے۔ ایک روز آپ نے اپنی خوش دامن صاحبہ کے اس ارادہ کا ذکر کر کے مشورہ لیا۔ مولانا نے فرمایا۔ مکہ معظمہ میں رباطیں تو کافی ہیں۔ یہاں ایک مدرسہ کی سخت ضرورت ہے۔ کوئی مستقل مدرسہ نہیں ہے۔

صولت النساء صاحبہ دوسرے روز مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ انہوں نے آپ کے مشورہ کو پسند کیا اور مدرسہ کے واسطے زمین خریدنے کے بارے میں گفتگو کی اللہ تعالیٰ کو یہ عظیم کام ان سے لینا تھا۔ چنانچہ محلہ خندریسہ میں زمین خریدی گئی اور مدرسہ کی تعمیر بھی شروع کر دی گئی۔ تعمیر کے دوران صولت النساء صاحبہ بھی ہوتی تھیں اور تعمیر کا کام دیکھ کر تشریف لے جاتی تھیں

اس مدرسہ کی زمین کی رجسٹری کی ابتدائی عبارت حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے یہ تحریر فرمائی تھی۔
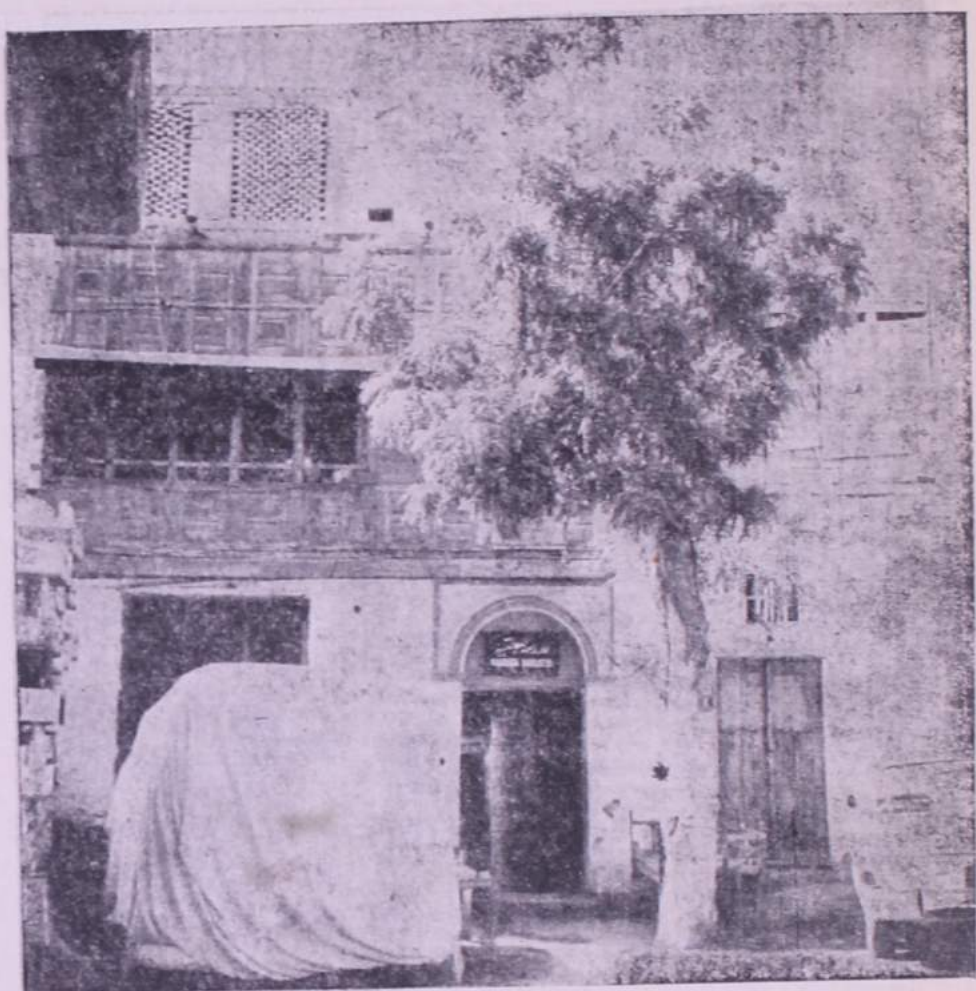
مدرسہ صولتیہ کی قدیم عمارت کا صدر دروازہ
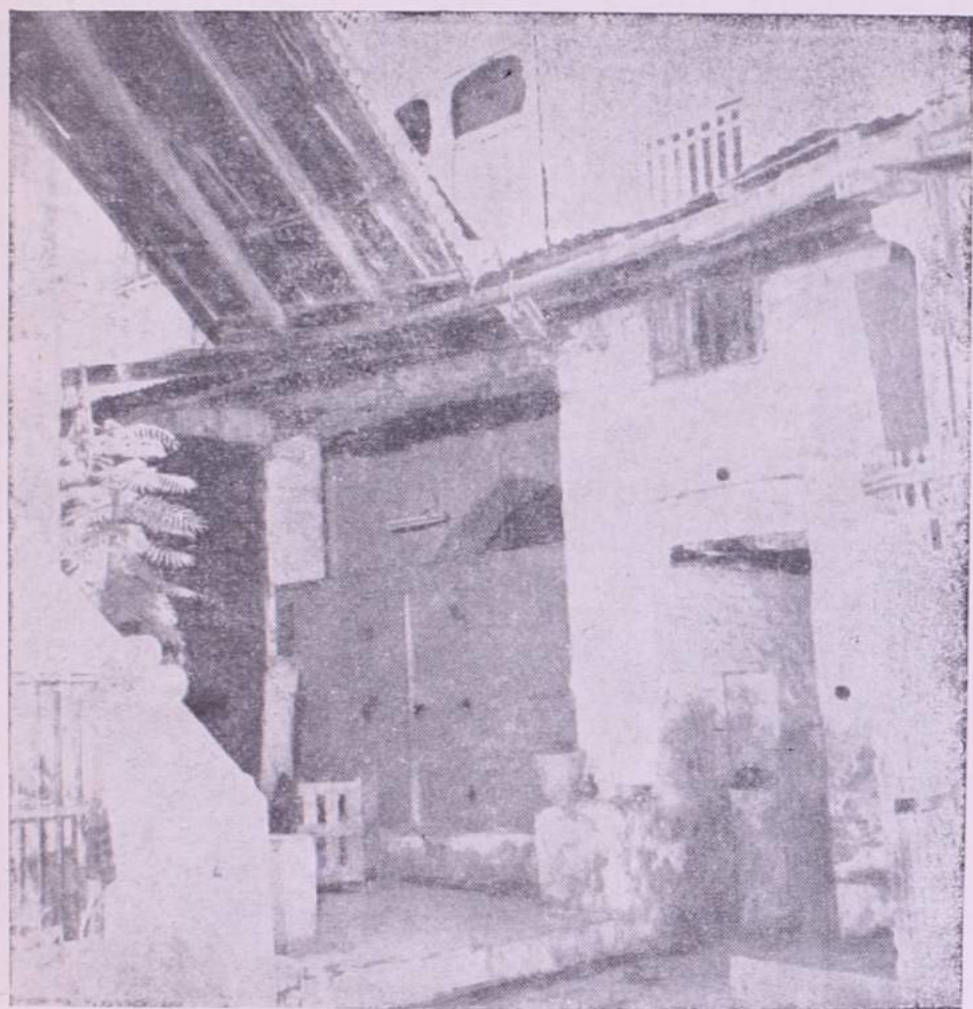
مدرسہ صولتیہ کی قدیم عمارت کا اندرونی منظر

"حمد و نعت کے بعد یہ ہے کہ اگرچہ مدرسہ ہندیہ حضرات اہل ہند کی ہمت اور توجہ سے مکہ معظمہ ادام اللہ شرفہا میں سنہ ۱۲۹۰ھ رمضان کے مہینے میں قائم ہوا تھا۔ پر اسباب چند در چند سے جو اس سنہ کے چار مہینوں میں کئی طرح سے ہر جا پیش آئے۔ سو اس لحاظ سے ہم ان چار مہینوں کو نظر سے گرا کے اس مدرسہ کے قیام کو محرم الحرام سنہ ۱۲۹۲ھ گنتے ہیں اور سب امور متعلقہ اس مدرسہ کو اسی سال سے لیتے ہیں۔ اللہ خیر سے ان امور کو انجام دیجیو۔

سنہ ۱۸۷۴ء مطابق سنہ ۱۲۹۱ھ میں مدرسہ کی عمارت تعمیر ہوئی۔ مدرسہ کا نام صولۃ النساء صاحبہ کی نام کی مناسبت سے رکھا گیا۔ اس اولین وسیع عمارت میں پانچ بڑے کمرے اور تین چھوٹے کمرے اور ایک وسیع صحن ہے۔ جب اس مدرسہ کی تکمیل ہو گئی تو ۱۲ / شعبان سنہ ۱۲۹۱ھ روز چہار شنبہ میں مدرسہ صولتیہ میں سب مدرسوں اور طالب علموں کو لایا گیا یکم شعبان سنہ ۱۲۹۲ھ سے نواب محمود علی خاں بہادر والیٔ چھتاری نے سو روپیہ ماہوار اس مدرسہ کے لئے مقرر کئے۔

جو بھی کام شروع کیا جاتا ہے۔ اس میں ابتدا میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ مولانا رحمت اللہ کے سامنے بھی پریشانیاں آئیں جن کا انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ایک پریشانی کا باعث غیر بنے اور دوسری پریشانی اپنوں نے پیدا کی جو یہ تھیں

(۱) انگریزی کونسل جدہ میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے جس طرح ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کو پریشان کیا اور جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور اس جنگ میں وہ خود بھی شریک ہوئے۔ اسی طرح یہ مکہ معظمہ میں اپنی درسگاہ قائم کر کے انگریزوں کے خلاف پروپیگنڈا کریں گے اور باغیانہ تحریک کی بنیاد ڈالیں۔

(۲) مقامی ترکی حکام کو یہ خطرہ تھا کہ مکہ معظمہ میں ہندوستانی ہاتھوں سے مدرسہ کا

قیام کیا جارہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مدرسہ آئندہ بیرونی اقتدار اور اغیار کی مداخلت کا کسی وقت بھی ذریعہ بن جائے۔ ترکوں کی یہ بدگمانی کسی حد تک صحیح تھی کیونکہ ان کو غیر ملکی عیسائی مشنریوں کی تکلیف دہ حرکتوں کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا

ان دقتوں کے باوجود مولانا رحمت اللہ کے ارادہ میں کمزوری نہیں آئی۔ انہوں نے بڑی ہمت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور مدرسہ کا کام جاری رکھا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا شک وشبہات کے بادل چھٹ گئے اور مدرسہ صولتیہ کے راستہ ہموار ہوتا چلا گیا۔

جب مدرسہ صولتیہ کی تعمیر ہو گئی تھی اس وقت تک مکہ معظمہ میں نہر زبیدہ تیار نہیں ہوئی تھی اور پانی کی بڑی قلت تھی۔ مکانات میں بارش کا پانی جمع کرنے کے لئے یہ انتظام کیا جاتا تھا کہ چشموں کو پختہ ہوا کر تہ خانوں اور سرد ابوں کی طرح زمین دوز درجے بنوا لیتے تھے۔ تاکہ بارش کا تمام پانی چھتوں سے جمع ہوکر آتا رہے۔ پانی کا مخزن مدرسہ میں تیار نہیں ہوا تھا۔ جس کے لئے صولت النساء بیگم سے کہا گیا تھا۔ ان کے جانے کے دن قریب آ گئے تھے۔ چنانچہ جب ایک روز ان کے جانے کا رہ گیا اور وہ دوسرے روز جانے کا ارادہ کر رہی تھیں تو اسی شب کو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کو جنت الفردوس میں عالیشان مکان ملا ہے مگر اس میں کوئی حمام یا جگہ پانی رکھنے کے لئے نہیں ہے۔ صبح کو بیگم صاحبہ نے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو بلایا اور مدرسہ میں پانی کا مخزن بنانے کے لئے روپیہ دیا اور انہوں نے تاحیات مدرسہ کے لئے پچاس روپیہ ماہانہ مقرر کئے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کے سامنے مسلمانوں کے مذہبی حالات کا پورا نقشہ تھا وہ مسلمانوں کو اختلافات کی گندگی سے نکالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مدرسہ صولتیہ کو اختلافات کا اکھاڑہ بنانے سے باز رکھا اور اسکے لئے یہ مسلک اختیار کیا۔

(۱) قطعی طور پر سیاست اور سیاسی دلچسپیوں سے ہر کارکن و مدرس وطالب کو بے تعلق رہنا ضروری ہے۔

(۲) اخلاقی رموز اور مختلف فیہ مسائل سے کلی طور پر احتراز کیا جائے۔

(۳) تفریق اور گروہ بندی سے ہر طرح بچنا چاہیئے۔

چنانچہ ان ہدایات پر مدرسہ صولتیہ کے مہتمموں نے پوری طور پر عمل کیا۔ اور ان کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ پچاس سال کے بعد مولانا محمد علی جوہر رحمتہ اللہ علیہ حجاز پہنچے اور مدرسہ صولتیہ کا معائنہ کیا۔ اس کی پچاس سالہ زندگی کا جائزہ لیا۔ تو آپ نے اس کی پالیسی کے بارے میں تحریر فرمایا۔

"مدرسہ کی خوش نصیبی اور مولانا مرحوم کی نیک نیتی کا ایک عمدہ ثمرہ یہ ہے کہ اسکے تمام مدرسین اور طلباء اس وقت کی آفتوں سے علیحدہ ہیں ان کے خیالات میں نہ افراط و تفریط ہے اور نہ جدال و نزاع کا انہیں شوق ہے اور نہ کسی مسلمان کی تکفیر و تفسیق کا انہیں خیال ہے۔ الحمدللہ اس نازک اور فتنہ کے وقت میں اس بلا سے بچنا ہی خدا کا بڑا فضل ہے وہ اس مدرسہ پر ہے۔"

مولانا رحمت اللہ صاحب نے مدرسہ صولتیہ کے قائم کرنے کے بعد مدرسہ کے انتظامات کو چلانے کے لئے مہاجرین حرم میں سے با اثر اور اہل علم حضرات کی ایک منتظمہ یا مشاورتی کمیٹی قائم کر لی تھی یہ بات تو ظاہر ہے کہ جو لگن اور تعلق مولانا کو مدرسہ صولتیہ سے ہو سکتا تھا وہ اور ممبران کو نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ جب مولانا نے مدرسہ کے کام کو چلانے کے لئے مشاورتی کمیٹی کی میٹنگ میں یہ تجویز رکھی۔ کہ پہلے معزز ارکان حصول قرض میں امداد فرمائیں۔ تو ان لوگوں نے بجائے مدد کرنے کے مدرسہ کو ایک دردسری سمجھ کر اور نہ چلنے والا جان کر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور تحریری استعفے دید ئے۔ اس نازک موقعہ پر ان لوگوں کی مدرسہ سے علیحدگی بڑی پریشان کن چیز تھی۔ لیکن اس کے باوجود مولانا نے تنہا اپنے کندھوں پر

تمام ذمہ داری کا بارِ گراں اٹھایا اور زمانہ حیات میں مولانا صاحب نے مدرسہ کا انتظام خود ہی کیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی ہی ذات مدرسہ کے قیام کا واحد ذریعہ تھی۔[1]

مدرسہ صولتیہ کی ابتدائی حالت

مدرسہ صولتیہ کس طرح قائم ہوا۔ ابتدا میں اس میں کتنے معلم اور طالب علم تھے اور کیا کیا کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اس کا مختصر حال مولانا رحمت اللہ صاحب کی قلم سے سنیئے۔ یہ خط آپ نے خانصاحب ڈپٹی امداد العلی صاحب کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ خط طویل ہے۔ چونکہ اس سے مدرسہ کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے اس لئے اس کو تمام وکمال نقل کیا جاتا ہے۔

"جناب ناصر الحق ڈپٹی صاحب مکرم مجمع مکارم اخلاق سلمہ اللہ تعالیٰ

سلام مسنون کے بعد گزارش ہے کہ آپ کا عنایت نامہ پہنچا اور دو دفعہ کے اخبار بھی پہنچے ..... مدرسہ کے لئے جو دو بار آپ نے ایک سو پینسٹھ روپے روانہ کیا وہ منشی ظفر اللہ کی معرفت پہنچے۔ مدرسہ کا حال جو استفسار فرمایا۔ مکرم میرے مدت سے ارادہ تھا کہ آپ کو اس کے حال سے اطلاع دوں۔ پر کئی وجوہ کے لحاظ سے منجملہ اس کے یہ بھی ہے کہ لوگوں نے اکثر ایسی چیزیں کمائی کے حیلے بنا رکھے ہیں اور ان حیلوں سے جمع کر کے کھا جاتے ہیں متامل تھا۔ اب جو آپ نے استفسار فرمایا گزارش ہے کہ مجھے مدت سے خیال تھا۔ کہ یہاں کے ہندیوں کی طرف سے اگر ایک مدرسہ جاری ہو تو بہت اچھا ہے۔ پر اوّل اوّل اپنی بے مقدوری اور ہم جلسوں کی کم رغبتی سے متامل تھا۔ سنہ ۱۲۹۰ھ کے شعبان کے آخر میں میرا ارادہ پکا ہوا اور اسی رمضان کے مہینہ کی پہلی سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ ابتدا میں گو مجھے بہت رنج رہا مدرسہ

---

[1] روئیداد مدرسہ صولتیہ بابت ۴۵ و ۱۳۴۶ھ
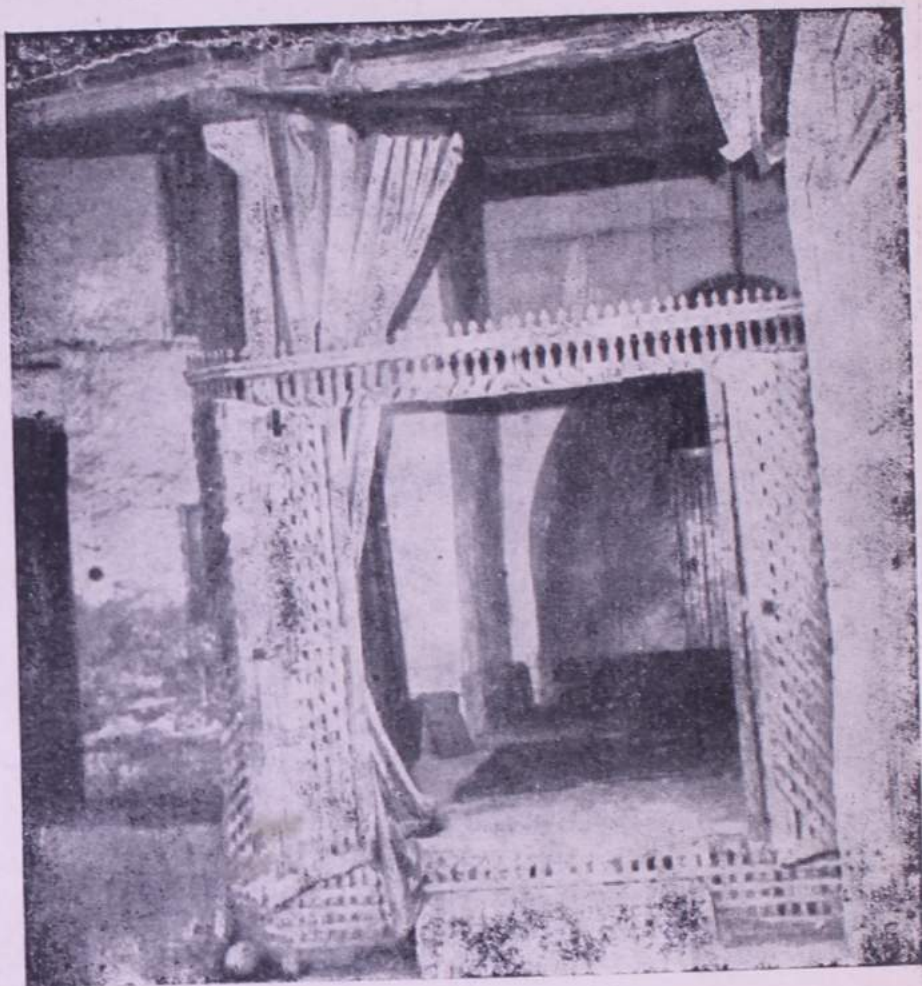
مدرسہ صولتیہ کی قدیم عمارت کا اندرونی منظر

جدید مدرسہ صولتیہ کا اندرونی منظر

کے لئے مکان نہ تھا۔ چار مہینے میں مدرسہ کے لئے تین مکان بدلے گئے۔ پر اسی
سال میں بی بی صولت النسار اور ان کے داماد شاہ نوازش حسین صاحب
کلکتہ محلہ سونڈے کے رہنے والے حج کے لئے آئے تھے انہوں نے یہ
حال سنکر بڑی مدد کی۔ اور بیس ریال قبالہ خرید کے لئے اور قبالہ بابت وقف
محکمہ قاضی میں دیئے۔ اور ایک ہزار پانچ سو اکیانویں ریال اس کی بنا پر
لگائے۔ سوان کے اس پر دو ہزار دو سو اکھتر ریال صرف ہوئے تھے۔
کہ بنگالے کے قحط سے جو ان کے مواضع زمینداری میں ہوا۔ ان کی قلت
آمدنی کا سبب ہوا۔ انہیں اتمام بنا سے روکا پھر میں نے ان کی رضا
اور اجازت سے چار سو ریال حاصل کر کے اس پر لگائے۔ ان دو ہزار
چھ سو اکھتر ریال میں تین مجلسیں جن میں دو بڑی بڑی اور ایک متوسط
ہے اور دو دیوان معہ ان کے آگے کے سائبانوں کے اور دو ٹانکی
جسے یہاں صہریج کہتے ہیں، ہر ایک جس میں گیارہ گیارہ سو قریہ یہاں
کی (بڑی مشک) اور ایک مخزن اور چھ پاخانہ تیار کرائے۔ اور ان سب میں
استحکام بنا کا لحاظ رہا۔ پھر بسبب نہونے پیسے کے بنا رک گئی۔ اب ضروری
حاجت بنا میں اتنی ہے کہ ایک دروازہ کلاں مدرسہ کی بنا میں جس پہ
ایک اور مجلس بنائی جاویگی۔ دو سو ریال تخمیناً لگیں گے۔ اور دونوں
ٹانکیوں کے آگے جو کیچڑ کے خوف سے گچ کرائی جاویگی اس میں بیس ریال
صرف ہوں گے۔ اور جو مخزن مدرسہ کے اسباب میں رکھا ہے اور
تینوں مجلسیں اور دونوں دیوان مدرسوں کے پڑھانے میں رکھے ہوئے
ہیں سو طالب علموں کے لئے جدا جدا حجروں کی بڑی حاجت ہے۔
مدرسہ کے قریب ایک جگہ ہے اسے مول لے کے اگر حجرے بنائے

جاویں تو اس زمین کی قیمت اور حجروں کے بنانے میں بارہ سو ریال سے
کم خرچ نہ پڑیگا - پھر بنانے سے تو فراغت ہو جائے گی - اور اس کی ایسی
جائیداد کا فکر رہیگا - جس کی آمدنی سے مدرسہ کا کام چلتا رہے - اور اسکی
بھی یہاں ہم سے لوگوں کے حق میں اس کے سوا اور کوئی تجویز اچھی
بن نہیں پڑتی کہ اس شہر میں مکانات اور دکانیں مول لے کے اس پر
وقف ہوں - کہ ان کی آمدنی سے مدرسہ کا کام چلتا رہے - پر یہ امر تو
بالفعل میری حیثیت کے لحاظ سے ایک مستبعد معلوم ہوتا ہے اور اللہ کے
نزدیک آسان ہے - کیا عجب ہے کہ کسی آپ جیسے نیک نیت کے
دل میں اللہ ڈالدیگا - اور وہ اس امر میں للہ کمر باندھ کے کھڑا ہو جائیگا
اور اس کی سعی سے بیاستعداد سے پلٹ جاوے گا - خدا کرے کہ یہ آپکا
حصّہ ہو، اور آپ کی سعی سے یہ امر انجام کو پہنچے - یہ حال تو متعلق بہ بنا تھا
اب اس کی تعلیم کا حال سنئے اور اسمیں میرے سوا اور چار مدرس ہیں -
دو قاری، دو معلم قرآن مجید کے، اور دو مدرس علوم عقلیہ اور نقلیہ کے
اور ایک محرر ان مدرسوں اور محرر کے سوا چھتر طالب علم ہیں - اور میں
صبح سے دوپہر تک اسی مدرسہ میں پڑھاتا ہوں اور ظہر سے عصر تک
حرم شریف میں اور قلت آمدنی کے سبب اس مدرسہ کی ترقی نہیں ہوئی
اس لئے کہ چالیس روپے سے کچھ تو چندہ کے طور پر ماہواری جمع ہوتا ہے
اور چالیس روپے ماہوار بی بی صولت النساء اور شاہ نوازش حسین صاحب
جن کا ذکر اوپر گذرا دیتے ہیں اور اس کے سوا حج کے دنوں میں اللہ کے اور
بندے بھی کچھ دیجاتے ہیں - اور گذران ہوئی چلی جاتی ہے - پر تنگی اور
دقت کیسا نہ - ان چار مدرسوں اور ایک محرر کی تنخواہ اور ستر طالب علموں

کی خوراک جو اس مدرسہ سے مقرر ہے اسمیں سے دیجاتی ہے اور اب
معلوم ہوا کہ جناب نواب محمود علی خانصاحب والئے چھتاری نے اس سال
کے شعبان کے مہینے سے سو روپیہ ہر ماہ اس مدرسہ کیلئے مقرر کردئے
ہیں نواب صاحب نیک نیت ہیں اور انکی توجہ ایسے امور کی طرف
ہے وہ جاری رکھیں گے اگر یہ جاری رہا تو البتہ اس مدرسہ کے لئے
ایک بڑی مدد ہے۔ منشی ظفر اللہ صاحب کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ چھ
ماہی ان کی سرکار سے منشی ممتاز علی خانصاحب کو مل گئی ہے اگر ایسا
ہے تو خانصاحب کی معرفت میرے پاس آپہنچ جائیگی۔

ہمارے اوضاع اور اطوار اہل بلدہ کے اوضاع اور اطوار کے مخالف
ہیں اور ہمارا طریقہ تعلیم تعلّم کا ان کے طریقہ تعلیم تعلم سے نہیں ملتا۔
اور ان پچھتر طالب علموں میں سب ایسے ہیں کہ ابتداء سے انکی تعلیم
اسی مدرسہ میں ہوئی ہے اور بفضل اللہ قرآن پڑھنے والے بچے تو
ایسی تجوید سے قرآن پڑھتے ہیں کہ سب عرب اور مصری اور ترک
تعریف کرتے ہیں۔ حضرت شیخ العلماء جو دو بار امتحان میں تشریف
لائے بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ واللہ ہمارے بچے ایسا نہیں پڑھتے
تعجب ہے کہ یہ ہندی بچے اتنی مدت قلیل میں ان سے سبقت لے گئے
انشاء اللہ رمضان آئندہ میں چودہ لڑکے حافظ مسجد حرام میں قرآن
سناوینگے اور علوم پڑھنے والوں پر بھی میری اور دونوں مدرسوں کی
اتنی محنت ہے کہ ان کی استعداد شکر کے قابل ہے اور اس دو برس
کی مدت میں جن طالب علموں نے اس مدرسہ میں آکے میزان شروع
کی تھی سو انہوں نے اس مدت میں میزان منشعب صرف میر، پنج گنج،

دستور المبتدی، زرادی، مراح الارواح، فصول اکبری، شافیہ صرف میں، اور خلاصہ حل، تتمہ نحو میر، شرح مائتہ عامل عربی، اور شرح مائتہ عامل فارسی، عبدالرسول، ہدایت النحو، قطر اللہ اور کافیہ نحو میں۔ اور قدوری تمام۔ اور نصف کنز فقہ میں۔ اور سراجی فرائض میں پڑھ لی ہے اور اب نصف آخر کنز فقہ میں، اور شرح ایساغوجی، منطق میں پڑھتے ہیں اور اوپر کی جماعت جوان طالب علموں کے سوا ہیں وہ دو جماعتیں ہیں جو میرے پاس مطول اور قطبی اور میر قطبی پڑھتے ہیں۔ اور ان دنوں مدرسہ کا سب خرچ ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہے۔ مگر گذارش یہ ہے کہ جو اوّل میں میں نے لکھا ہے وہ اپنی حیثیت کے لحاظ سے لکھا ہے اب آپ کی حیثیت کے لحاظ سے لکھتا ہوں اور اس کو میں نے اوّل میں اسلئے نہیں لکھا کہ شاید آپ مصلحتاً اوّل درجہ میں چھپوا دیں اور یہ مضمون اسی درجہ میں ہو تو ناظر میری حیثیت کے لحاظ سے اس مضمون کو شیخ چلی کا خیال سمجھیگا۔ گو آپ کی حیثیت کے لحاظ سے وہ اپنی جگہ پر ہے اور وہ یہ ہے کہ میری آرزو دلی یہی ہے کہ یہ ہندی مدرسہ حرم کے قریب ہو۔ حرم کے قریب میں اگر کہیں جگہ ہاتھ آتی تو اب تک جتنا اس مدرسہ پر خرچ ہوا ہے اتنا سب اس زمین پر ہی خرچ ہوتا۔ اور وہ زمین تب بھی پیمائش میں اس مدرسہ کی زمین سے کم ہوتی۔ اس لئے حرم سے دور محلہ خندریسہ میں زمین کو مول لیا.... امید ہے کہ اگر آپنے کوشش کی تو مدرسہ اسلامی جو مکہ معظمہ میں ہوگا اعلیٰ درجہ کو پہنچیگا اور ہر سال اس بلدہ معظمہ میں جو مجمع مردم ہفت اقلیم کا ہے لاکھوں کی نظر میں ہندیوں کی عزت او

آپکی سعی مشکور رہیگی۔ اس لئے گذارش کرتا ہوں کہ آپ اس امر کیلئے
کمر باندھیں کہ اس مدرسہ کی بنا کا کام اہتمام کر کے ایک اور زمین سیع
حرم کے قریب لیجاوے اور اس میں ایک بڑا مدرسہ بنایا جاوے اور
وہ زمین ایسی جگہ پر ہووے کہ اگر چاروں طرف اس کے دکانیں نہ
نکل سکیں تو دو تین طرف تو نکل سکیں۔ اور انشاءاللہ اگر تجویز ہوگئی تو
بنظر ثواب اخروی اس کے بنوانے کی کوشش کرونگا کہ تھوڑے دنوں
میں مدرسہ نیک نام ہو جاویگا۔ اور اس مدرسہ موجودہ کو فقط قرآن مجید
کی تعلیم کے لئے رکھا جاویگا۔ اور یہ مدرسہ موجودہ اُس دوسرے بڑے
مدرسہ کی شاخ ہو جاویگا۔ اور انشاءاللہ اس کے فیض میں فرق نہ آویگا۔

اگر خدا آپ کی سعی میں زیادہ برکت بخشے تو اس پر صلاح یہ ہے
کہ حرم کے پاس سلطان جنت مکان عبدالمجید خاں غازی انار اللہ برہانہ
نے ایک مدرسہ کی بنا ڈالی تھی سو اس سلطان جنت مکان کی وفات کی
سبب سے وہ بنا بیچ میں رہگئی اور حضرت سلطان کو بسبب بعض امور
ملکی کے اس کی طرف التفات نہیں ہوئی وہ ویسے ہی پڑی ہے۔
اگر کوئی اس کی بنا اور آبادی کا خیال کرے تو اور صرف زر کثیر سے
امید ہے کہ حضرت سلطان خلداللہ ملکہ کی طرف سے وہ اسے مل جاویگی۔
پر یہ امر صرف کثیر کا محتاج ہے۔ بہر حال گذارش یہ ہے کہ جو آپ کی
صلاح میں آوے ویسا کیجئے۔ جو ہماری سمجھ میں آیا اسے گذارش کردیا۔

۱۶ ذلحجہ ۱۲۹۲ھ ہمدست مولوی اللہ یار خاں

مکہ معظمہ۔ مدرسہ واقعہ محلہ خندریسہ۔ المکلف رحمت اللہ عفی عنہ۔"

مولانا رحمت اللہ صاحب مدرسہ کے ضروری امور اور اہم چیزوں کی تکمیل کرنے

کیپئے اسی قسم کے دوسرے اہل خیر حضرات سے کوشش فرمارہے تھے۔ جس میں وہ کامیاب ہوتے جارہے تھے۔ چنانچہ مدرسہ کے دارالاقامہ (بورڈنگ) کی تعمیر کی ابتداء ۱۸۹۳ء میں صوبہ بہار کے ایک مخیر عالی ہمت رئیس میر واجد حسین پٹنہ نے کرائی۔ اس دارالاقامہ میں پچاس طلباء کے رہنے کی گنجائش ہے جس کا کوئی معاوضہ طلباء سے نہیں لیا جاتا۔

قسطنطنیہ کا دوسرا سفر عثمان نوری پاشاہ دولت عثمانیہ کی طرف سے ۱۲۹۹ھ میں حجاز کے گورنر مقرر ہوئے چونکہ یہ فوجی آدمی تھے دوراندیش زیادہ نہیں تھے۔ اس لئے بعض مفسدین اور فتنہ انگیز لوگوں نے ان کو مدرسہ صولتیہ سے بدظن کردیا تھا۔ اور وہ اس مدرسہ کے قیام کو غیر ملکی تحریک سمجھ کر مخالفت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس مخالفت کی خبر قسطنطنیہ تک پہنچی اور طرفین کے اختلافات کے واقعات سلطان عبدالحمید خاں کے دربار تک پہنچائے گئے۔ جو مولانا صاحب کے دوسرے سفر قسطنطنیہ کے باعث بنے جس کی بناء پر نوری پاشاہ کی منشار کے خلاف مولانا صاحب کی سلطان کی طرف سے طلبی کا حکم ملا۔ اس سفر کے ابتدائی حالات حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے یہ تحریر کئے تھے۔

"۲۰ ربیع الاوّل ۱۳۰۱ھ ہفتہ کے دن مغرب کے وقت مکہ معظمہ سے جدہ کو روانہ ہوئے آٹھویں کے آگبوٹ میں چلنے کی تجویز موقوف رہی پھر بابو جہاز مصری میں ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ بروز بدھ کو سوار ہوئے اور اس نے جمعرات کے روز صبح کبوقت لنگر اٹھایا۔ پیر کی رات کو ۵ بجے سویز پہنچے اور صبح کو جو پیر کا دن اور ۲۰ ربیع الثانی کی تھی بابو جہاز سے اترے۔ اور محمد علی ویدی صاحب کے مکان پر اترے۔ وہاں سے منگل کے دن ۲۱ تاریخ اسکندریہ کو ریل پر گئے۔ تین بجے اسکندریہ پہنچے۔ سعد اللہ بے کے مکان پر اترے ۲۹ تاریخ ربیع الثانی جمعرات

جمعرات کے دن تک وہاں رہے۔ پھر آٹھویں دن جو بدھ کا دن اور ۳۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۱۰ھ کی تھی بابو مصری پر سوار ہو کے روانہ استنبول ہوئے ازمیر سے جو ہفتہ کا دن اور تاریخ ۳ جمادی الاول کی تھی تار برقی جناب نسیم بے اور جناب شریف عبداللہ اور جناب خیرالدین پاشا کے نام عصر کے وقت روانہ کئے اور جمادی الاول کی پانچویں پیر کے دن استنبول میں پہنچے ادھر جہاز نے لنگر ڈالا۔ اسوقت فی الفور مصطفیٰ، وہبی بے یاور (اے، ڈی، سی) اور ہیں باشی حضرت سلطان کے جہاز پر چڑھے اور ملے کے کہا کہ حضرت سلطان نے بہت بہت سلام فرمایا ہے اور کشتی خاص اپنی بھیجی ہے چلئے وہاں سے چلکر سرائے (محل) قصر شاہی سلطانی تک جو بنائے سلطانی مرحوم عبدالمجید خاں غازی کے ہے آئے وہاں کشتی سے اتر کر دو گھوڑوں کی بگی میں سوار ہو کے محل سرائے سلطانی میں آئے اور محل سرائے کے ایک کمرہ میں اترے اس روز ملاقات کو جناب کمال پاشا اور جناب عثمان بے اور جناب علی بے اور جناب نسیم بے تینوں فرنار (مشیروں) حضرت سلطانی کے ہیں اور جناب سید احمد اسعد مدنی جو مصاحب حضرت سلطان ہیں دن کو اور رات کو نصرت پاشا آئے۔ اور اگلے دن منگل کو جناب عثمان پاشا غازی آئے اور بدھ کو ساتویں تاریخ جناب شیخ حمزہ ظافر اور جناب سید احمد اسعد مدنی اور جناب کمال پاشا آئے اور رات کو جناب علی بے فرنا درجہ دوم نے حضرت سلطان کی طرف سے مزاج پرسی کر کے کلمات عواطف شاہانہ پہنچائے۔ آٹھویں تاریخ جمعرات کے روز شیخ محمد ظافر صاحب تشریف لائے اور جمعہ کو جناب حسنی پاشا داماد سلطان عبدالمجید مرحوم اور جناب صفوی پاشا اور جناب اسماعیل حقی اور جناب سید فضل پاشا آئے اور اُسی دن مغرب کے وقت خلعت سلطانی میرے اور بدرالاسلام (حضرت کے بھتیجے) اور مولوی حضرت نور (صدر مدرس مدرسہ صولتیہ کے لئے آئے اور ہفتہ کے دن دسویں تاریخ کو جناب درویش

پاشا اور جناب شریف عبداللہ پاشا اور جناب سید احمد اسعد اور جناب اسحاق آفندی اور جناب ناظر اوقاف (وزیر اوقاف) تشریف لائے اور عصر کیوقت نشان (تمغہ) مجیدی درجہ چہارم کا حضرت سلطان کی طرف سے آیا اور بارہویں تاریخ اتوار کے دن رضا پاشا باش کاتب (چیف سکرٹری سلطان) مغرب کے بعد آئے اور بارہویں تاریخ پیر کے دن مغرب کے بعد بحکم سلطانی جناب شیخ الاسلام احمد اسعد عریانی زادہ کی ملاقات کو جانا ہوا۔ بہت تعظیم سے پیش آئے اور فرمایا کہ حضرت سلطان نے فرمان بھیجا ہے کہ اچھی تعظیم کیجو کہ ابتک ایسا مہمان عزیز میرے پاس نہیں آیا ہے سو اس کے موافق مجھے ضروری ہے کہ تعظیم کروں اور ۱۳ تاریخ منگل کے دن سند "روؤس" محکمہ شیخ الاسلام سے حاصل ہوئی۔ ۱۱ تاریخ جمعرات کے دن مکان علیحدہ میں آئے۔ عصر کیوقت ۱۷ تاریخ ہفتہ کے دن وہبی بے نے حضرت سلطان کی طرف سے حکم پہنچایا کہ "مرضی حضرت سلطانی یہ ہے کہ تم اپنے اہل وعیال کو بلوالو۔ موسم ربیع قریب آپہنچا اب عرصہ تک آب ہوائے اسنبول بہت اچھی رہے گی"۔ نرمی سے اس امر میں عذر کیا گیا پیر کے دن دوسری تاریخ رجب کے ۱۳۰۱ھ حضرت سلطان کے جیب خاص سے پانچ ہزار قرش صاغ ماہوار مقرر ہوئے (تقریباً دو ہزار پانچ سو روپیہ ماہانہ) اور دس ہزار قرش صاغ (تقریباً پانچ ہزار روپیہ) عطا فرمائے۔ منگل کے دن کیسۂ مفتاح کعبہ اور ایک تسبیح عقیق البحر کی اور ایک تسبیح سنگ مقصود کی بھجوائی گئی۔ اور فرمایا کہ اس کے شکریہ میں میں نے تم کو رتبہ پایہ حرمین شریفین کا عطا کیا اس کا لباس کبھی پہنچیگا۔ اور چھٹی تاریخ رجب جمعرات کے دن کو عصر کے بعد سرائے سلطانی (محل) کو جانا ہوا۔ مغرب کے بعد ملاقات ہوئی۔ غایت عنایتِ شاہانہ سے پیش آئے مسند سے اٹھ کے ایک دو قدم بڑھ کر ہاتھ میرا قوت سے اپنے ہاتھ میں پکڑ کے فرمایا کہ "کثرت شغل کے سبب ابتک میں نے ملاقات نہیں کی تھی اور تاخیر کا سبب اس کے سوا دوسرا نہیں"۔ پھر ہم بیٹھ گئے جب

ہیں اٹھا اور سامنے آیا (ترکی آداب شاہی کے مطابق) پھر دوبارہ کمال خوشی سے اٹھ کے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کے کہا کہ تمہارا حال سننے کا میں مشتاق تھا اسی لئے میں نے تم کو بلایا ہے اور فرصت میں ہیں اور ملاقات اچھی طرح کروں گا۔ اور کچھ دیر تک باتیں کروں گا۔" دو نو بار میں نے بھی دعا اور کلمات شکریہ اور مناسبہ کہے۔ ۱۱ رجب سن ۱۳۰۱ھ کو مولوی حضرت نور روانہ مکہ معظمہ ہوئے اور ۱۲ رجب روز پنجشنبہ کو فرمان سلطانی "پایۂ حرمین شریفین کے عطا کی بابت حضرت سلطان نے بھجوایا۔ اور ۱۴ رجب دوشنبہ کو شیخ الاسلام کی ملاقات کو گیا۔ مثل اوّل کے تعظیم و محبت سے پیش آئے۔"

قسطنطنیہ کے قیام کے دوران حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو سلطان عبدالحمید خاں نے متعدد بار شرف باریابی بخشا اور مختلف مسائل و واقعات پر گفتگو کی سلطان نے مدرسہ صولتیہ کو امداد دینے کا خیال ظاہر فرمایا۔ لیکن آپنے اسکو قبول نہیں کیا۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کے پاس سلطان سے الوداع ہونے کے وقت دوسرے دن مصطفیٰ وہبی بے یاور، اور خیرالدین پاشا اور نسیم بے اور سید احمد اسعد مدنی یہ چاروں اشخاص تشریف لائے۔ اور سلطان کی جانب سے ایک مرصع تلوار مولانا صاحب کو بطور ہدیہ دی اور سلطان عبدالحمید خاں نے آپ کے بارے میں جو الفاظ کہے تھے وہ دہرائے

"ہتھیار ہر مجاہد فی سبیل اللہ کی زینت ہے۔"

جب مولانا صاحب قسطنطنیہ سے مکہ معظمہ پہنچے تو وہی عثمان پاشا جو مخالفت میں پیش پیش تھے سب سے پہلے مولانا صاحب سے بغلگیر ہوئے اور اپنی غلطی پر نادم ہوئے اور معافی مانگی۔

مدرسہ صولتیہ کے طلباء کے وظائف اور اساتذہ کی تنخواہ کے قائم ہونے

کے دس سال بعد سن ۱۳۰۱ھ میں مدرسہ کے اساتذہ اور ملازمین کی تنخواہ کیا تھی اور طلبہ کے

وظیفے کیا مقرر تھے۔ اس کے بارے میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے ایک خادم عبداللہ بن حسین نے ایک رپورٹ اس وقت مرتب تیار کی جب مولانا صاحب استنبول تشریف لے گئے تھے۔ رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں، جو مولانا صاحب کی خدمت میں ہر ماہ بھیجی جاتی تھی۔

"خرچ مدرسہ کا بعد جانے حضور کے ماہانہ ۱۶۰ سے زیادہ نہیں ہوا۔ بعض میں کم ہوا ہے چنانچہ ماہِ رجب میں مالعہ ۱۲۹ کا خرچ ہوا بسبب تخفیف ہونے تنخواہ قاری محمد ۳ قرش اور عبدالرحمٰن ہندی جنیبہ آخر ماہ جمادی الثانی میں مدینہ منورہ کو چلے گئے اب اسی ماہ میں آگئے ہیں۔ تو ان کو تنخواہ ماہ رجب کی نہ دی گئی۔ پر اس ماہِ رجب میں عبدالرحمٰن برادر قاری عبداللہ کو یک ریال دیا گیا۔ تفصیل تنخواہ ماہ رجب ۱۲۹۱ھ

مولوی نور احمد	مولوی غازی	عبداللہ	مولوی صادق
لہ ۱۱ر	لہ ۱۱ر	۱۳ر	۳ر
مولوی شجاعت علی	قاری عبداللہ	قاری احمد عثمانی	قاری احمد مغربی
۳ر	۱۲ر	لہ ۱۱ر	عہ ر
عبدالرحمٰن خلیفہ	قاری عرفسوس		
۴ر قرش	۶ر قرش		

طلبہ عربی خوان

امام الدین	ابراہیم	عبداللہ قزانی	بشارت علی	اسعد علی
ے ر	ے ر	ے ر	ے ر	ے ر
عصمت علی	اسعد دہان	عبدالرحمٰن دہان۔		
ے ر	۴ر قرش	۴ر قرش		

طلبار قرآن شریف

ملا مرید	اللہ بخش	عبدالرحمٰن بنگالی	محمد رضا	احمد قزانی
؏ ر	عا ر	عا ر	عا ر	عا ر

شعبان	عبدو سندی	کل
؏ قرش	عہ ر	؏ ٦٠ ر

متفرقات

سقہ فتح محمد	موذن مسجد	نواب عبدالرحیم	لنبہ برائے مسجد
۵ قرش ر	عہ ر	للعہ قرش	٦ ر قرش

پردہ دیوان قاری عبداللہ	بابت حاضری نصف ماہ	خانہ مولوی نور صاحب
۷ قرش	٦ ر قرش	؏ ر

حلاق	زیت	کل
۵ قرش	٣٠ ر قرش	؏ ١٢ ر

قاری عرفسوس کو ٢ ر ریال جو ملتے ہیں ایک بابت محمد رضا اور دوسرا بابت قاری محمد ابراہیم کا ہے عبدالرحمٰن ہندی جدید مدینہ منورہ چلے گئے اور کسی نے قبول نہ کیا۔ اسی سبب سے حاضری ١۵۔ روز کی لکھی نہیں گئی۔ بعد اس کے قربان علی نے قبول کیا۔ اسی سبب سے نصف ماہ کی تنخواہ دی گئی۔ حلاق کا کبھی اتنا ہوتا ہے اور کبھی کم اور کبھی زیادہ۔ پر عہ ر روپے سے زائد نہیں ہوا۔ دھوپ دیواروں میں قاری عبداللہ کے داخل ہوتی تھی، اور لڑکوں کو تکلیف ہوتی تھی اس واسطے ایک پردہ لگایا گیا۔ مسجد میں پانچوں وقت اذان اور نماز ہوتی ہے۔ بعض ایام میں رات کو زیادہ آدمی ہوتے ہیں۔ قندیل جناب حاجی صاحب (حاجی امداداللہ) نے دی۔ اور لنبہ مدرسہ سے خریدا۔

تیل جو طالب علم رباط میں نہیں رہتے۔ ان کو مدرسہ سے دیا جاتا ہے۔ سید واجد حسین صاحب رباط والوں کو تیل دیتے ہیں۔ پر نصف اطل تیل جو ملتا ہے بہت کم ہے۔ اگر حضور مناسب سمجھیں تو زیادہ دیں۔ صفیں مدرسہ کی بہت خراب ہیں۔ اگر حضور مناسب سمجھیں تو دروازہ مسجد کا بہت عمدہ، خوبصورت اور مضبوط بنایا جاوے تحریر فرمائیں"۔

مسجد مدرسہ صولتیہ کی تعمیر ۱۳۰۱ھ میں عثمان نوری پاشا گورنر کی عہد میں، صحن حرم میں بیر زمزم کے سامنے باب النبی کے محاذ میں ایک خوبصورت عمارت میں سلطانی کتب خانہ تھا۔ جو ایام حج میں حجاج کی تکلیف اور اقامت نماز میں پریشانی کا باعث بنتا تھا۔ عثمان نوری پاشا نے وزارت اوقاف استنبول کی توجہ ان پریشانیوں کی طرف دلائی اور بتایا کہ اگر کتب خانہ سلطانی کی عمارت یہاں سے ہٹادی جائیگی تو زائرین کعبہ کی سہولت کا باعث ہوگی۔ وزارت اوقاف نے یہ مسئلہ سلطان عبدالحمید خانصاحب کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے اسکو منظور کرلیا۔ کتابیں کثیر تعداد میں ایک دوسری ملحقہ عمارت میں منتقل کردی گئیں اور کتب خانہ کی عمارت کو منہدم کردیا گیا۔

کتب خانہ کے ملبے کے متعلق جب حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے سنا کہ یہ ملبہ بیع ہوگا تو بیچین ہو گئے کہ جو ملبہ کئی سو سال تک جوار کعبہ اور صحن حرم میں رہا ہو۔ اسکو لوگ خرید کر اپنے سکونتی مکان میں لگائیں گے۔ مولانا فوراً عثمان نوری پاشا کے پاس پہنچے اور ملبہ کے متعلق انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نوری پاشا نے آپکی رائے سے اتفاق کیا۔ اور معلوم کیا کس مصرف میں لایا جائیگا۔ مولانا نے فرمایا اس ملبہ سے مدرسہ صولتیہ سے ملحق ایک مسجد بنوادی جائیگی جہاں مدرسہ کے طلبا ء نماز ادا کیا کرینگے اس تجویز کو نہ صرف نوری پاشا نے بلکہ افسران ترکی نے بھی پسند کیا۔ ملبہ کی قیمت کے تعین پر ردوکد ہوئی۔ جس پر گورنر نے کہا کہ میں وزارت اور اوقاف
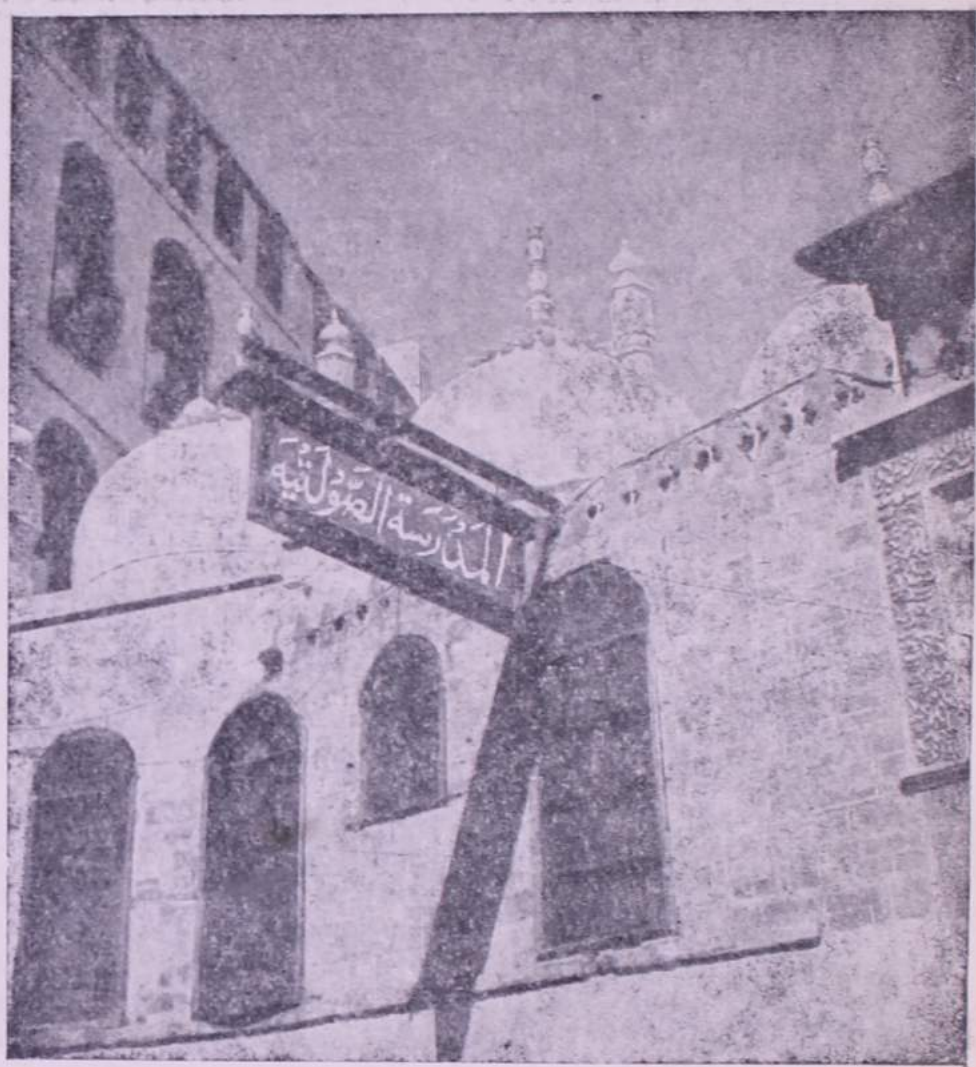
مسجد و مدرسہ صولتیہ کا بیرونی منظر

مدرسہ صولتیہ کی مسجد کا دروازہ

کو لکھتا ہوں مجھے امید ہے کہ وہ آپ کو اس کار خیر کے لئے یہ ملبہ مفت دیدے گی۔

مولانا رحمت اللہ صاحب جانتے تھے کہ وزارت کے محکمہ میں جو معاملات جاتے ہیں ان کے طے ہونے میں بہت دیر لگتی ہے۔ اس عرصہ میں یہ ملبہ صحن حرم سے نکل کر باب ابراہیم کے سامنے شارع عام پر ڈالا جائیگا اور اس کی بڑی بے حرمتی ہوگی۔ اس لئے مولانا صاحب نے فرمایا کہ میں اس ملبہ کا ڈیڑھ ہزار ریال دیتا ہوں۔ گورنر نے بخوشی منظور کر لیا۔ مولانا صاحب مدرسہ میں واپس آئے۔ مدرسہ کے خازن سے پوچھا کہ مدرسہ کے خزانہ میں کتنی رقم ہے اس نے بتایا پندرہ سوسے زیادہ ریال نہیں ہیں۔ آپنے فوراً وہ رقم گورنر کو روانہ کر دی اور کتب خانہ کا تمام ملبہ مدرسہ میں لاکر ڈالا جانے لگا۔

مدرسہ کے اساتذہ اور طلباء میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ مہینہ ختم ہونیوالا ہے۔ مدرسین کو تنخواہیں کہاں سے ادا کیجائیں گی اور جو ضروری کام ہیں، وہ بغیر پیسے کے کیسے پایۂ تکمیل کو پہنچیں گے طلبہ کے وظیفے کیسے دئے جائیں گے۔ مخالفین نے سنا تو بہت خوش ہوئے کہ اب مدرسہ میں خلفشار پیدا ہوگا۔ تیسرا دن گذرنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ ایک میمن تاجر اسی زمانہ میں مکہ معظمہ میں آیا ہوا تھا۔ اس نے جب یہ سنا کہ مولانا صاحب مسجد تعمیر کرنے کے لئے حرم شریف کا ملبہ اٹھوا کر لے گئے ہیں تو وہ آپ کی خدمت میں آیا۔ اور دس ہزار ریال ان الفاظوں کے ساتھ پیش کئے "آپ نے بڑا کام کیا۔ خدا قبول فرمائے"

مولانا رحمت اللہ صاحب کے رگ وریشے میں ہندوستانیت سمائی ہوئی تھی اسلامی ممالک مثلاً حجاز، بیت المقدس، فلسطین بغداد، اور کربلا وغیرہ میں مسجد ایا صوفیہ کی تقلید میں ایک گنبد بنایا جاتا ہے۔ اور ہندوستانی مساجد میں کثرت کیساتھ تین گنبد بنوائے جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فیصلہ کیا کہ اس مسجد میں بھی

تین گنبد بنوائے جائیں گے۔ مگر گنبد کا بنانا آسان کام نہیں تھا۔ اور خاص طور پر ہندوستان کی وضع قطع کے گنبد ہندوستانی معماروں کے علاوہ کوئی اور معمار نہیں بنا سکتا تھا۔

چنانچہ مسجد کی تعمیر کا کام جاری تھا۔ کہ اسی سال حج میں پانی پت کے دو معمار حج کرنے کے لیئے آئے۔ اتفاقیہ طور سے مولانا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مسجد کی تعمیر کے کام کو انہوں نے دیکھا۔ جب مولانا صاحب نے تین گنبدوں کے بنانے کے خیال کا اظہار کیا۔ وہ فوراً تیار ہو گئے۔ چنانچہ خود مولانا صاحب مدرسہ کے اساتذہ، مدرسہ کے طلبہ اور مہاجرین حرم اینٹ پتھر، گارہ ذوق شوق اور ولولہ کیساتھ اٹھا کران معماروں کو دینے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس متبرک ملبہ سے مدرسہ صولتیہ کی مسجد ۱۳۰۴ھ میں تیار ہو گئی۔

اسی زمانہ میں ہرات کے ایک بزرگ مکہ معظمہ میں حج کیلئے تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب سے انکی ملاقات ہوئی۔ مدرسہ کی مسجد کا ذکر سنکر مسجد میں آئے نماز پڑھی اور نماز پڑھنے کے بعد ایک طالب علم سے قلم دوات اور کاغذ کا ایک پرزہ لیکر قلم برداشتہ فی البدیہہ مسجد کی تاریخ کا قطعہ لکھا جو آج بھی بطور یادگار مسجد کی محراب پر نمایاں اور جلی حروف میں کندہ ہے ؎

بسکہ خوش منظر است ایں مسجد ۔۔۔ ما رائی العین مثلہ الثانی

گشت تاریخ، خانۂ رحمت ۔۔۔ رحمۃ اللہ قل علی البانی

۱۳۰۴ھ

قسطنطنیہ کا تیسرا سفر

قسطنطنیہ کے دوسرے سفر کی واپسی کے بعد مولانا صاحب کا اپنی دوسری مصروفیات کیساتھ خیرالدین پاشاہ، علی بے، اور شیخ الاسلام وغیرہ اور مقربین سلطان سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور بعض کاموں کے لیئے اکثر براہ راست سلطان المعظم سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ اور ضعیف العمری میں موتیا بند کی وجہ سے لکھنے پڑھنے

سے آپ مجبور ہو گئے تھے۔ آنکھوں کی اس خرابی کی اطلاع جب سلطان عبد الحمید خانصاحب کو پہنچی تو انہوں نے مولانا صاحب کو فوراً قسطنطنیہ طلب کیا۔ ایسی حالت میں اتنا طویل سفر ان کے لئے انتہائی پریشان کن تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ آنکھوں کا صحیح علاج ہو جائیگا۔ آپ اس سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ آپ کے ہمراہ مولوی عبد اللہ عرف عبد اللہ جی آپ کے شاگرد و خادم تھے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس سفر کے ابتدائی حالات قلمبند کئے تھے جو حسب ذیل ہیں۔

"پورٹ سعید میں روز شنبہ ۲۷ شعبان ۱۳۰۴ھ استنبول کو دو تار روانہ کئے ایک بنام میاں بدر الاسلام صاحب کے اور ایک بنام علی بے کے۔ اور اس تار میں ایک جنی عثمانی الا دو فرنک خرچ ہوئے۔ اور اسی روز شنبہ بعد عصر آگبوٹ پورٹ سعید سے روانہ ہوا۔ اور چہار شنبہ کی رات کو چاند رمضان شریف کا نظر آیا اور روز چہار شنبہ پہلی رمضان المبارک بحساب ہماری رویت کے صبح کیوقت تین بجے چناق قلعہ میں پہنچے۔ اور وہاں کمندار (فوجی افسر اعلیٰ) تمام قلعوں چناق قلعہ کا آگبوٹ پر آیا اور مولوی صاحب سے ملا اور کہا سرائے (محل شاہی) سے حکم آیا کہ مولوی رحمت اللہ صاحب چناق قلعہ میں پہنچے یا نہیں۔ اس سے اطلاع دو تو میں اس بات کے واسطے آپکی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بعد ایک ساعت کے پھر آگبوٹ چلا اور پنجشنبہ ۲ رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ استنبول میں پہنچے اور سرائے یلدیز (قصر یلدز) میں "چاندر کشک" میں اترے اور بعد ایک ساعت کے جناب سید احمد اسعد مدنی تشریف لائے۔ اور کہا کہ حضرت سلطان آپ کو بلاتے ہیں" تھوڑی دیر کے بعد

پھر ایک آغا (خواجہ) آیا تو جناب مولوی صاحب حضرت سلطان کے پاس
تشریف لے گئے۔ حضرت سلطان بڑی تعظیم سے پیش آئے۔ اور بعد
دو ساعت کے پھر جناب مولوی صاحب رخصت لے کے مکان (چادر
کشک) میں تشریف لائے اور کہا کہ حضرت سلطان بلاتے ہیں۔ تو مولوی
صاحب تشریف لے گئے اور وہیں افطار کیا۔ اور تراویح بھی وہیں پڑھی
حضرت سلطان نے اس وقت فرمایا کہ آنکھوں کے علاج کے واسطے
کل میں ڈاکٹروں کو جمع کروں گا۔ پھر وہاں سے مولوی صاحب مکان پر
تشریف لائے۔ اور روز جمعہ بعد عصر حضرت سلطان نے اپنے ایک
مصاحب کیساتھ پانچ ڈاکٹروں عمدہ کو بھیجا۔ انہوں نے آکے مولوی صاحب
کی آنکھوں کو خوب تحقیق سے دیکھا اور کہا انشاء اللہ تعالی آنکھیں اچھی
ہو جاویں گی۔ پر علاج دو مہینہ کے بعد کریں گے۔ کیونکہ ابتک پانی آنکھوں
میں کامل نہیں اترا۔ اور روز پنجشنبہ میں حاجی علی بے قرنائی ثانی بھی بعد
ظہر تشریف لائے اور انہوں نے مولوی صاحب سے ملاقات کر کے
مولوی بدر الاسلام سے کہا۔ کہ مولوی صاحب کے واسطے کپڑے بازار سے
لے آویں اور جا کے کپڑے بازار سے خرید کے اور لیتے آئے اور روز
جمعہ بعد نماز جمعہ جامع حمیدیہ میں پڑھی اور روز شنبہ ۵ رمضان المبارک
بعد ظہر جناب عبداللہ پاشا نجدی واسطے ملاقات جناب مولوی صاحب
کے آئے اور روز دوشنبہ ۷ رمضان شیخ محمد ظافر مع اپنے بڑے بیٹے
کے واسطے ملاقات کے تشریف لائے اور بعد اس کے اور چند بار حضرت
سلطان نے بلایا اور ۱۵ رمضان روز سہ شنبہ زیارت چادر شریف میں
جانے کیواسطے بگی عمدہ بھیجی اور سید احمد اسعد آفندی کو بسبب ضعف
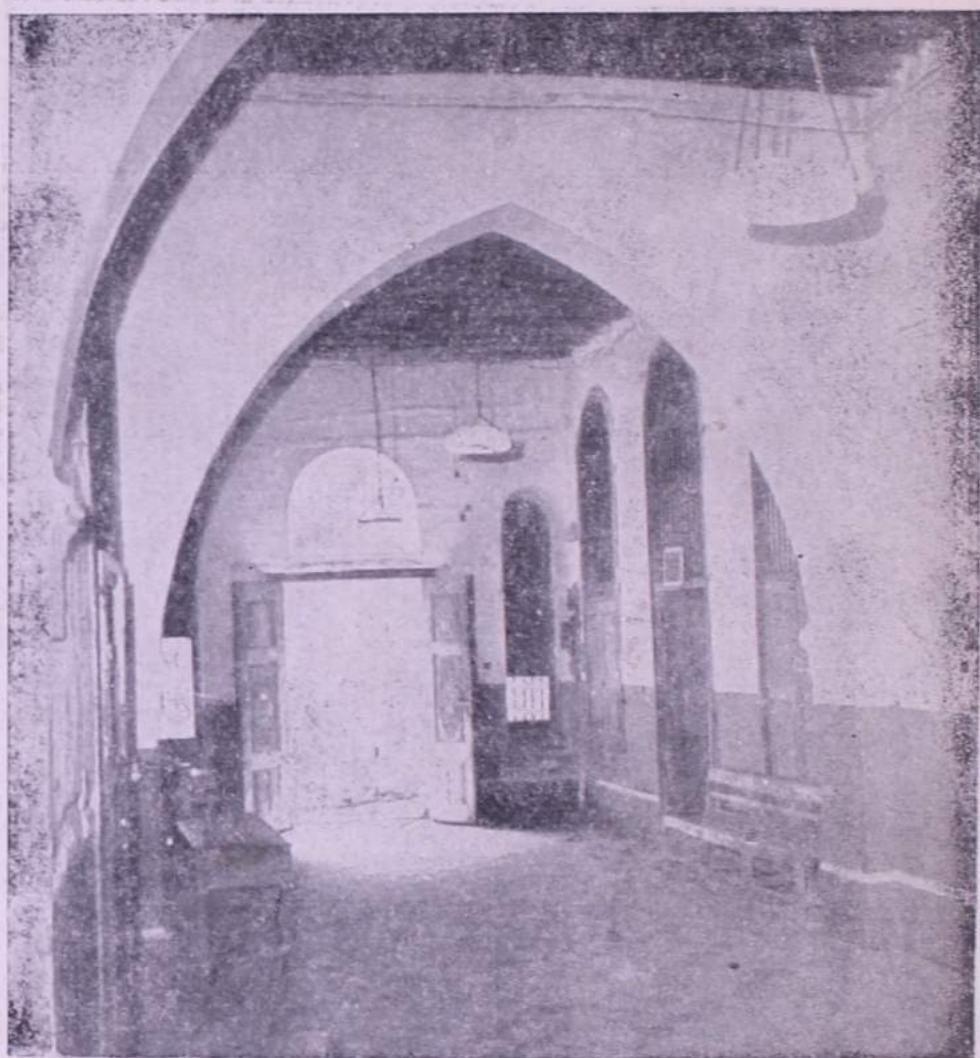
مدرسہ صولتیہ کی جدید عمارت کا منظر
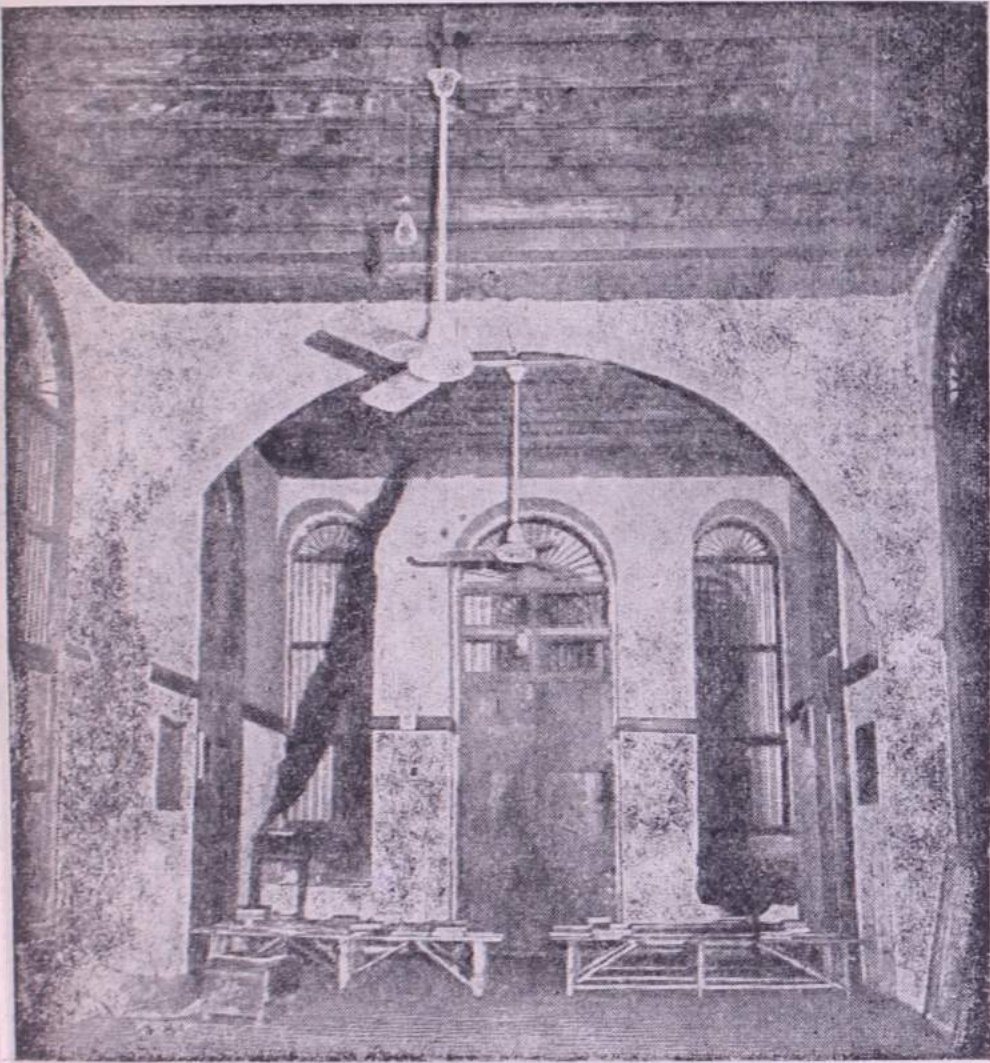
مدرسہ صولتیہ کی جدید عمارت کا منظر

بصر کے ساتھ کیا، اور وہاں جائے زیارت میں اسحاق آفندی اور اکثر قضاۃ عسکر ملے اور ۳۰ رمضان کو جناب سید احمد اسعد کو حضرت سلطان نے مولوی صاحب کی خیریت دریافت کرنیکو بھیجا اور پہلی شوال روز چہار شنبہ کو ہوئی اور نماز عید کی جامع حمیدیہ میں پڑھی۔"

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو، سلطان عبد الحمید خان اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا، لیکن مولانا صاحب نے موثر انداز میں یہ جواب دیا:-

"اعزا اور اقارب کو چھوڑ کر ترک وطن کر کے خدا کی پناہ میں اس کے دروازہ پر آکر پڑا ہوں۔ وہی لاج رکھنے والا ہے آخری وقت میں امیر المومنین کے دروازے پر مروں تو قیامت کے دن کیا منہ دکھاؤنگا۔"

مولانا رحمت اللہ صاحب قسطنطنیہ میں زیادہ دیر رہنا نہیں چاہتے تھے وہاں رہنا بہت شاق گذر رہا تھا۔ عمر کا آخری حصہ خدا کے گھر میں اور مدرسہ کی درس و تدریس میں گذارنا چاہتے تھے۔ اُس دور میں آپریشن کے نام سے لوگ لرز جاتے تھے۔ بہت ہیبتناک سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے مولانا صاحب ..... باوجود تقاضوں کے شاہی اطبا سے آپریشن کرانے کے لئے تیار نہیں ہوئے سلطان نے بھی جب یہ دیکھا کہ مولانا صاحب تیار نہیں ہیں تو خاموش ہو گئے۔ چنانچہ مولانا صاحب سلطان سے اجازت لے کر ذیقعدہ میں مکہ معظمہ میں تشریف لے آئے۔ اور وہاں آکر موتیا بند کا آپریشن ایک مقامی معالج سے کرایا۔ جو کامیاب نہ ہوا۔

مدرسہ صولتیہ کے سرپرست حاجی امداد اللہ صاحب

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے تقریباً ہر ایک اہم کام میں شریک رہے حتیٰ کہ بقول

بیتیہ شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواری حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور حاجی امداد اللہ صاحب نے جب ہندوستان سے ہجرت کی ہے تو یہ تینوں حضرات ساتھ تھے اور ایک ہی جہاز میں حجاز پہنچے چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں[۱]:

"حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے غدر کے زمانہ میں انگریزوں سے جہاد کیا تھا مولوی رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر رحمہا اللہ بھی حضرت کے ساتھ تھے۔ ایک بڑی جماعت ان لوگوں کے ساتھ تھی۔ مگر شکست ہوئی اور یہ تینوں حضرات راجپوتانہ کے راستے فرار ہو کر بمبئی پہنچے اور وہاں سے بادبانی جہاز پر سوار ہو کر حجاز گئے۔"

چنانچہ حجاز پہنچنے کے بعد مولانا رحمت اللہ صاحب اور حاجی امداد اللہ صاحب ایک جان اور دو قالب تھے۔ مدرسہ صولتیہ کو ترقی دینے کیلئے یقیناً مولانا رحمت اللہ صاحب کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اور وہ ہی اس کے بانی تھے۔ لیکن ان کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب کا دوسرا درجہ تھا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب ان سے مدرسہ کے ہر کام میں مشورہ لیتے تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، بھی مدرسہ کی کامیابی کیلئے کوشاں رہتے تھے۔ اور چاہتے تھے جو بھی ہندوستان سے آئے وہ اس مدرسہ میں داخل ہو۔ اور ہندوستان کے علمی طبقے سے بھی رجوع کرتے تھے کہ وہ بھی اس مدرسہ میں ہندوستان کے لوگوں کو تعلیم کے لئے روانہ کریں۔

چنانچہ حاجی امداد اللہ صاحب نے مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دارالعلوم دیوبند کو مولانا قاسم نانوتوی صاحب کے انتقال کے بعد جبکہ دارالعلوم دیوبند قائم ہو چکا تھا مولانا قاسم کے صاحبزادے مولوی احمد صاحب کے بارے میں ایک خط میں لکھا کہ ان کو مکہ معظمہ بھیجدو وہ مولانا رحمت اللہ صاحب کے مدرسہ میں تعلیم پائینگے۔

---

[۱] خاتم سلیمانی حصہ چہارم صفحہ

خط کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ۔

بخدمت بابرکت عزیزم مولوی رفیع الدین صاحب دام مجدہ معرفتہ باللہ تعالیٰ۔

بعد سلام مسنون و دعائے خیر کے معلوم فرمادیں۔ خط تمہارا مورخہ یکم رجب عین انتظار میں پہنچا اور سب حال وہاں کا معلوم ہوا۔ حال واقعہ جانکاہ کا خطوط بمبئی اور بھوپال اور میرٹھ وغیرہ سے معلوم ہوا تھا۔ اس صدمہ نے فقیر کو ضعیفی میں بہت کرادیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رضا بقضا بندہ ہیں اسکے جو چاہے کرے۔ ہم سب کو چاہیئے جان ودل سے اس کی رضا پر رہیں ہمارے نفع نقصان کو وہ خوب جانتا ہے اس پر سونپ کر اپنے کام میں مصروف رہیں۔ جس سے رضا مندی اللہ رسول حاصل ہو۔ عزیز من جو تم میں بڑے سرپرست مدرسہ کے تھے وہ جنت الفردوس کو سدھارے اگرچہ میں چاہتا ہوں کہ تم سب صاحب بدل مدرسہ کی بہبودی میں مصروف ہوں گے۔ فقیر بھی تم کو لکھ کے داخل ثواب ہوتا ہے عزیز من! خصوصاً تم لوکہ مدرسہ کے مہتمم ہو چند امور کا لحاظ چاہیئے اوّل تو مدرسہ کے کام میں کسی کی رو رعایت نکر چاہیئے بہ امانت و دیانت رہنا چاہیئے اگر کسی کے ساتھ بے وجہ رعایت و مروت کروگے کل کو جواب دینا ہوگا۔ دوسرے مدرسہ کا مال بیت المال ہے۔ اس سے قرض دام پیشگی مت دیا کرو۔ تم کو اسمیں تصرف نہیں پہنچتا۔ تیسرے یوں تو سارے مدرس اور اہل مدرسہ فقیر کے عزیز اور پیارے ہیں مگر عزیزم مولوی محمد یعقوب صاحب کا چند وجوہ سے زیادہ واسطہ ہے۔ لہٰذا اگر وہ مدرسہ کے کسی کام میں کوتاہی

کیا کریں تو ان سے بجبر کام لیا کرو۔ انشاء اللہ وہ ان سے ناراض نہ ہوں گے۔ کیونکہ دانا ہے۔ چوتھے عزیزم مرحوم کے جو شاگرد اور مرید ہیں اور دوست ہیں سب مدرسہ کی طرف توجہ رکھیں اور عزیزم رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی عمدہ یادگاری مدرسہ ہے اس سے غفلت نہ کریں۔

پانچویں عزیزم مرحوم کی اولاد کے ساتھ رعایت اور مروت رکھیں خصوصاً تعلیم علم اور تربیت امور خیر میں لحاظ رکھیں۔ فقیر چاہتا ہے کہ برخوردار احمد کو یعنی فرزند عزیزم مرحوم کو اپنے پاس بلا کر رکھوں۔ اور یہاں مدرسہ میں مولانا مولوی رحمت اللہ کی خدمت میں تحصیل علم کرے اور جبتک فقیر جئے اس سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھے۔ مگر اس کی والدہ شاید جدائی گوارا نہ رکھیں۔ فقیر کو اس کی خاطر بھی منظور ہے۔ اس واسطے اس امر میں سکوت کیا۔ بہرحال دعا پر اکتفا کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو سب برائیوں اور تکلیفوں سے محفوظ رکھے اور علم نافع اور عمل صالح نصیب کرے آمین"۔۔۔۔ فقط از حافظ عبداللہ و حافظ احمد حسین مولوی رحمت اللہ

سلام مسنون

مولانا رحمت اللہ صاحب کے انتقال کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب مدرسہ صولتیہ کے سرپرست بنے اس وقت بھی آپ نے مدرسہ کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ آپ کے زمانہ میں مدرسہ صولتیہ کی ایک شاخ تھی وہ کیا خدمت انجام دے رہی تھی اس کا ذکر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے ۱۴ رجب ۱۳۱۰ھ کے خط میں ہے جو آپ نے مولانا اشرف علی صاحب کو لکھا تھا[1]

"اکثر احباب یہ دریافت فرماتے ہیں کہ عزیزم مولوی قاری احمد مکی صاحب

---

[1] مکتوبات امدادیہ ص ۷۶

کا مدرسہ کس قسم کا ہے اس لئے واسطے اطلاع لوگوں کے یہ تحریر لکھی گئی۔ یہ مدرسہ...... جناب مولوی رحمت اللہ صاحب کی شاخ ہے۔ جناب مولانا مرحوم کی ہمت اور توجہ سے یہ مدرسہ قائم ہوا۔ اور اس کا اہتمام قاری حافظ احمد مکی صاحب موصوف کے ذمہ ہوا۔ اسمیں علوم دینیات پڑھائی جاتی ہیں۔ لیکن مدرسہ میں مولانا مرحوم کی زیادہ تر توجہ تجوید و حفظ قرآن کی طرف ہے کیونکہ علم تجوید کا رواج بہت کم ہو گیا ہے خصوصًا ہندوستان میں بہت کم ہے ماشاءاللہ ان مدارس سے فائدہ عظیم ہوئے ہیں۔ ہندیونکو اس فن میں عرب وغیرہ بہت حقیر سمجھتے تھے بلکہ بعض عرب ہندی علماء کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے مگر بفضلہ تعالیٰ ان مدارس کے ذریعہ سے بہتیرے کامل قاری ہو کر نکلے ہیں اور حرمین شریفین میں بعض ہندی قاری تعلیم یافتہ ان مدرسوں کے اب استاد عرب ہیں قاری حافظ احمد مکی صاحب کا مدرسہ محلہ جیاد میں ہے۔ پینسٹھ طلبہ بالفعل عرب ترک ہندی وغیرہ مختلف قوموں کے پڑھتے ہیں۔ حافظ صاحب نے اپنے حب ایمانی و تدین و تورع کی وجہ سے اس کا انتظام بہت عمدگی کیساتھ کر رکھا ہے بالفعل اسمیں ایک قاری اور ایک حافظ مقرر ہیں اور مولوی حافظ صاحب موصوف خود ایسی محنت و مستعدی سے دینیات و علم تجوید پڑھاتے ہیں جو کئی مدرس کے برابر ہے۔ ہر مسلمان پہ مدد دین فرض ہے خصوصًا تعلیم قرآن مجید جو اصل دین اسلام ہے خاصکر مکہ معظمہ ایسا مقدس مقام ہے جو دین کا مرکز و مامن و ماوائے مسلمانان ہے جہاں کی خیرات میں ایک لاکھ ثواب ہے اور مکہ معظمہ میں مدد علم دین کا تو کچھ حد و حساب ہی نہیں مسلمان آخرت ہی کے واسطے پیدا ہوئے ہیں۔ تھوڑا سا خرچ کر کے بحساب

منافع آخرت اور زاد عقبیٰ حاصل کریں۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب از مکہ معظمہ حارۃ الباب۔ مکرر یہ ہے کہ یہ مضمون آپ مہربانی فرماکر اخبار نور الانوار میں یا جس اخبار میں مناسب سمجھیں طبع کرادیں اور اس بارہ میں ایک مضمون آپ بھی اپنی طرف سے تحریر فرماکر درج کردیویں۔ کہ سب شریک حساب ہوں اور ممکن ہو تو ایک پرچہ مندرجہ مضمون فقیر کے پاس روانہ کردیویں۔"

مدرسہ صولتیہ کے مہتمم مولوی محمد سعید صاحب

مولانا رحمت اللہ کے ہاں چونکہ کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے آپ نے اپنے بڑے بھائی مولانا حکیم علی اکبر صاحب کے پوتے مولانا محمد سعید صاحب کو وطن سے بلا یا تھا۔ ان کے والد مولوی محمد صدیق صاحب انبالہ میں سررشتہ دار تھے اور مکان کے قریب ایک مشن سکول تھا جس میں منشی نہال الدین صاحب فارسی پڑھاتے تھے۔ مولوی صدیق صاحب اور منشی نہال الدین کے گہرے تعلقات تھے۔ اسی بنا پر مولوی محمد صدیق صاحب نے اپنے صاحبزادے مولانا محمد سعید صاحب کو مشن اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ اس کی اطلاع جب مولانا صاحب کو ملی تو آپ کو بہت افسوس ہوا۔ اور بڑی خفگی کے ساتھ لکھا کہ تم نے یہ کیا کیا ہے محمد سعید کو مشن سکول سے نکال کر مکہ معظمہ فوراً روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد سعید صاحب بارہ برس کی عمر میں مکہ معظمہ گئے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی نگرانی میں انکی تعلیم کا انتظام ہوا۔ ضعف بصارت کے بعد تحریر کا کام اور خاص طور پر خطوط کے جوابات کا کام ان ہی کے ذمہ تھا بلکہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے فرمانے پر آپ مغرب و عشا کے درمیان حاجی صاحب کے بھی خطوط گوش گذار کرتے اور ان کے جوابات بھی لکھتے تھے۔ چنانچہ مولوی محمد سعید صاحب ان دونوں بزرگوں کی صحبت کی

وجہ سے کافی تجربہ کار ہو گئے تھے اور مولانا صاحب کے انتقال کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے برادر زادہ حافظ احمد حسین امین الحجاز کو مدرسہ کے حساب و کتاب اور مال کا نگراں مقرر کیا گیا اور مولانا محمد سعید صاحب کو نظامت کی ذمہ داری دی گئی جس کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا۔

جب مدرسہ کی حالت زیادہ خراب ہونے لگی تو مولوی محمد سعید صاحب نے ہندوستان کے لوگوں سے مدرسہ کی اعانت کرنے کی اپیل کی جو وکیل امرتسر مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی جس سے اس زمانہ کے مدرسہ کی حالت کا نقشہ بھی سامنے آجاتا ہے[1]

"اس اسلامی اور قومی مدرسہ کا بنیادی پتھر اس پاک اور مقدس زمین پر بہت سی امیدوں اور قومی بہبودی کے متبرک خیال کے ساتھ رکھا گیا ہے اس دن سے دو چار برس اوپر تک کبھی اس مدرسہ نے اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کو عام مسلمانوں پر ظاہر نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت ہم مدرسہ کے معاونوں اور سرپرستوں کی فہرست میں ہندوستان کے کسی والی ملک یا امیر و متمول شخص کا نام سوائے دو تین کے نہیں پاتے اور حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ کے بانی جناب مولانا رحمت اللہ صاحب نے نہ صرف اپنی عمر کا اکثر حصہ مدرسہ کی خدمات میں صرف کر دیا۔ بلکہ اپنا مال بھی وہ بہت خوشی کے ساتھ آخر وقت تک اس نیک کام میں لگاتے رہے۔ مجھے شاید اس موقع پر اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اعلیٰ حضرت سلطان المعظم کی پیشگاہ سے جو عطیہ یا وظیفہ خاص جناب ممدوح کی ذات کے واسطے مقرر تھا۔ اس میں سے کبھی انھوں نے اپنی ذاتی

---

[1] تاریخ صحافت اردو جلد سویم ص ۶۷۳

ضرورتوں کے واسطے ایک حبہ نہیں لیا اور یہ کئی ہزار روپیہ سال کی رقم مدرسہ کو دیتے رہے کہ حسن اتفاق اور زمانہ کی مساعدت سے ایسے ہی اسباب جمع رہے کہ مدرسہ کی طرف سے نہ کوئی وفد کہیں گیا اور نہ چندہ کے لئے اعلان شائع کئے گئے۔ مدرسہ سترہ اٹھارہ برس تک قوم کی خدمت علم کی اشاعت اپنی اغراض کی تکمیل کرتا رہا۔ مگر گمنامی اور نہایت استغنی کے ساتھ . . . . مدرسہ صولتیہ کے قائم کرنے کے دو سال بعد ایک صنعت و حرفت کے مدرسہ کی بھی بنیاد رکھی گئی تھی کہ ہماری اولاد اور آئندہ نسلیں تعلیم دینیات کے ساتھ کسب معاش اور رزق حلال کے ذریعہ بھی سیکھ لیا کریں کہ وہ مدرسہ سے جب فارغ التحصیل و عالم ہوکر نکلیں تو اپنی مدد آپ کر لینے کا مادہ اور استعداد ان میں موجود ہو۔ مولانا نے صنعت و حرفت کے مدرسہ کا بنیادی پتھر بھی رکھدیا مگر مدرسہ کی عمارت ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ غیر متوقع موانعات پیش آجانے اور روپیہ کی کمی نے صنعت و دستکاری کے مدرسہ کا کام پورا نہ ہونے دیا۔ ابھی مولانا کو بہت سے ادھورے کام پورے کرنے تھے کہ قضائے الٰہی نے ان کو ہمیشہ کے لئے ہم سے علیحدہ کر دیا . . . اس وقت تعلیمی مدرسہ ہی کا اجرا مسلمانوں کی بے اعتنائی سے مشکل نظر آرہا تھا۔ عربی کے تین مدرس تھے۔ مجبوراً اور رکھنے پڑے۔ مہتمم کتب خانہ کو دس روپیہ اور نہ دیا جاسکا اور علیحدہ کردیا۔ ایک خوش نویس جو طالب علموں کو مشق کراتا تھا الگ کر دیا گیا اور تین اور ملازم جن کے نہ ہونے سے مدرسہ کا کام بہت ابتر ہو رہا ہے موقوف کر دئیے گئے۔ مدرسہ کی حالت کا اندازہ

اس امر سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے جو طالب علم جس کی عمر بیس برس
سے زیادہ نہ ہو اور داخلہ کا امتحان کافیہ میں دے اور بظاہر شوقین
اور ہونہار ہو۔ وہ قانون مدرسہ کے موافق پانچ سال تک وظیفہ
کا مستحق ہے۔ اب مدرسہ ایسے مستعد طالب علموں کو بھی وظیفہ دینے
سے لاچار ہے۔

مدرسہ میں کتب خانہ کے لئے جو کمرہ ہے وہ بہت تنگ ہے۔ اور
صبح کے وقت روشنی پورے طور پر اس میں نہیں ہوتی۔ دو سال
سے کتب خانہ کی تعمیر کے لئے ایک تجویز ہو چکی ہے اور تخمینہ صرف
ڈیڑھ ہزار روپیہ اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار روپے ہے۔ اس
وقت تک باوجود کوشش اور انتہائی درجہ کی جانفشانی کے اس قدر
روپیہ بھی جمع نہیں ہو سکا۔ کہ سال بھر کا پورا خرچ نکال کر کتب خانہ
کی تعمیر شروع کر دی جاتی۔ عربی کے دو مدرس پورے سبق نہیں
پڑھا سکتے اس وجہ سے دو اور مدرس جن میں سے ایک کے ذمہ
صرف و نحو اور فقہ میں قدوری اور منطق میں قطبی تک سبق ہوں
اور ایک اوپر کی کتابیں پڑھا سکیں۔ . . ابتداء سال ۱۳۱۷ھ سے
مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ سب سے پہلے اس قومی خدمت کو مولوی
حاجی ریاض الدین احمد صاحب بریلوی نے بطیب خاطر خوشی کے ساتھ
قبول کیا ہے۔ مغربی شمالی ہند میں حاجی ریاض الدین احمد صاحب ایک
وسیع المتعارف شخص ہیں۔ اس ہفتہ حاجی ریاض الدین احمد صاحب
کی خدمت میں مدرسہ کی طرف سے ایک وکالت نامہ روانہ کیا جاتا
ہے جس میں ان کو تمام ہندوستان میں مدرسہ کے واسطے دورہ

اور چندہ بھی جمع کرکے مکہ معظمہ پہنچنے کی اجازت مدرسہ کی طرف سے دی گئی ہے۔"

مدرسہ صولتیہ کو اسلامی یونیورسٹی بنانے کی تجویز

مدرسہ صولتیہ نے تعلیمی اعتبار سے اس قدر ترقی کی تھی کہ علمی، تعلیمی اور مذہبی طبقوں میں یہ خیال کیا جانے لگا تھا کہ مدرسہ صولتیہ کو ترقی دے کر ایک مکمل اسلامی یونیورسٹی اور عظیم الشان دارالعلوم بنایا جائے۔" اس قسم کے خیالات کے اظہار کی ابتدا علامہ شبلی نعمانی نے فرمائی۔ اسکے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال مورخہ ۳۰ر اپریل ۱۹۱۳ء میں اسکی تائید کی

"۵ ار اپریل ۱۹۱۳ء کے روزانہ زمیندار میں شمس العلماء، علامہ شبلی نعمانی کی طرف سے ایک آرٹیکل شائع ہوا ہے جس میں علامہ موصوف نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کا اندازہ فرماتے ہوئے دردمند دل سے یہ مبارک تجویز پیش کی ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک جامعہ اسلامیہ قائم کیا جائے جس میں تمام مذہبی اور دنیوی (جس میں علوم جدید بھی شامل ہوں) علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہو۔ محترم ناظرین یہ آواز ہے جس پر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو صدائے لبیک بلند کرنا ضروری ہے اور خیر مقدم واجب ہے۔ کیونکہ جب اسلامی پبلک کو اس واجب التکریم اس عظیم الشان معبد سے وہی تعلق اور کشش ہے جو کاہ وکاہربا میں دیکھی جاتی ہے تو اس اعلیٰ مقصد کے لئے مکہ معظمہ سے بہتر اور مقام موزوں نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن ایسی یونیورسٹی کے قائم ہونے میں جہاں یہ دقت ہے کہ ٹرکی گورنمنٹ مشکل سے اجازت دے گی۔ یہ بھی دقت ہے کہ عرب کے

مسجد و مدرسہ صولتیہ کا بیرونی منظر
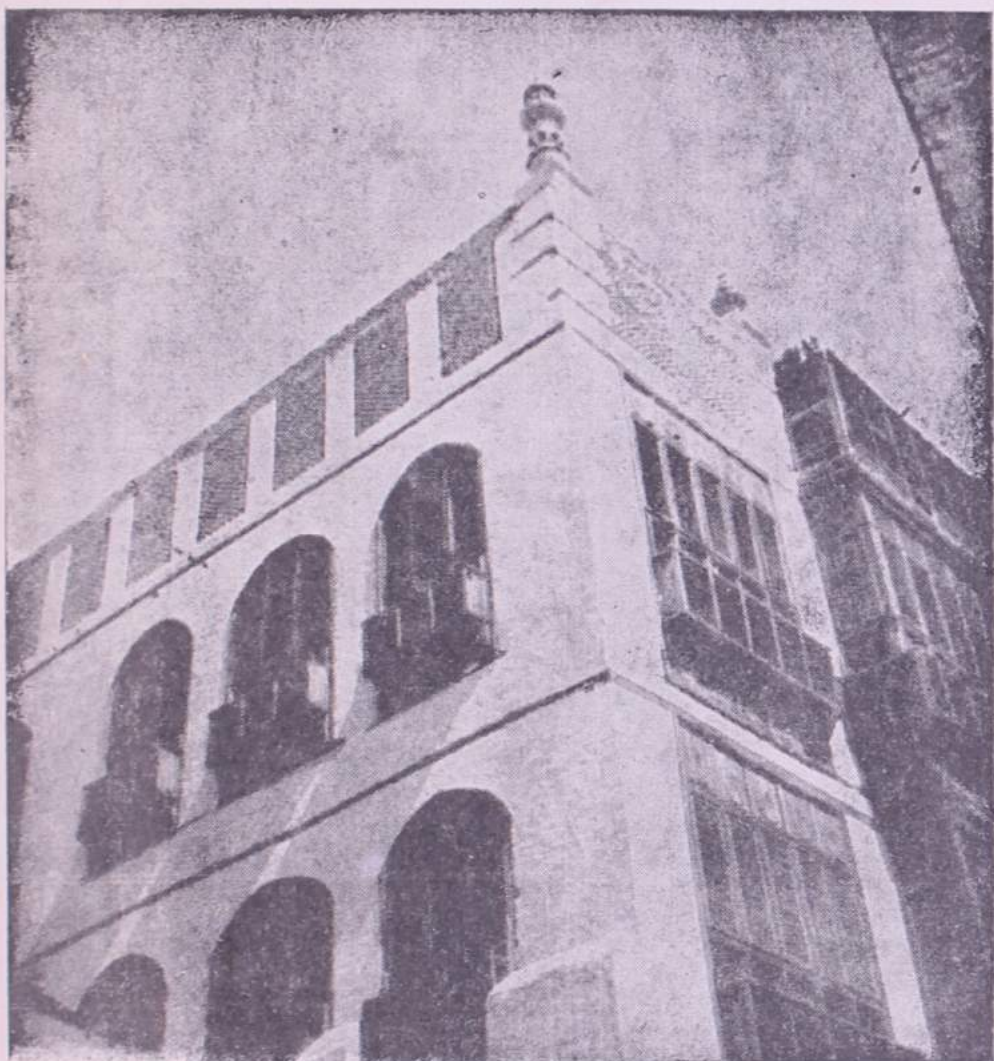
مدرسہ صولتیہ کے بیرونی حصّہ کا منظر

دین دار قبائل ایسی یونیورسٹی کی طرف بمشکل متوجہ ہوں گے۔ بلکہ اکثر قبائل اس روشن خیالی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور دہریت کا پیش خیمہ سمجھ کر مانوس نہ ہوں گے۔ میرے خیال میں دونوں دقتیں رفع ہونے کی سہل صورت یہ ہے کہ "مدرسہ صولتیہ کو ترقی دیکر ایک مکمل اسلامی یونیورسٹی اور عظیم الشان دار العلوم بنایا جائے"۔

"صولتیہ مدرسہ ہے جو ۳۸ سال سے مرکز اسلام میں قائم ہے اور جس کا سنگ بنیاد نیک سیرت بزرگ و دور اندیش (فاضل ہند مولانا رحمت اللہ مرحوم) نے ہندوستان کو خیر باد کہہ کر حرم محترم میں بڑی اولوالعزمی اور جوش کے ساتھ ۱۲۹۲ھ میں اس ارادے سے رکھا کہ اس کے ذریعہ علوم ربانی کی اشاعت صحیح اصول اور اعلیٰ پیمانہ پر جاری ہو۔"

"مدرسہ نے اپنے بانی کی نیک نیتی اور خلوص سے بتدریج اتنی ترقی کی کہ وہ جامعہ اسلامیہ بننا چاہتا ہے۔ خود اس کے مہتمم مولانا محمد سعید صاحب ۱۳۲۹ھ کی روئیداد میں تحریر فرما چکے ہیں کہ مدرسہ کے شاندار مستقبل کے لئے مسلمانوں کو اپنی متفقہ کوشش سے کام لینا چاہیئے اور جس طرح علم مذہبی دار العلوم خالص مرکز اسلام میں قائم کرنے کا ولولہ اور خیال پیدا کیا جائے۔ مسلمانوں کو اگر اپنا مذہب عزیز ہے اور اپنی حالت سنبھالنا چاہتے ہیں تو اس وقت اور اس موقع کو غنیمت سمجھیں اور یاد رکھیں کہ جس طرح اصلاح کی بنیاد مذہب کے اعظم ترین مقدس مقام پر رکھی جاوئگی اس کا اثر تمام اسلامی دنیا میں پڑے گا"

اس اصول پر کاربند ہو جاؤ کہ جڑ کو سرسبز رکھنے سے شاخیں ہمیشہ تر و تازہ اور بار آور ہو سکتی ہیں۔"

نظام اور نصاب تعلیم

ہر کام جب تک کسی ضابطہ اور قانون کے ماتحت نہ ہو وہ اچھے نتیجے اور اثر سے محروم رہتا ہے۔ نظام قانون کو تیار کر لینا بظاہر آسان کام معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس پر پابندی کے ساتھ عمل کرنا زیادہ سہل نہیں ہے۔ مدرسہ صولتیہ کو تقریباً اپنی طویل زندگی کے ہر دور میں مختلف حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ ہر زمانہ کی ضرورتیں علیحدہ ہوتی ہیں۔ ان کا عملی معیار پر لحاظ رکھنا پسپائی اور رجعت کے برابر ہے۔ مدرسہ کا نظام عام مسلسل جدوجہد اور پیہم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مگر یہ نتیجہ سفید کاغذ پر سیاہ لکیر کی شکل میں نہیں بلکہ منظر عام پر عملی شکل وصورت میں موجود ہے۔ ہر مدرسہ میں سب سے اہم چیز نظام تعلیم ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پرانے اور نئے طرز تعلیم یا قدیم وجدید کے ملانے کے بعد جو تجربے حاصل ہوئے ان کی قدر وقیمت اس زمانہ میں ناقابل انکار رہے۔

دو چیزیں ہمیشہ ملک کی جغرافیائی وطبعی حیثیت اور مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے بنائی جاتی ہیں۔ ایک ملکی قانون، دوسرا نظام تعلیم۔ مگر کارکنان مدرسہ صولتیہ کو حدود مدرسہ میں جن دقتوں اور تعلیمی دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک نظام عام ونصاب تعلیم اور متحدہ وضابطہ کے اندر ہندوستانی، بخاری، یمانی، صومالی، جاوی، فارسی، حجازی چینی، سوڈانی، حضرمی (حضرموت کے رہنے والے) مغربی وغیرہ مختلف المذاہب مختلف الخیال، مختلف اللغات، طلبہ کی بیک وقت تعلیم وتربیت کی بے پناہ دشواریوں نے کبھی کارکنانِ مدرسہ کو اس طرف سے بے نیاز نہیں رکھا۔[1]

ایک طرف اس کے علاوہ مدرسہ کو آفاقی اور پردیسی طلباء کے لیے اس قسم کی تعلیم کا انتظام قائم رکھنا ضروری ہے۔ جو ان کے لئے مفید وبا اثر ہو، دوسری

---

[1] ندائے عام ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء

طرف مقامی طلبا کی تعلیم و تربیت کا مستقل اہتمام یہ چیز کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ مقامی اور پردیسی طلبار کے خیالات اور نظریات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مقامی طلبا اور مہاجرین حرم کی اولاد کے لئے ہماری تعلیمی غرض یہ ہے کہ وہ پڑھ کر کچھ کریں۔ دوسری طرف دنیائے اسلام سے آنے والے پردیسی طلبار اس مقصد و غایت کے لئے آتے ہیں کہ کچھ کام کرنے کے لئے پڑھیں۔ ان دونوں نظریات کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے واسطے عرصہ تک منتظمان مدرسہ مختلف تجربوں کو عمل میں لاتے رہے اور جو طریقے اختیار کئے گئے انکے لئے مفید و کار آمد صورتوں کو قابل سمجھا گیا۔

مدرسہ کے موجودہ نظام تعلیم میں پانچ مستقل شعبے ہیں اور نصاب تعلیم کے لحاظ سے مدت تعلیم و تحصیل بارہ سال ہے۔ جس کی مختصر کیفیت ناظرین کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ پہلا شعبہ تحضیری (پرائمری) ہے جس کی مدت تعلیم تین سال ہے۔ دوسرا شعبہ ابتدائی (مڈل) جس کی مدت تعلیم چار سال ہے۔ اس سات سالہ تعلیم کے بعد مدرسہ کی طرف سے خاص امتحان کے بعد کامیاب طلبار کو سند ابتدائی دیجاتی ہے۔ اس عرصہ میں طالب علم ابتدائی علوم اور عملی فنون حاصل کر کے عملی زندگی میں کار آمد و مستعد ثابت ہو سکتا ہے اور اپنے مستقبل کے متعلق خود فیصلہ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ شعبہ ابتدائی کی تعلیم ختم ہونے کے بعد مدرسہ کی لازمی اور جبری تعلیم کی مدت پوری ہو جاتی ہے اور طالب علم مختار ہے کہ آئندہ اپنی دینی تعلیم کی تکمیل کے لئے شعبہ ثانوی میں داخل ہو یا معاشی اور کاروباری زندگی اختیار کرے۔ تیسرا شعبہ ثانوی ہے اس شعبہ کے تین سالہ زمانہ تعلیم میں طالب علم دینی علوم و معارف کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ مخصوص امتحان داخلہ کے بعد صرف وہی ہونہار و ذی استعداد طلبہ اس شعبہ میں لئے جاتے ہیں جن کا علمی ذوق و

شغف ان کو مزید تحصیل کی ترغیب دیتا ہے۔

مدرسہ کی تعلیم کا انتہائی درجہ قسم عالی ہے۔ اس شعبہ میں دو سال تک تکمیل علوم اور خاص امتحان کے بعد سند عالی دیجاتی ہے۔ پانچواں درجہ حفاظ و تجوید قرآن ہے حفظ کلام اللہ کے لئے کوئی خاص مدت اور زمانہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ عمر اور قوت حافظہ، شوق اور ہمت کا فرق اور تفاوت ہمیشہ تعیین مدت میں حائل رہا۔ اس شعبہ کے رجسٹروں اور خاص نقشوں سے کارکنان مدرسہ نے ایک خاص مدت کا تخمینہ لگا رکھا ہے جس میں کم و بیش قرآن پاک تجوید کے ساتھ ختم ہونا چاہیئے۔

مدرسہ کا نصاب مرکزی ضروریات کے لحاظ سے درس نظامیہ کی اصلاح شدہ صورت ہے۔ جس میں شام، مصر و عراق وغیرہ ممالک اسلامیہ کے اعلیٰ عربی مدارس کے کار آمد طریقے اور رد و بدل کے بعد مفید کتابیں داخل ہیں۔ دینی اعلیٰ تعلیم میں یہ امتیاز صرف صولتیہ کو ہی حاصل ہے کہ اس کے نصاب میں علم حدیث کی صحاح ستہ اور ان کی متعلقہ کتابیں بانی مدرسہ کے زمانہ سے آج تک نہایت پابندی کے ساتھ داخلِ درس رہیں۔

ادب میں زیر درس و مطالعہ کتابیں ہندوستان میں اپنے ناموافق انتخاب یا بیکار طریقہ تعلیم کی وجہ سے ادبی لیاقت یا عربی زبان میں مہارت و قابلیت پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔ یہ کتابیں مدرسہ صولتیہ کے نصاب سے خارج کر دی گئی ہیں اور مفید طریقہ تعلیم کے مطابق ادب عربی کی تعلیم میں فن انشاء، محفوظات ادبیہ، فن خطابت، اور تلقین و تطبیق سے مدد لی جاتی ہے۔ ماحول کا اثر اور ان فنون کی باقاعدہ تعلیم، طالب علم میں ادبی مہارت اور عربی زبان میں اچھی استعداد اور قابلیت پیدا کرنے کا سہل اور مفید ترین طریقہ ہے۔[1]

۱۹۳۵ء میں مدرسہ صولتیہ کی جماعت عاملہ کے عہدہ دار ممبران اور

---

[1] نداے عام ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۵ء ص ۵۳

کارندے حسب ذیل تھے۔

(۱) شیخ محمد عبداللہ صاحب صدر شعبہ مالیات (امین مدرسہ) و صدر مجلس مدرسہ۔

(۲) مولوی محمد سلیم صاحب نائب ناظم مدرسہ۔

(۳) شیخ محمد علی الیاس۔ مراقب عام (رجسٹرار) و امین مجلس مدرسہ۔

(۴) مولوی محمد اسماعیل صاحب سر دفتر و محاسب و ممبر مجلس مدرسہ۔

(۵) مولوی عبداللہ غازی صاحب مہتمم کتب خانہ۔

(۶) مولوی عبداللطیف صاحب مددگار مہتمم کتب خانہ و نگران دارالمطالعہ۔

(۷) شیخ احمد ملیباری۔ محضر و مفتش اقسام علمیہ۔

(۸) عبداللہ ملیباری محافظ دار التدریس و مفتش شعبہ تحفیظ و شعبہ تجوید القرآن۔

(۹) عبد السبحان بہاری۔ محافظ دار التدریس۔

(۱۰) مولانا محمد سعید صاحب ناظم مدرسہ

(۱۱) محمد عمر سوڈانی محافظ مدرسہ (عمارت قدیم)

(۱۲) حافظ محمد قربان محافظ مسجد مدرسہ و موذن

(۱۳) محمود بخاری۔ حجام دار الاقامہ

(۱۴) عبدالرحمٰن بخاری محافظ دار الاقامہ (بورڈنگ)

(۱۵) عبدالرزاق ہندی سقہ دار التدریس

اساتذہ شعبۂ قرآن و تجوید القرآن (۱) قاری عبداللطیف صاحب صدر مدرس شعبہ تجوید القرآن (۲) قاری عبدالعزیز حجازہ مصری۔ مدرس حفظ قرآن و تجوید (۳) قاری محمد فتیح اللہ مصری۔ مدرس قرآن (۴) قاری محمد مظہر رضا۔ مدرس قرآن و تجوید۔

اساتذہ شعبہ پرائمری و مڈل (۱) سید احمد بن عبداللہ مکی نگران شعبہ تحفیظ (پرائمری)

سیرۃ نبویہ و ممبر مجلس مدرسہ (۲) مولوی عصمت اللہ صاحب مدرس فقہ حنفی و علوم ابتدائیہ (مڈل) (۳) سیّد ہاشم شبطاکی، مدرس اولاعربی وادبیات۔ (۴) محمد عاصم آفندی ترکی مدرس ریاضیات (۵) شیخ علی محمود یمانی مدرس فقہ مالکی و قرآن پاک (۶) شیخ ذکریا بیلا، مُدرس اخلاق و حفظان صحت (۷) سیّد محمد ناصف مغربی، مدرس فقہ مالکی و قرآن پاک (۸) مولوی خلیل الرحمٰن مدرس علوم ابتدائیہ (۹) شیخ عبدالقادر الیاس مدرس تاریخ اسلام وانشاء عربی (۱۰) شیخ داؤد رمانی۔ مدرس اختصاصی فن خطوط عربیہ (۱۱) شیخ عثمان تونکل۔ مددگار مدرس خط و محضر نویس مجلس مدرسہ (۱۲) حافظ سراج الحق مدرس ہجا (سال اوّل)

اساتذہ شعبۂ ثانوی و عالی

(۱) سیّد عمر حمدان ......۔ استاد الحدیث و علوم عالیہ و نائب صدر مجلس مدرسہ (۲) شیخ محمد حسن مشاط، مدرس التفسیر فقہ مالکی و اصول فقہ و علوم عالیہ ممبر مجلس مدرسہ (۳) شیخ عبدالحمید یمانی۔ مدرس فقہ شافعی واصول فقہ و علوم عالیہ (۴) مولوی عبیداللہ بخاری۔ مدرس فقہ حنفی واصول فقہ علوم عالیہ و ممبر مجلس مدرسہ (۵) مولوی محی الدین۔ مدرس علوم عالیہ و تاریخ (۶) سیّد محمد زین العابدین۔ مدرس ریاضیات (۷) شیخ مختار مخدوم مدرس قواعد لغت عربیہ۔

مدرسہ صولتیہ کا کتب خانہ

اس کتب خانہ میں ۱۹۳۵ء میں آٹھ ہزار کتابیں تھیں اِس وقت اس میں گیارہ ہزار کے قریب کتابیں ہیں۔ جو زیادہ عربی کی ہیں۔ مولانا محمد سعید صاحب کا عرصہ سے ارادہ تھا کہ مدرسہ کے کتب خانہ کو وسعت و ترقی دینے کے بعد عام اہل علم اور شائقین کو اس سے مستفید ہونے کا موقع دیں اور طلبا میں مطالعہ اور کتب بینی کا شوق پیدا کیا جائے۔ علمی شغف و ذوق کو بڑھایا جائے۔ اس ارادہ کی ابتدا اور اس اہم ضرورت
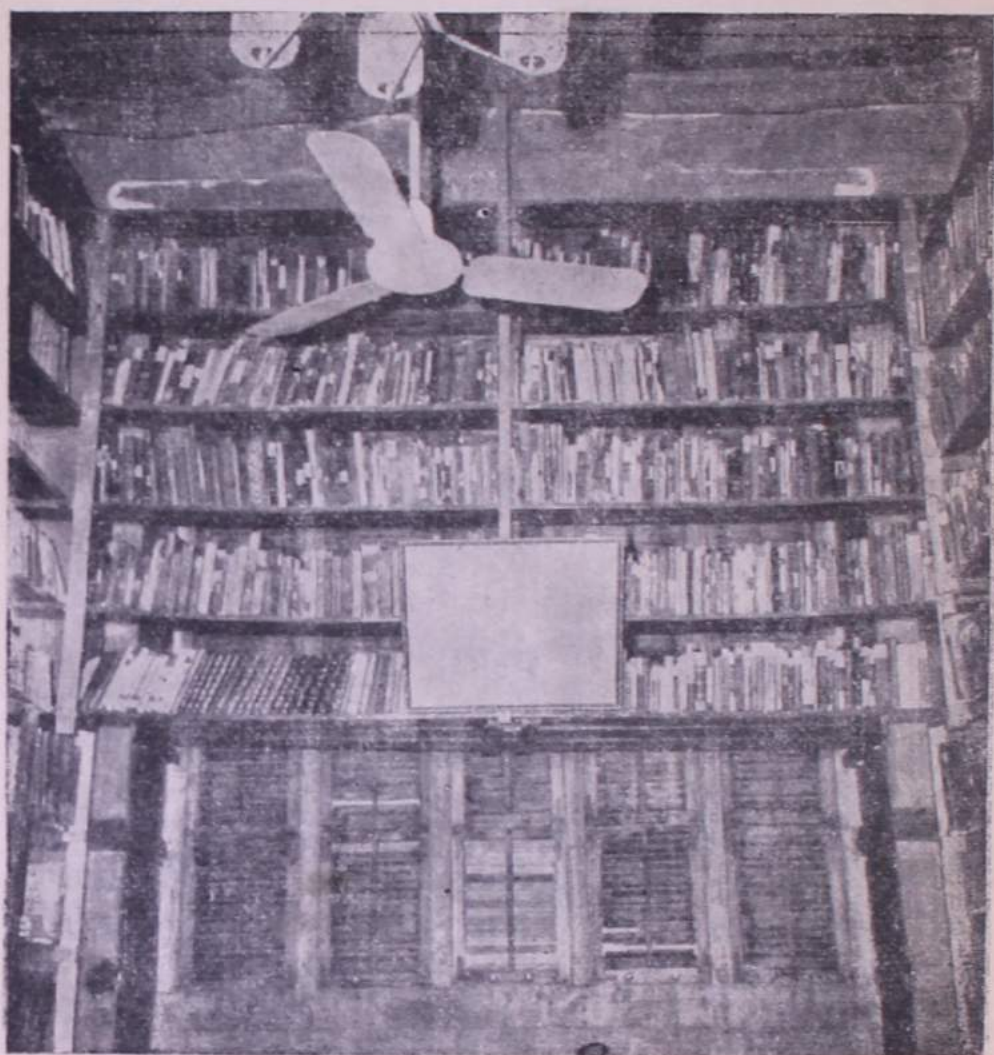
مدرسہ صولتیہ کے کتب خانہ کا بیرونی منظر
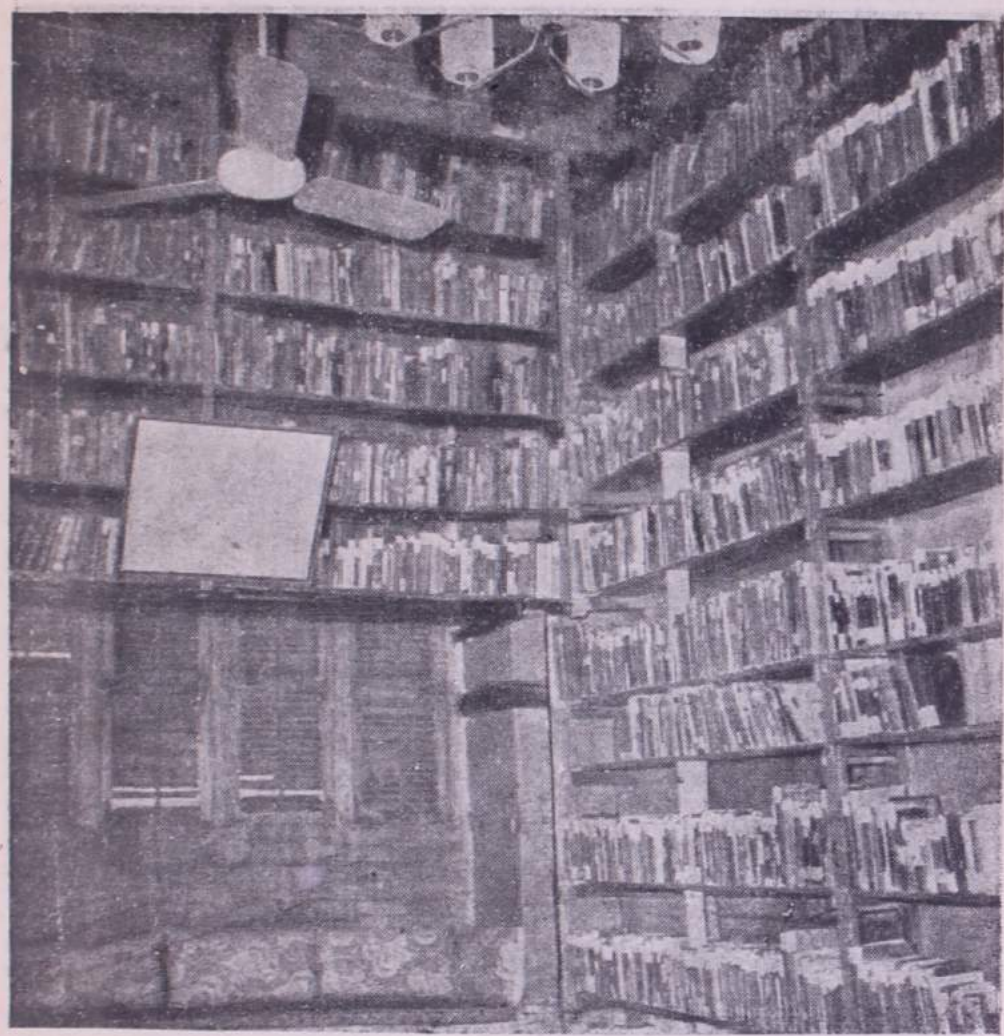
مدرسہ صولتیہ کے کتب خانہ کا بیرونی منظر

کو پورا کرنے کیلئے مدرسہ کی نئی عمارت میں ۱۳۵۲ھ سے "دارالمطالعہ" کا افتتاح کیا گیا جس کا دروازہ مدرسہ کے طلباء و مدرسین کے علاوہ اہل علم اور شائقین کیلئے ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

مدرسہ کے دوسرے ناظم مولانا محمد سلیم صاحب

مولانا محمد سعید صاحب کی حیات میں ہی مولانا محمد سلیم صاحب مدرسہ کے نائب ناظم مقرر ہو گئے تھے یہ ذمہ داری انہوں نے اپنے والد ماجد مولانا محمد سعید صاحب کی وفات تک نبھائی مولانا محمد سعید صاحب کا انتقال ۱۳۵۷ھ میں ہوا۔ اس کے بعد آپ کو ناظم مدرسہ مقرر کیا گیا۔ آپ نے دینی تعلیم کے ساتھ زراعت صنعت اور بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری کیا جو بڑی کامیابی کے ساتھ چلا۔ ابھی ان نئے سلسلوں کو جاری ہوئے نو سال بھی نہیں گذرے تھے کہ مدرسہ صولتیہ ایک عظیم پریشانی میں مبتلا ہو گیا ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا۔ تقسیم آبادی کے ساتھ تباہی و بربادی اور قتل غارتگری کی گرم بازاری ہوئی جس سے مدرسہ کے نظام میں بڑا فرق پڑا۔ آمدنی کی راہیں ختم ہونے لگیں۔ جس کا ذکر مولانا محمد سلیم صاحب نے مدرسہ کی ۱۳۶۸ء کی ایک مختصر سی روئیداد میں کیا ہے۔

"دارالعلوم حرم صولتیہ اپنی عمر کے ہر دور میں جن دشوار گذار مراحل سے گذرا ہے انہیں یہ آخری افتاد شاید سب سے زیادہ سخت اور بہت زیادہ صبر آزما ہے جسے دنیا کی تاریخ انقلاب ۱۹۴۷ء کے نام سے یاد رکھیگی اس براعظم کی تقسیم کے ضمن میں لاتعداد انسانوں کی خونریزی شہروں اور آبادیوں کی ویرانی لاکھوں بے خانماں افراد کی تباہ حالی اور انسانی درندگی و بہمیت کے ہوشربا واقعات نے

نہ صرف وقتی طور پر عام سکون و دلجمعی کا خاتمہ کر دیا بلکہ مابعد کی صورت حال سے جو مشکلات پیدا ہوئیں اور ہر قدم پر دقتوں کا جو غیر مختتم سلسلہ قائم ہے ان کی وجہ سے ہر شخص اپنے ماحول میں غیر مطمئن اور مستقبل کی طرف پریشان نظر آ رہا ہے۔"

" دہلی کی بربادی کا تصور سب کے لئے اگر عام طور پر افسوسناک ہے تو خصوصیت کے ساتھ دارالعلوم حرم کے ہر خادم و کارکن کے لئے صدر دفتر دہلی کا چند لمحات کے اندر وحشیانہ غارتگری کی نذر ہونا ایک ایسا اندوہناک حادثہ ہے جس کی یاد ہمیشہ زندہ رہیگی اور یہ المناک اثر مشکل سے اہل حرم کے قلوب سے زائل ہوگا۔ صدر دفتر دہلی ملک کے طول و عرض میں مکہ معظمہ کا ایک امدادی مرکز تھا جس کی غیر متوقع طور پر تباہی نے اس مرکزی دارالعلوم کو موت و حیات کی کشاکش میں مبتلا کر دیا۔ ملک کے ہر گوشہ میں دارالعلوم حرم صولتیہ کے مخلص معاونین اور سراپا خیر و برکت محسنین کی الحمدللہ کمی نہیں اس قیامت صغریٰ سے قبل انمیں سے ہر شخص اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ موجود تھا۔ مگر آج ہزاروں پرانے معاونین لاپتہ ہیں بہت سے محسن ہمدردوں کی کوئی خبر نہیں۔ یہی دارالعلوم حرم کا وہ مایۂ ناز سرمایہ تھا۔ جس پر خدا کے بعد تمام کارکنان و خادمان دارالعلوم حرم صولتیہ کو پورا اعتماد تھا۔ دائرہ معاونین کا یہ وسیع حلقہ گردش زمانہ سے جس قدر محدود و مختصر ہو گیا۔ آج اسیقدر اہل حرم کی مشکلات اور ذمہ داریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ افراد کے تعاون اور شخصی امداد و اعانت سے محرومی کا گلہ ہی نہیں بلکہ افسوس اس امر کا ہے کہ صولتیہ ان مقررہ عطیات سے بھی محروم ہوتا جا رہا ہے جنکو بظاہر مستقل سمجھا جاتا تھا۔ دولت آصفیہ حیدرآباد دکن کی مقررہ ماہانہ امداد بند ہو چکی اگرچہ سرکار نظام کے خزانہ سے دارالعلوم کی کوئی بیشقدر امداد معین نہ تھی مگر پھر بھی دو سو روپیہ ماہانہ اور وقتاً فوقتاً دیگر عطیات
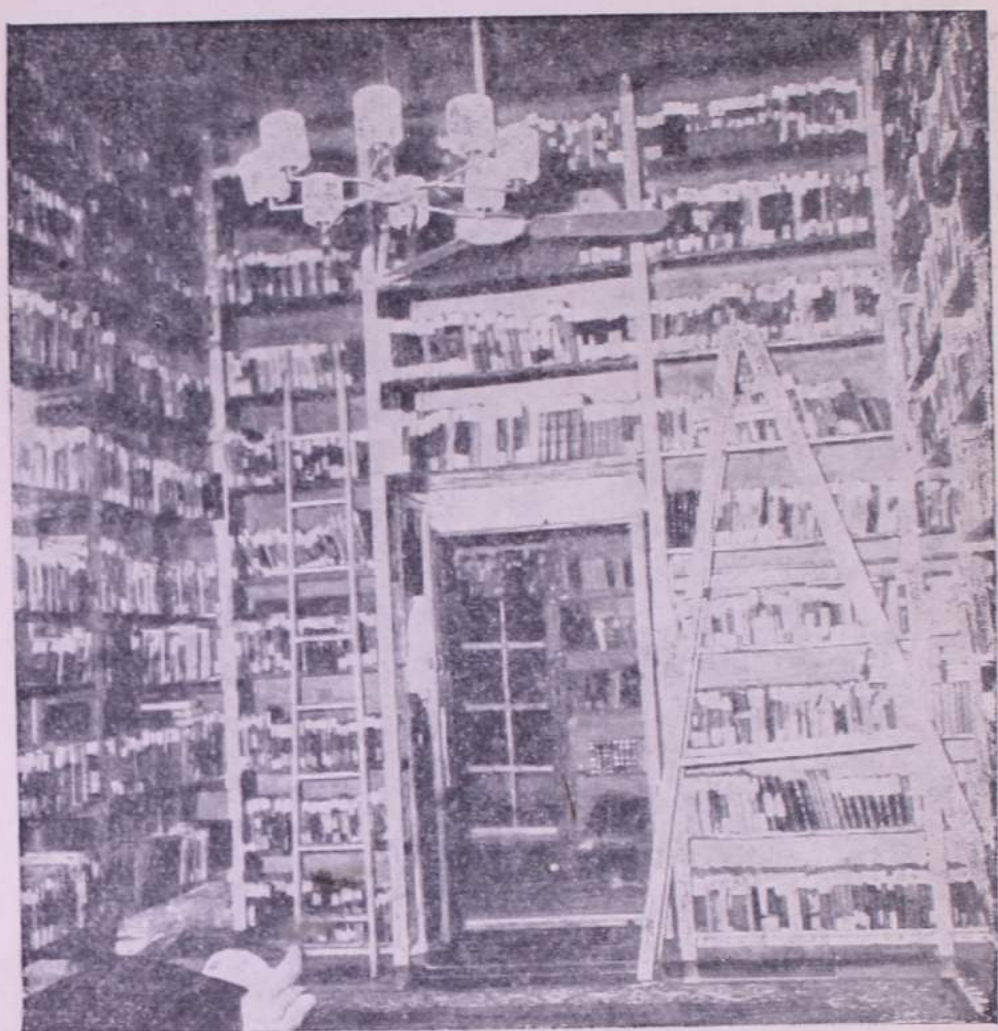
مدرسہ صولتیہ کے کتب خانہ کا بیرونی منظر
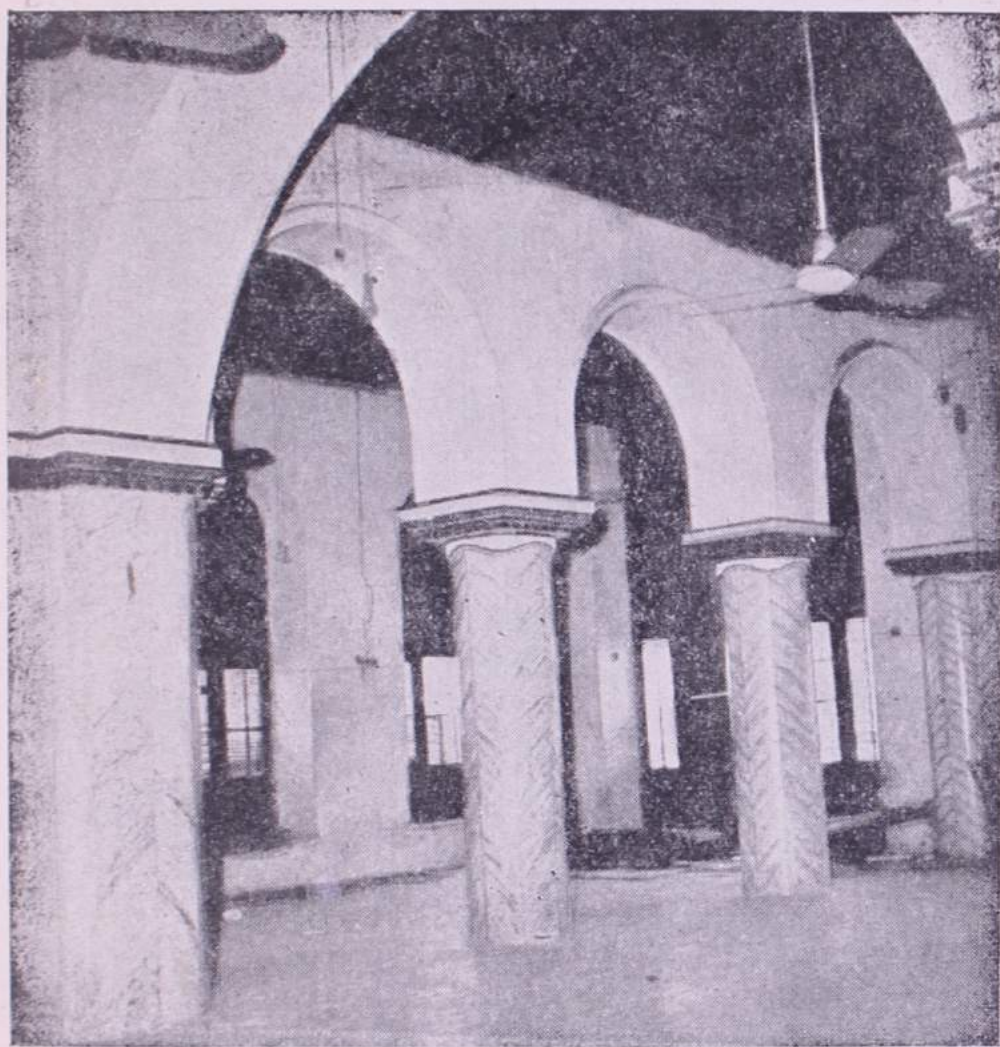
مدرسہ صولتیہ کے وسیع ہال کا منظر

بندش معنوی حیثیت سے پریشان کن ہے۔ بہار کے بعد خزاں کا یہ دور مستقبل کے لحاظ سے یقیناً سب کیلئے ایک مستقل اندیشہ کا باعث ہے۔"

۱۹۴۷ء سے قبل کے اساتذہ کی تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کا مدرسہ ترقی کی معراج پر پہنچا ہوا تھا۔ کن کن شعبوں میں تعلیم ہوتی تھی اور کن کن فنون کے استاد مقرر تھے اس کے دیکھنے سے اس بات کی تصدیق ہوتی۔

شعبہ عالی وثانوی

(۱) شیخ ذکریا بیلا نگران شعبہ
(۲) علامہ شیخ عمر حمدان
(۳) شیخ حسن مشاط
(۴) سید ابو بکر بکر المبار
(۵) مولانا محی الدین بخاری
(۶) مولانا ابراہیم ابو الفضل
(۷) شیخ علی بکر
(۸) شیخ عبداللہ فدا

مدرسہ ابتدائی

(۱) شیخ داؤد رمانی۔ نگراں مدرسہ
(۲) شیخ مصطفیٰ امختار
(۳) شیخ عبدالعزیز رباعی
(۴) شیخ احمد خلاقی
(۵) شیخ احمد عثمان فلمبان
(۶) سید محمد ناصف مراکشی

مدرسہ تحفیظ

(۱) شیخ محمد حسین مشاط۔ نگراں مدرسہ
(۲) شیخ عبداللہ خوجہ
(۳) سید ہاشم شطا
(۴) شیخ امین نیاز
(۵) شیخ اسماعیل عبداللطیف

شعبہ زراعت

(۱) شیخ عبدالقیوم خاں نگراں شعبہ
(۲) دلاور خاں رامپوری
(۳) محمد سندھی

شعبہ صنعت

(۱) ماسٹر محمد صدیق معلم خیاطی
(۲) شیخ محمد علی بخاری معلم فنون جمیلہ
(۳) شیخ احمد جنیدی۔ معلم جلدیہ
(۴) حاجی مشتاق احمد بنارسی۔ پارچہ بافی

شعبہ تعلیم بنات

(۱) خدیجہ صیرفیہ نگران شعبہ
(۲) فاطمہ قاریہ
(۳) خدیجہ قاریہ

شعبہ حفاظ و تجوید

(۱) قاری محمد رضا۔ نگران شعبہ
(۲) حافظ رشید احمد (صدیقی) جوالاپوری
(۳) حافظ محمود بخاری

مدرسہ دار الفائزین

(۱) شیخ فتح اللہ نگراں
(۲) شیخ محمود وہان
(۳) سید حسن جعفری
(۴) شیخ عبداللہ فارسی

دارالشفا

(۱) مولانا حکیم محمد یامین صاحب نگراں
(۲) حکیم حافظ محمد نعیم صاحب
(۳) محمد امین - دواساز

شعبہ لیلہ (شبینہ)

(۱) شیخ محمد امین
(۲) مولوی ریاض الحسن - باغپتی

مرکزی دفتر مکہ معظمہ

(۱) شیخ الیاس - صیغہ عربی
(۲) شاہ زین العابدین صاحب محاسب نگراں شعبہ صنعت
(۳) عبدالصمد ہاشمی - معاون تحریرات
(۴) احمد عبداللہ ملیباری - مراسل

کتب خانہ مدرسہ

(۱) مولوی سید خادم حسین صاحب
(۲) محمد بن محی الدین

دارالاقامہ

(۱) حافظ محمد مہدی انصاری
(۲) محمود بخاری

ملازمین ماتحت

(۱) عبدالرحمٰن یلدرش
(۲) عبدالرحمٰن مالاباری
(۳) عبدالرزاق محمد حسین
(۴) جربیع معتوق
(۵) عبداللہ عوض

صدر دفتر کراچی

(۱) حافظ ضیاء الدین احمد صاحب معتمد عمومی (۲) منشی عبد الولی صاحب معاون تحریرات

(۳) منشی انوار الحق صاحب معاون تحریرات (۴) سید دبیر احمد صاحب - رفیق دائرہ معاونین -

(۵) منشی رحمت علی - محافظ دفتر (۶) عبد الکریم - مراسل -

سنہ ۱۳۶۷ھ کے طلباء کی کل تعداد ۶۷۷ تھی جن میں ۲۳۲ مقامی طلباء ۱۱۰ لڑکیاں تھیں - اور پردیسی طلبا ۳۳۵ تھے جنکی تفصیل یہ ہے -

پاکستان و ہندوستان (۶۴) بخارا اور ترکستان (۱۸) سوڈان و افریقہ (۷۶) جزائر جاوا (۷۷) انڈونیشیا (۲۴) ملایا و جزائر ما تحت برطانیہ (۴۲) چین (۶) ساؤتھ افریقہ (۱۰) حضر موت (۴) یمن (۱۰) حبش (۲) افغانستان (۲)

ان میں سے ۵۸ طلباء کو مدرسہ کی طرف سے ماہانہ وظائف لیاقت، استحقاق کے مطابق دئے جاتے تھے -

اس صبر آزما زمانے کو مولانا محمد سلیم صاحب نے برداشت کیا اور اپنی ہمت و جرأت اور انتھک کوشش سے مدرسہ کے کاموں کو جاری رکھا - انتظام میں فرق آنے نہیں دیا - اور جہانتک ممکن ہو سکا مدرسہ کی شان میں کسی طرح کی کمی بھی آنے نہیں دی -

اب بھی حسب ذیل اساتذہ مدرسہ میں تعلیم دے رہے ہیں -

(۱) مولانا شیخ محمد المختار صاحب صدر مدرس (۲) سید محمد عبد الرحمٰن عکاس

(۳) شیخ محمد عدنان بن حکمت اللہ (۴) شیخ عبد اللہ بن سعید (الجی)

(۵) محمد بن عیوض منقش (۶) شیخ اسماعیل بن عثمان زبیدی

(۷) شیخ نعیم ابن حسین (قسطنطنوی) (۸) شیخ عزت بن احمد الشامی

(۹) شیخ محسن ابن ادریس (۱۰) قاری عبد الرشید سیامی

(۱۱) شیخ محمد صالح ابن احمد یمانی (۱۲) شیخ عبدالرحمٰن بخاری

(۱۳) شیخ زین العابدین۔ انڈونیشی (۱۴) مولانا محمد حسین برمی

تعلیم کے ساتھ خدمت خلق میں بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ دارالعلوم حرم صولتیہ خدا کے گھر میں مسلمانان پاکستان و ہند کا ایک قومی مشترک ادارہ اور مرکز ہے اس لئے حضرت مولانا رحمت اللہ مرحوم و مغفور بانی مدرسہ کے عہد سے آج تک وہ مکہ معظمہ میں مختلف صورتوں سے ابنائے ملک کی ہر ممکن خدمت کرنے، آرام و راحت اور سہولتیں پہنچانے اور مفید مشوروں سے رہنمائی کرتا رہا ہے۔ کارکنان دارالعلوم حرم صولتیہ حسب ذیل خدمات کو اپنے لئے سعادت سمجھتا ہے جو ابتک جاری ہیں۔

(۱) ڈاک:۔ اس طویل سفر میں ہر شخص اپنے اعزہ و احباب کی پر مسرت خبر خیریت کا منتظر رہتا ہے اپنی ڈاک اور خطوط قابل اطمینان صورت سے مکہ معظمہ میں حاصل کرنی چاہتا ہے۔ یہ کام کارکنان مدرسہ خود انجام دیتے ہیں۔ ٹکٹ، لفافے دفتر سے ملتے ہیں اور اس دفتر ہی سے روزانہ ڈاک جنرل پوسٹ آفس میں روانہ کیجاتی ہے۔ اور ڈاک مرکزی دفتر مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ، پوسٹ بکس ۱۱۴ مکہ معظمہ سعودی عربیہ۔ کے پتہ پر آتی ہے جہاں سے زائرین خود لیجاتے ہیں۔

(۲) امانت:۔ اس غیر ملک میں روپیہ کی حفاظت اور اس کی طرف سے بے فکری ایک اہم چیز ہے۔ مکہ معظمہ میں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے رقم مرکزی دفتر مدرسہ میں محفوظ کر کے ناظم صاحب سے رسید امانت حاصل کیجاتی ہے اور دفتر کے اوقات میں جتنی رقم امانت میں سے لینی چاہے وہ بہ آسانی مل جاتی ہے۔

(۳) طبی خدمت:۔ دوران قیام مکہ معظمہ میں اگر طبی امداد یا علاج کی ضرورت پیش آتی ہے تو مدرسہ صولتیہ کا طبی مرکز (صولتیہ دارالشفا) زائرین کی خدمت کیلئے تیار

رہتا ہے۔ یونانی، اور ہومیوپیتھک دوائیں بلا قیمت اور بغیر فیس و معاوضہ دارالشفاء کے اطبا کی خدمات حاضر رہتی ہیں۔ اور خاطر خواہ علاج ہوتا ہے۔

(۴) قیام کا انتظام: حج کی سالانہ تعطیل کے زمانہ میں مدرسہ صولتیہ میں حجاج کرام کے قیام کیلئے وقف کر دیا جاتا ہے۔ معقول معاوضہ کے ساتھ قیام کا انتظام ہوتا ہے۔ مدرسہ کی تمام عمارتیں اس زمانہ میں خالی رہتی ہیں قبل از وقت مرکزی دفتر کو اگر مطلع کر دیا جاتا ہے۔ تو عین وقت پر دقت نہیں ہوتی۔ حجاج کرام کا سامان محفوظ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ مدرسہ صولتیہ حرم شریف کے قریب ہے۔ حرم شریف پہنچنے میں کم وقت لگتا ہے۔

(۵) مسائل حج: حجاج کرام کیلئے اصل میں پانچ روز ہی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ منیٰ، عرفات، مزدلفہ، قربانی، شیطانوں کو کنکریاں مارنے کے ارکان و طریقے ان کے لئے جاننا انتہائی ضروری ہوتے ہیں۔ مدرسہ صولتیہ کی طرف سے ان چیزوں کی واقفیت کرانے کیلئے ایک چھوٹا پمفلٹ بعنوان "حج کے پانچ روز" تقسیم کیا جاتا ہے۔ جس سے ان لوگوں کو بڑا فائدہ ہوتا ہے اور غلطیوں سے کافی محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جو زائر مدرسہ صولتیہ میں مقیم ہوتا ہے اس کو ان مذکورہ سہولتوں کے علاوہ جو بھی ضرورت پیدا ہوتی ہے اس کے لئے مفید مشورہ دیا جاتا ہے اور تکمیل کی سبیل نکالی جاتی ہے جس کے لئے مولوی محمد شمیم صاحب نائب ناظم مدرسہ صولتیہ ہر وقت مستعد و تیار رہتے ہیں۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کے عہد کے بعد بھی اس مرکزی درسگاہ سے فیض اور دینی خدمت کا سلسلہ جاری ہے آج ۹۲ سال قبل فن تجوید و قرآت پہ بہت کم توجہ دیجاتی تھی۔ اور اس بناء پر یہ قابل قدر فن برائے نام تھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پاکستان و ہندکے طول و عرض میں جہاں کہیں فن تجوید کا سلسلہ اور قرات سبعہ کا چرچا دکھائی

دیتا ہے۔ یقیناً بالواسطہ یا بلاواسطہ وہ مدرسہ صولتیہ کا فیض ہے۔ مدرسہ صولتیہ کے تعلیم یافتہ طلباء جنہوں نے ہندوستان (قدیم) میں تجوید وقرات کی ترقی و تعلیم میں خاص حصّہ لیا انمیں خصوصیت کے ساتھ ذیل کے قاری صاحبان قابل ذکر ہیں ؎

(۱) مولوی قاری محمد سلیمان صاحب مرحوم بھوپال (۲) قاری سید حسن صاحب دجانہ ضلع رہتک
(۳) قاری عبدالرحمان صاحب مرحوم احیاء العلوم الہ آباد (۴) قاری عبدالخالق صاحب مدرسہ تجوید القرآن سہانپور
(۵) قاری ابراہیم رشید صاحب خطیب مکہ مسجد حیدر آباد (۶) قاری عبدالوحید خانصاحب مرحوم دارالعلوم دیوبند
(۷) قاری عبدالمالک صاحب مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ (۸) قاری فیض عالم صاحب گولڑا۔ راولپنڈی
(۹) قاری محمود یار صاحب بھوپال (۱۰) قاری مطیع اللہ صاحب ملتان۔
(۱۱) قاری میران شاہ صاحب مرحوم معلم تجوید دارالعلوم ندوہ لکھنؤ۔
(۱۲) مولانا قاری ضیاء الدین صاحب مہتمم مدرسہ باقیات الصالحات مدراس
(۱۳) قاری حمید الدین صاحب بانی مدرسہ تجوید سنبھل ضلع مراد آباد
(۱۴) مولوی قاری سید مرتضیٰ حسینی صاحب بمبئی

۱۹۳۵ء میں مشرقی جزائر (ملک جاوا سماترا) کے مسلمانوں میں علمی و تعلیمی ضرورت کا جو احساس پیدا ہوا تھا۔ یہ تمام فرزندان مدرسہ صولتیہ کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مدرسہ کے قدیم طلباء نے ملک جاوا کے مختلف مقامات میں پہنچکر مسلمانان جاوا سماٹرا کے جمود و سکوت میں خاص حرکت اور جوش عمل پیدا کیا۔ جس کی بناء پر دینی اور دنیوی تعلیم کا بہترین انتظام ہوا۔ مدارس کے علاوہ کئی مفید اور کار آمد انجمنیں اور جماعتیں ملک بھر میں قائم ہوئیں۔ جاوا میں فرزندان مدرسہ کی اس کثیر جماعت کے روح رواں اور ممتاز افراد حسب ذیل ہیں جنکی علمی اور عملی خدمات

؎ ایک مجاہد معمار ۶۲

کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں [۱]

(۱) شیخ محمود زہدی مشیر ریاست سلانگور
(۲) شیخ راج عثمان مفتی شہر کلاغ
(۳) شیخ عبدالمجید مہتمم مدرسہ جوہرین شہر جمبی
(۴) شیخ حسن یحیی۔ مہتمم مدرسہ نورالایمان شہر جمبی
(۵) کماس عبدالصمد۔ بانی مدرسہ نورالایمان جمبی
(۶) شیخ عبدالمجید ابوالحسن مدرس اوّل مدرسہ نورالایمان جمبی
(۷) شیخ عبداللہ مغربی مہتمم مدرسہ ادریسیہ کوالہ شہر فرا
(۸) شیخ محمد علی منصور اصدر مدرس مدرسہ ادریسیہ کوالہ فرا
(۹) شیخ ابوبکر بکرین۔ صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ فلمبان
(۱۰) شیخ محمد مرزوقی مفتی فلمبان۔
(۱۱) شیخ حامد قاری مہتمم مدرسہ عربیہ ہنجبر
(۱۲) قاری علاؤالدین بانی مدرسہ التجوید شہر فرا
(۱۳) شیخ زین الدین امبنان مدرس مدرسہ مدارالعلم امبنان
(۱۴) شیخ عبدالغنی مواری۔ بانی مدرسہ عربیہ شہر موار
(۱۵) شیخ عبدالرشید بن محمد طیب مہتمم مدرسہ فولو
(۱۶) شیخ محمود میدان شیخ عبدالحلیم خطیب بانیال مدرسہ عربیہ قلدح۔

مدرسہ صولتیہ کی تعریف میں ایک نظم

۲۹ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ کو مدرسہ صولتیہ کی مسجد میں ایک جلسہ ہوا جس میں مولوی نورالحسن صاحب بی اے وکیل عدالت ہردوئی اور مولوی محمد احسن صاحب فرخ آبادی جامعہ ازہری مصر نے اردو میں تقریر کی اور شیخ بکر خوفیز مکی اور سلیمان آفندی وکیل عدالت وایڈیٹر اخبار "ایکاظ" بصرہ نے عالمانہ مضمون عربی میں سنائے۔ قاضی جلیل الدین حسن حافظ آنریری مجسٹریٹ مدرسہ صولتیہ کی تعریف و توصیف میں حسب ذیل نظم پڑھی ؎

یہ صولتیہ مدرسہ ہے ایک بوٹا دین کا
پہلے یہ بوٹا تخم تھا مکے میں جو بویا گیا
بوتے ہی جلدی سے اگا رہکر جما، جمکر رہا

---

[۱] ندائے عام ۱۹۳۵ء ص ۳۰

مکے میں ہی پیدا ہوا　　مکے ہی میں پھولا پھلا

پھل پھول جو شاداب ہیں　　چھوٹے بڑے طلاب ہیں

سرچشمہ آداب ہیں　　مفتاح فتح باب ہیں

اختر ہیں عالمتاب ہیں　　عالم کی آب و تاب ہیں

انکی ضیاء انکی جھلک　　مکے سے پہنچی دور تک

سطح زمیں بام فلک　　فوق السماء تحت السمک

فردوس میں ان کی چمک　　تاروں میں ہے ان کی دمک

سرمہ ہے ان کی خاک پا　　تاریخ بزم بے بہا

۱۳۲۸ھ

سعودی عرب میں مدرسہ صولتیہ ہی ایک ایسا مدرسہ ہے جس کو قدیم مدرسہ کہا جاسکتا ہے اور اس کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے اس مدرسہ سے قبل سعودی عرب میں کوئی دینی مدرسہ ۱۸۷۴ء میں نہیں تھا۔ جس کو سعودی عرب کے مشہور و معروف مورخ و صحافی نے اپنی مشہور کتاب "من تاریخنا" میں سعودی صحافت کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔

لم یکن غریبا ان یکون هذا حال الصحافة فی بلاد لم یکن فیها مدارس للتعلیم سوی مدرسة واحد للحکومة یتلقی التلامیذ فیها مسوماً من المعلومات الاولیة باللغة الترکیة وسوی مدرسة اهلیة دینیة .. هی المدرسة الصولتیة ـ

اگر اس زمانہ میں ہمارے ملک کی صحافت اسقدر ابتدائی حالت میں اور نہ ہونے کے برابر ہو تو اس پر تعجب نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جب ملک میں مدارس ناپید ہوں تو صحافت کا کیا ذکر۔ صرف ایک سرکاری ابتدائی مدرسہ تھا۔ جس میں طلباء صرف ابتدائی معلومات ترکی زبان میں حاصل کرتے تھے۔ البتہ اس دور میں صرف باقاعدہ پبلک کا دینی "مدرسہ صولتیہ" تھا۔

تصنیف و تالیف

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے حسب ذیل کتب تصنیف فرمائیں جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) ازالۃ الاوہام (۲) ازالۃ الشکوک
(۳) اعجاز عیسوی (۴) احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث۔
(۵) بروق لامعہ (۶) البحث الشریف فی اثبات النسخ و التحریف۔
(۷) معدل اعوجاج المیزان
(۸) تقلیب المطاعن (۹) معیار التحقیق
(۱۰) اظہار الحق (۱۱) آداب المریدین

ان کتابوں میں میرے والد ماجد حضرت العلامہ مولانا شرف الحق صاحب کے کتب خانہ میں تین کتابیں ازالۃ الشکوک اعجاز عیسوی اور اظہار الحق ہیں۔ میں نے بیحد کوشش کی کہ بقایا کتب حاصل کرسکوں۔ لیکن افسوس مجھ کو اسمیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ ازالۃ الاوہام کا سرسری مطالعہ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں مولانا محمد سلیم صاحب

والله يهدي من يشاء الى صراط مستقيم
ازالة الاوهام

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِي بِهٖ مَنْ يَّشَاءُ

الحمد لله که کتاب مقدس مستطاب الهام انتساب مؤید بتائید روح القدس

نسخهٔ اعجاز چون وحی فلک آمده | کز کلماتش خرد عیسوی اعجاز دید

المسمّٰى باعجاز عیسوی

عهد عتیق و جدید نقض ز عنوانش یافت | حجت تحریف او و کوئی باخر رسید

الملقب بمصقلهٔ تحریف

سال شروعش بگفت حضرت روح القدس | مصقلهٔ تحریف در عهد عتیق و جدید ١٨٥٣

تصنیف جناب مولوی رحمت الله صاحب کیرانوی باهتمام بندهٔ محمد امیر خان عفی عنه

در مطبع منعمیه واقعه چهلی تیت محله اکبرآباد مطبوع شد

کے کرم و عنایت سے ہوا۔ جس میں سے ہیں اس کی تمہیدی عبارت صفحہ ۳ تا ۵ نقل کر سکا۔ جو یہ ہے۔

"مؤلف این رسالہ بخدمت کافہ اہل اسلام عرض سیاست کہ در ممالک انگریزی پادری صاحباں محض بہ تعصب اہلِ اسلام را رغبت ارتداد مید ہند و بہ شبہاتِ واہیہ کہ سست تر از تار ہائی خانۂ عنکبوت اند دلِ جاہلاں را در تردد می انداز بدو کدامی کہ قانون سرکار انگریزی مانع تحریر جواب این شبہات نیست بلکہ بعض از پادری صاحبان ہم در بعض تحریرات خود بزبان اُردو نگارش چنیں نمودہ اند کہ ترجمہ او بعبارت فارسی بطور خلاصہ آنکہ سرکار کمپنی در یا مذہب احدنے دخل نمیدہد و دریں باب نہ کسے را تعظیم و نہ کسے را تعذیب میکند پس محمدیاں و ھندواں بلا خوف و اندیشہ او ارو شبہات خود را بیاں کنند کہ صاحبان انگریز بدیں جہت ناراض نخواہند شد و حاکمان ملّت مسیحی چوں حاکمان ملت نبوی صلعم و در حقیقت ہمچنیں است کہ حکام وقت ہرگز دریں باب دخل نمی دہند مگر بنا بر بہ علمائی اسلام سہ عذر اند۔ اوّل تنگدستی باکثر اہل علوم بمتبلا بودن در فکر نان شبینہ برائے اہل و اطفال۔ دویم آنکہ چوں پادریان بسیار فقط برائے ہمیں کار منصوب اند و از ہیں حیلہ پرورش آل و اطفال خود نمی نمایند۔ در ہر سال از مضامین رطب و یابس چند اوراق کاغذ سیاہ نمودہ و نامی علیحدہ نہادہ یک دو رسالہ بظہور می آرند۔ گو در رسالہ جدید از رسائل مؤلفہ سابقہ سوائے تبدیل طرز تحریر امرے دیگر کہ معتد بہ بود نمی باشد پس رو کردن ہر رسالہ را علیحدہ علیحدہ جز تضیع اوقات چہ شمردہ شود

الحمد للہ کہ باوجود آن عذرہا تحریر جواب رسائل شروع شد و این فقیر ہم
حسبۃ للہ باوجود علم فرصتی متوجہ این امر گشت و در اندک مدت چہار
رسالہ تالیف کرد کہ یکے ازاں مسمی معدل اعوجاج المیزان بجواب
میزان الحق کہ تصنیف فانڈر صاحب قسیس کہ ہر آنچہ تحریر شاں
نسبت دیگر پادری صاحبان مناسب از علم در داشت و دیگر
بجواب حصہ اول کتاب تحقیق دین حق مسمی بہ تقلیب المطاعن ۔
و سیومی ازاں در اثبات رسالت آں سرور خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم
معہ جوابات چند اعتراض عمدہ این فرقہ مسمی بہ بروق لامعہ و چہارمی
ازاں این رسالہ مسمی با ازالۃ الاوہام است مراد را خصوصیت بجواب کسے
رسالہ خاص از رسائل این فرقہ نیست بلکہ خلاصہ اعراض از جمیع رسائل
نمودہ دریں جواب دادہ می شود۔ مگر جواب سہ شبہات کہ در بروق
لامعہ بخوبی مبرہن و جہت خوف طوالت درین رسالہ مندرج نگشتہ
ناظر اگر شوقی دارد و باو رجوع نماید“

ازالۃ الاوہام کا اردو ترجمہ دافع الاسقام کے نام سے مولانا نور محمد صاحب مہتمم مدرسہ
حقانی لدھیانہ بالاقساط اخبار منشور محمدی بنگلور میں شائع فرماتے تھے جس کا حسب ذیل
اشتہار ۲۵ رجب ۱۳۰۳ھ کے منشور محمدی کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ بطور ضمیمہ۔
”ازالۃ الاوہام : یہ کتاب عالم اجل و فاضل اکمل جناب مولوی محمد رحمت اللہ صاحب
کی تصنیف ہے جو ۱۲۶۹ھ ہجری میں چھپ چکی ہے اس کتاب کو دیکھنے کے لئے وہی
شخص بیچین ہوگا جو کبھی مولانا کی دوسری تصنیفات کے ایک آدھ ورق پر بھی نظر
دوڑایا ہو اس کے تمام و کمال خوبی کے عوض مختصر یہ ہے کہ مولانا نے ہر ایک مسئلہ کی
دلیل اور ہر ایک سوال کا جواب اس بسط اور تفصیل سے لکھا ہے کہ کہیں بیس بیس چالیس

چالیس دلیلیں اور حوالے دیگر بھی بس نہیں کی۔ اچھی طرح سے دروغگو کو اس کے گھر تک پہنچا دیا ہے اس خوبی اور اس بسط اور تفصیل سے ابتک کوئی تصنیف نہیں دیکھی گئی اس کتاب کے ۲۷۵ صفحہ ہیں اور تقطیع اخبار منشور محمدی کے برابر ہے۔ مگر یہ کتاب اب نہیں ملتی اور اتنی بڑی کتاب کا چھاپنا بھی ہر وقت ممکن نہیں یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اب جناب مولانا مولوی نور محمد صاحب مہتمم صاحب مدرسہ حقانی لودیانہ نے اس کتاب کا ترجمہ سلیس اُردو میں کر کے اخبار منشور محمدی میں چھپوانا شروع کیا۔ اور اس کا نام دافع الاسقام رکھا۔ چنانچہ اسّی صفحہ تک ہدیہ ناظرین ہو چکا ہے اس کی خوبی اور عمدگی دیکھکر علاوہ خریداران اخبار منشور محمدی کے اور صاحبوں نے بھی اس کتاب کی خریداری کی درخواست کی مگر چونکہ زاید نسخے نہ تھے اس لئے اس کی محرومی دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ یہ کتاب از سر نو علیحدہ چھپوائی جائے تاکہ ہر ایک شائق اس سے فیضیاب ہو اور کوئی محروم نہ رہے اور نیز مولانا ممدوح مترجم کتاب ہٰذا نے اس پہ جو در حاشیہ چڑھایا ہے وہ بھی شامل کیا جائے اور صحت میں بھی حتی الوسع کوشش ہو۔"

منشور محمدی کے وہ شمارے جن میں ازالۃ الاوہام کا ابتدائی حصّہ چھپا ہے میرے پیش نظر ہیں انہیں سے حسب ذیل اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"کید سویم عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ اہل اسلام یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی حالانکہ یہ محال ہے کیونکہ آسمان خرق والتیام کو قبول نہیں کرتا یعنی آسمان کا پھٹنا یا اس میں کھڑکی دروازہ سوراخ وغیرہ ہونا اور پھر جڑ جانا یہ سب باتیں غیر ممکن ہیں پس وہاں کوئی کیونکر جا سکتا ہے علاوہ اس کے اسقدر مسافت کا طے کرنا اور ایک ہی رات میں لوٹ آنا کیونکر یقین آسکتا ہے؟"

جواب۔ یونانی حکما جو خرق والتیام کے غیر ممکن ہونے کے قائل ہیں انکی دلیلیں

کامل نہیں چنانچہ اپنی جگہ پر ظاہر ہے علاوہ ازیں ان لوگوں کے قواعد سے سند پکڑنی محض لغو ہے۔ پولوس قرنتیوں کے پہلے خط کے تیسرے باب ۱۹ میں لکھتا ہے کہ اس جہان کی حکمت خدا کے آگے بیوقوفی ہے کہ لکھا ہے وہ حکیموں کو انہیں چترائیوں میں پھنساتا ہے اور یہ کہ خداوند حکیموں کے قیاس کو جانتا ہے کہ باطل ہیں انتہیٰ۔ اور اس سے قطع نظر اگر ان کی دلیلوں کے نتائج سچ ہوں لازم آئیگا کہ عالم قدیم ہو اور قیامت اور حشر اور نشر کا آنا بالکل باطل ہووے اور تعجب ہے کہ ان کے قواعد کو حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے میں کیوں لحاظ نہیں کرتے۔ اور شریعتوں میں سے کسی شریعت میں خرق والتیام کا ممتنع ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کا ثبوت سمجھا جاتا ہے اور متی کی انجیل کے تیسرے باب ۱۶ اور مرقس کے پہلے باب ۱۰ اور لوقا کے تیسرے باب ۲۱ و ۲۲ میں لکھا ہے کہ یسوع بپتسمہ پا کے انہیں پانی سے نکل کے اوپر آیا اور دیکھو کہ اس کے لئے آسمان کھل گیا۔ اور اس نے خدا کی روح کو کبوتر کے مانند اترتے اور اپنے اوپر آتے دیکھا انتہیٰ۔ بعبارت متی اور مرقس کے سولھویں باب ۱۹ میں لکھا ہے کہ خداوند انہیں ایسا فرمانے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا اور خدا کے داہنے ہاتھ بیٹھا انتہیٰ۔ اور یوحنا کے مکاشفات کے چوتھے باب میں لکھا ہے کہ بعد اس کے جو میں نے نگاہ کی تو دیکھو کہ آسمان پر ایک دروازہ کھلا ہے پھر کتاب پیدائش کے ساتھویں باب ۱۱ میں طوفان کے حال میں لکھا ہے کہ بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ انتہیٰ۔ اور پھر اسی کتاب پیدائش کے آٹھویں باب اور ۲ میں لکھا ہے کہ پانی ٹھہر گیا اور گہراؤ کے سوتے اور آسمان کی کھڑکیاں بند ہوئیں۔ اور اسی کتاب پیدائش کے اٹھائیسویں باب میں لکھا ہے کہ اس نے یعقوب علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ ایک سیڑھی زمین پر دھری ہے اور اس کا سر آسمان کو پہونچا ہے اور دیکھو خدا کے فرشتے اس پر سے چڑھتے اترتے ہیں۔ اور

وہ ہراسان ہوا اور بولا کہ یہ کیا ہے ڈرانا مقام ہے سو کچھ اور نہیں مگر خدا کا گھر اور آسمان کا آستانہ ہے۔ انتھی۔ اور سلاطین کی دوسری کتاب کے دوسرے باب ۱۱ میں ایلیا پیغمبر کے آسمان پر چڑھنے کے حال میں لکھا ہے کہ ایک آتشی رتھ اور آتشی گھوڑوں نے درمیان آکے ان دونوں کو جدا کر دیا اور ایلیا بگولے میں ہو کے آسمان پر جاتا رہا۔ انتھی۔ اور بنی اسرائیل پر خدا تعالیٰ کی مہربانیوں کے حال میں اٹھتر ویں زبور کے ۲۳ ویں ۱ٓس میں لکھا ہے کہ اس نے اوپر سے بدلیوں کو حکم کیا اور اس نے آسمان کے دروازے کھولے انتھی۔ ازالۃ الاوہام کی عبارت یوں ہے کہ "افلاک را از بالا فرمان داده بود و درہائے آسمان را باز کرده بود"۔ چونکہ آجکل کے نئے تعلیم یافتہ آسمان کے وجود کے منکر ہیں رفتہ رفتہ کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ آسمان کا ترجمہ کہیں بدلیوں اور کہیں بلندی کا کرتے جائیں گے۔ پس اگر خرق والتیام محال ہووے لازم آئیگا کہ آسمان کا پھٹ جانا اور اس کے دروازوں کا کھلنا اور حضرت عیسٰی علیہ السلام پر روح القدس کا اترنا اور ان کا اور ایلیا کا آسمان پر چڑھنا سب جھوٹے ہووے اور طوفان کے بارے میں توریت کی خبریں اور زبور کی خبر اور یوحنا کا مکاشفہ اور حضرت یعقوب‌ؑ کا خواب بھی باطل ہووے نعوذ باللہ من امثال ہذہ الخرافات علاوہ ازیں پولوس قرنیتون کے دوسرے خط کے بارہویں باب میں اپنے رسول ہونے کے بارے میں لکھتا ہے کہ بے شبہ اپنا فخر کرنا مجھے مناسب نہیں میں خداوند کی رؤیتوں اور مکاشفوں کا بیان کیا چاہتا ہوں کہ چودہ برس گذرے ہوں گے کہ وہ تیسرے آسمان تک یکایک پہونچایا گیا اور میں ایسے شخص کو جانتا ہوں اس نے وہ باتیں سنی جو کہنے کی نہیں اور جن کا کہنا بشر کا مقدور نہیں وہ یا تو بدن کے ساتھ کہ یہ مجھے معلوم نہیں یا بغیر بدن کے کہ یہ بھی مجھے معلوم نہیں خدا کو معلوم ہے انتھی۔ پس عیسائی لوگ جبکہ بعض عیسائی شخصیتوں کے حق میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں پھر نہیں معلوم کہ اہل اسلام

پر کیوں اس قسم کا طعن کرتے ہیں ظاہراً اس کا منشاء محض تعصب ہے ....."

کید چہارم :- عیسائی کہتے ہیں کہ اہل اسلام دعوی کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزہ سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا اور اس کا یقین نہیں آتا کیونکہ اگر یہ بات سچ ہوتی تو تمام فرقوں مثلاً ہندوؤں اور عیسائیوں وغیرہ کی کتابوں اور تواریخوں میں لکھا ہوتا نہ کہ فقط اہل اسلام کی کتابوں، اور سارے جہان میں دکھائی دیتا اور تفسیروں سے اقتربت الساعۃ وانشق القمر کے معنوں کے بیان معلوم ہوتا ہے کہ چاند کا پھٹنا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے جو اس دن ظہور میں آئیگا۔ اس لئے بیضاوی اس کی تفسیر میں ینشق القمر یوم القیمہ کہتا ہے یعنی قیامت کو چاند پھٹیگا پس اسکو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ جاننا قرآن شریف کا جھٹلانا ہے۔

جواب :- اگر یہ معجزہ عیسائیوں کے دفتر میں عناد کے باعث سے موجود نہ ہو اور علی ہذا القیاس ہندوؤں کے دفتر اس سے اس خبر کا جھوٹھ ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ حضرت مسیح کے تمام معجزے یہودیوں کی کتابوں میں کہاں لکھے ہیں بلکہ مخالف لوگ ایسی خبروں کے چھپانے اور باطل کرنے میں کوشش کرتے ہیں اور عناد کی جہت سے اگر بچشم خود بھی دیکھیں انکار کرتے ہیں اور اسے جادو وغیرہ کہتے ہیں کیا دیکھتے نہیں ہو کہ باوجود معجزوں کے دیکھنے کے یہودیوں نے کس قدر حضرت مسیح کے انکار کرنے میں کوشش کی اور جنوں دیوؤں کے نکالنے کو پریوں دیوؤں کے بادشاہ کی مدد سے جانتے تھے اور ابتک کہتے ہیں کہ بلاشبہ حضرت مسیحؑ کے خوارق عادات ناپاک روحوں کے وسیلے سے تھے اور جو تکلیفیں آنذات مصدر حسنات کو پہنچائیں اور ایسا ہی آنجناب کے حواریوں کو بھی جو اذیتیں اور تکلیفیں دیں حواریوں کے اعمال ناظرین پر پوشیدہ نہیں پس کسی خبر کا سچا ہونا مخالفوں کے دفتر میں درج ہونے پر موقوف نہیں اور اگرچہ یہ امر بدیہی اور ظاہر ہے لیکن اس

رسالہ کی عادت کے موافق مختلف واقعات مندرجہ کتب عہد عتیق وجدید کی چند مثالیں لکھتا ہوں جنکے واقع ہونے کی صورت میں ان حادثوں کا سارے جہان میں یا اکثر میں مشاہدہ ہونا اور دیکھا جانا ضروری ہے حالانکہ کتب مذکور کے سوا کسی فرقہ کی کتابوں میں ثابت نہیں۔

اوّل:- یہ کہ نوح علیہ السلام کے طوفان کی خبر کتاب پیدائش کے ساتویں اور آٹھویں باب میں مفصل مرقوم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چالیس دن اور چالیس رات زمین پر پانی کی جھڑی لگی رہی اور پانی بڑھ گیا اور کشتی زمین پر سے اٹھ گئی اور کشتی پانی کے اوپر بہتی رہی اور پانی زمین پر بے نہایت بڑھ گیا اور سب اونچے پہاڑ جو آسمان کے نیچے چھپ گئے پندرہ ہاتھ پانی ان کے اوپر بڑھا اور سب جاندار جو زمین پر چلتے تھے پرندے اور چرندے اور جنگلی جانور اور کیڑے مکوڑے جو زمین پر رینگتے تھے اور سب انسان مر گئے سب جنکی نتھنوں میں زندگی کا دم تھا ان میں سے جو خشکی پر رہتے تھے مر گئے۔ بلکہ سب موجودات جو روئے زمین پر جان رکھتی تھیں مٹ گئیں فقط نوح اور جو اس کے ساتھ کشتی کے اندر تھے بچ رہے اور پانی کی باڑ ڈیڑھ سو دن تک زمین پر رہی پھر آسمان سے مینہ تھم گیا اور پانی زمین پر سے رفتہ رفتہ گھٹ جاتا تھا اور ساتویں مہینے کی سترویں تاریخ کو اراراٹ کے پہاڑوں پر کشتی ٹک گئی اور پانی دسویں مہینے تک گھٹتا چلا جاتا تھا۔ اور دسویں مہینے کی پہلی تاریخ کو پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آئیں۔ انتھی۔

دوم - یہ کہ آفتاب کے ٹھہرنے کی خبر یوشع کی کتاب کے دسویں باب میں لکھی ہے کہ جس دن خدا نے اموریوں کو بنی اسرائیل کے آگے لا کے ان کے قابو میں کر دیا اس دن یشوع نے خداوند کے حضور بنی اسرائیل کے سامنے یوں کہا کہ اے

آفتاب جبعون پر ٹھہرا رہ اور اے مہتاب تو بھی وادی ایلون کے درمیان تب آفتاب کھڑا رہا اور مہتاب ٹھہر گیا یہاں تک کہ ان لوگوں نے اپنے دشمنوں سے انتقام لیا۔ کہ یہ کتاب الیاشر میں نہیں لکھا ہے۔ ازالۃ الاوہام میں اس کے بعد لفظ کہ بیانیہ لکھا ہے یعنے الیاشر کی میں جو کچھ لکھا ہے اس کی عبارت یا مضمون یہ ہے جو ۱۴ ادرس تک مرقوم ہے یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ یہ مضمون الیاشر کی کتاب میں سے نقل کر کے لکھا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کتاب کا مصنف یشوع نہیں ہے کیونکہ اپنا حال لکھتے ہوئے کسی کتاب کا حوالہ دینے کی کچھ ضرورت نہیں اس عیب کو چھپانے کے واسطے مرزاپور کی بیبل میں لفظ کہ کی جگہ اور لکھا ہے اگرچہ ابھی تک وہ مطلب حاصل نہیں ہوا جو پادری صاحب نے چاہا مگر دو تین کمیٹیوں میں آہستہ آہستہ کر لیں گے۔ اور آفتاب آسمان کے بیچوں بیچ ٹھہرا رہا اور قریب دن بھر کے پچھم کی طرف مائل نہ ہوا، اور اس سے آگے ایسا دن کبھی نہوا اور نہ اس کے بعد تھا۔ انتہی۔

سوم :۔ یہ کہ کتاب سلاطین کی دوسری کتاب کے بیسویں باب میں اور اشعیا کی کتاب کے اڑتیسویں باب میں لکھا ہے کہ جب خرقیا بادشاہ نے مرض مہلک میں جناب خداوندی سے اپنی شفا پانے کے لئے دعا مانگی اور اشعیا نبی کی معرفت اس کی قبولیت معلوم ہوئی تو پوچھا کہ میرے درست ہونے کی کیا دلیل ہے کہ خدا مجھے شفا بخشیگا اشعیا نے کہا کہ یہ نشانی ہے کہ اگر تو کہے سایہ دس درجہ آگے بڑھ جاوے اور اگر تو کہے دس درجہ پیچھے ہٹے خرقیا نے جواب دیا کہ یہ سایہ کا آگے بڑھنا ایک تھوڑی سی بات ہے پس اس طرح نہووے بلکہ سایہ دس درجہ پیچھے لوٹ جائے۔ اشعیا نے دعا کی اور سایہ کو دس درجہ پیچھے لوٹایا۔ انتہی۔ یسعیا کی کتاب میں اس طرح لکھا ہے چنانچہ آفتاب جن درجوں سے کہ ڈھل گیا تھا انہیں کے دس درجہ پر چڑھ گیا۔ انتہی

چہارم یہ کہ انجیل متی کے دوسرے باب میں لکھا ہے کہ مجوسی یورپ کی طرف سے جناب مسیح کا ستارہ دیکھ کر یروشلم میں آئے اور ہیرو بادشاہ سے اجازت لیکر یہودیہ بیت لحم کی طرف روانہ ہوئے اور وہ ستارہ ان کے آگے آگے جاتا تھا یہاں تک کہ جہاں وہ لڑکا تھا وہاں ٹھہر گیا۔

پنجم:۔ یہ کہ متی کے تیسرے باب میں جناب مسیح کیواسطے آسمان کا پھٹ جانا اور روح القدس کا کبوتر کی شکل بنکر آنجناب پر نازل ہونا لکھا ہے اور اس کی نقل مقدمہ کے دوسرے فائدہ میں گذر چکی اور تیسرے کید کے جواب میں بھی۔

ششم:۔ یہ کہ جناب مسیح کے مصلوب ہونے کے حال میں انجیل متی کے ستائیسویں باب ۵۱ اور مرقس کے پندرویں باب اور لوقا کے تیئسویں باب ۴۴ میں لکھا ہے کہ چھٹے گھنٹے کے قریب تھا کہ ساری زمین پر اندھیرا چھا گیا اور نون گھنٹے تک رہا اور سورج تاریک ہوگیا انتہٰی بلفظ لوقا اور دیکھو ہیکل کا پردہ وہ اوپر سے نیچے تک پھٹ گیا اور زمین کانپی اور پتھر تڑک گئے اور قبریں کھل گئیں اور بہت لاشیں پاک لوگوں کی جو آرام میں تھیں اٹھیں اور قبروں میں سے نکل کر اور مقدس شہر میں جاکر بہتوں کو نظر آئیں۔ انتہٰی۔ اور ان خبروں میں سے پہلے تین خبریں تمام یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک اور پچھلی تین خبریں تمام عیسائیوں کے نزدیک ثابت اور صحیح ہیں حالانکہ ان چھ خبروں میں سے کوئی سی بھی ہند کے کفاروں اور چین کے خطا کے کفاروں اور آتش پرستوں کے دفتر میں ثابت اور مرقوم نہیں بلکہ پچھلے تین خبروں کا یہودیوں کے دفتر میں بھی کوئی اثر اور نشان نہیں اور ہند کے کفار حضرت نوحؑ کے طوفان کے منکر ہیں حالانکہ طوفان نوح ایسا بڑا حادثہ ہے کہ برس روز کے قریب تک رہا....

اور وہ جو اعتراض کرتے ہیں کہ سارے جہاں میں دیکھا جاتا میں کہتا ہوں

اوّل تو سارے جہاں میں دکھلائی دینا کچھ ضروری نہیں کیونکہ احتمال ہے کہ بعض جگہ بادل ہوں اور کبھی چاند بعض جگہ ظاہر ہوتا ہے اور بعض جگہ ظاہر نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کو نظر نہیں آتا اور ایسا ہی گہن بعضے شہروں میں دیکھا جاتا ہے بعضے شہروں میں نہیں بعضے شہروں میں پورا گہن نظر آتا ہے اور بعضوں میں تھوڑا سا۔ بعضے شہروں میں جانتے بھی نہیں مگر جو لوگ علوم نجوم میں دخل رکھتے ہیں مگر باوجود اس کے کوئی قطعی اور یقینی دلیل سارے جہاں میں نظر نہ آنے کی نہیں بلکہ مسافروں نے ابوجہل کو خبر دی تھی اور ایسا ہی ملیبار کا راجہ اس زمانہ میں اسی معجزے سے ایمان لایا چنانچہ تاریخ فرشتہ کے گیارہویں مقالے میں اس کا حال لکھا ہے اس کی عبارت کا یہ ترجمہ ہے کہ سامری نے جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اپنے ملک میں چاند کا پھٹنا دیکھا اس امر کی تحقیق کے لئے معتبر آدمی اطراف و جوانب میں بھیجے بعدہٗ جب معلوم ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کر کے شق قمر کو منجملہ اور معجزات کے ایک معجزہ ٹھہرایا ہے۔ تب سامری کشتی پر سوار ہو کر ملک حجاز میں گیا اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کر کے مسلمان ہو گیا اور خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوا۔"

(۲) **ازالۃ الشکوک** یہ کتاب عیسائیوں کے انتیس ۲۹ سوالوں کا جواب ہے رمضان المبارک ۱۲۶۹ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس کی دو جلدیں ہیں جو ۱۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہیں۔

پہلی جلد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے شاگرد شمس العلماء مولانا عبدالوہاب صاحب ویلوری بانی مدرسہ باقیات الصالحات مدراس نے اپنے اہتمام اور اپنے صرفہ سے مطبع مجیدیہ واقع آڈیہ پاڈم گلی نمبر ۱۴ اور مطبع احسن المطابع مدراس میں ۱۳۲۶ھ میں چھپوائی جس کے ۸۰۶ صفحات ہیں۔ دوسری جلد مولانا عبدالوہاب صاحب

کے خلف ارشد مولانا ضیاء الدین محمد صاحب مہتمم مدرسہ نے اپنی نگرانی میں طبع کرائی اس جلد کے ۵۰۸ صفحات ہیں۔ ان دونوں جلدوں کی تصحیح وغیرہ خود مولانا عبدالوہاب صاحب نے شعبان ۱۲۸۵ھ میں مکمل کر دی تھی۔

اس کتاب کے تالیف کے اسباب ووجوہات کیا تھے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے ان کو اس کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرمائے ہیں۔

"بھائی مسلمانوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ ۱۲۶۸ھ ہجری مطابق ۱۸۵۲ء اٹھارہ سو باون عیسوی میں ایک قطعہ بتیس سوال کا جو دلی اور آگرہ وغیرہ ہما میں مشتہر ہوا تھا میری نظر سے گذرا اور پھر انہیں سوالوں کو ایک ہندی رسالے کے آخر میں مندرج پایا اور معلوم ہوا کہ مسیحیوں کی علت غائی اشتہار سے یہ ہے کہ کوئی انکا جواب لکھے اس پر میرے دل میں آیا کہ میں لکھوں لیکن جب دیکھا کہ وے سوال نئے نہیں بلکہ سائل نے انہیں قدیم سوالوں کو جو میزان الحق اور پادریوں کے رسالوں میں مندرج ہیں نقل کر لیا ہے اور ان کے جواب بخوبی ادا ہو چکے ہیں تو یہ دیکھ کر ان کے علیحدہ جواب لکھنے کو فضول سمجھ کر چپ ہو رہا مگر ۱۲۶۹ھ میں دو امر باعث ہوئے کہ ان کا جواب لکھوں۔ ایک یہ کہ بعض عیسائیوں نے ان سوالوں میں اصلاح دیکے اور چھ سوال اور بڑھا کے ان کو جناب مستطاب مرزا محمد فخر الدین ولی عہد بہادر کی خدمت بابرکت میں بھیجا اور جناب مفخم الیہ نے مجھ سے درخواست کی کہ ان کا جواب لکھوں اور ان کا امر ماننا پڑا۔ دوسرا یہ کہ میں نے سنا کہ وے حضرات پادری جو اس امر کی تنخواہیں پاتے ہیں اور اسی بات کی روٹی کھاتے ہیں کہ جاہلوں کو بہکاویں اور بھولے بھالوں کو پھسلاویں شور و غل مچاتے ہیں۔ کہ مسلمان لوگ جواب نہیں دے سکتے۔ پس ان دو امر کا لحاظ کر کے جواب کے لکھنے پر مستعد ہوا لیکن اس

لحاظ سے کہ جناب ولی عہد بہادر کا ایما یہ تھا کہ میں انتیس سوالوں کا جواب لکھوں جنکو بعض عیسائیوں نے ان کی خدمت میں بھیجا ہے اور حقیقت میں ان کا جواب جوان تئیس ۲۳ سوالوں مشتہرہ کا بھی بلا تفاوت جواب تھا تو انہیں انتیس ۲۹ کا جواب لکھا اور جو دے سوال بے ترتیب تھے تو میں نے ان کی ترتیب اس طرح کر دی کہ جو معجزات سے تعلق رکھتے تھے ان کو ایک جا اور جو قرآن سے متعلق تھے ان کو ایک جا۔ اور اسی قیاس پر اور جا ذکر کیا۔ لیکن مسائل کی عبارت میں کچھ تبدیلی عمل میں نہیں آئی بلکہ جیسی تھی ویسے ہی حرفاً حرفاً منقول ہوئی۔ اور خدا کے فضل سے اسی ۱۲۶۹ھ ہجری میں رمضان کے مہینے اس کی تحریر سے فراغت ہوئی اور فراغت کے بعد دلی میں اس کا چھپنا شروع ہوا۔ لیکن جو اسی عرصہ میں میرا جانا اکبر آباد ہوا اور مہتمم کی کچھ سستی کے سبب اور کچھ اس سبب سے کہ مسودہ سے کاتب بعض جا اچھا نہ پڑھ سکا اکثر غلط چھپتا تھا میں نے یہ معلوم کر کے وہاں سے لکھ کر چھپنا اس کا ملتوی اپنی مراجعت پر رکھا اور اکبر آباد میں مجھکو دو سبب سے کچھ عرصے تک رہنا پڑا ایک یہ کہ اسی جا میں نے کتاب اعجاز عیسوی کو کہ تحریف کے اثبات میں بہت ہی اچھی کتاب ہے اور ناظر کو بڑا فائدہ بخشتی ہے تالیف کی۔ دوم یہ کہ اس کی تالیف کے بعد میرا مباحثہ کشیس فنڈر صاحب میزان الحق کے مؤلف سے مجمع عام میں ٹھہر گیا اور یہ قرار پایا کہ جناب ڈاکٹر وزیر خاں صاحب میرا شریک اور پادری فرینچ صاحب میزان الحق کے مؤلف کے شریک رہیں اور دو روز متواتر مجمع عام میں وہ مباحثہ ہوا اور خدا کے فضل سے غلبہ ہماری طرف رہا جیسا کہ یہ حال ان لوگوں کے رسالوں سے جو مباحثہ کے جلسوں میں شریک تھے اور انہوں نے مباحثہ کی تقریر کو اپنے کانوں سے سنکر ضبط کیا ہے اکثر خلق پر ظاہر

باسمہٖ سبحانہٗ

وجعل کلمۃ الذین کفروا السفلیٰ وکلمۃ اللہ ہی العلیا

ازالۃ الشکوک

جلد اوّل

از تصنیفِ لطیفِ

عالم نحریر فاضل عدیم النظیر محقق لوذعی مدقق یلمعی رئیس متکلمین حامی دین متین آیۃ من آیات اللہ بابیہ حرمین شریفین الشیخ محمد رحمۃ اللہ الکرانوی ثم المکی قدس سرہٗ

حسبِ فرمانِ والاشان

فاضل اجل عالم اکمل شمس العلماء مولانا مولوی الحاج عبد الوہاب صاحب

مدظلہٗ العالی مادام الایام واللیالی

ابو الفضل ضیاء الدین محمد نے

مطبع مجیدیہ واقع آدیہ پادم گلی نمبر ۴۸ مدراس میں چھپوایا

قیمت جلد اول دو روپیہ

وجعل کلمة الذین کفروا السفلی وکلمة الله هي العلیا

الحمد للہ کہ مباحثہ جو سنہ حال مین اکبراباد کی اندر مجمع عام مین ہوا

تمام بڑی صحت سی اس رسالہ مین جو نام اوسکا

البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف

ہی مرقوم ہوکر سنہ ۱۲۷۰ ہجری ستہر

شاہجہان اباد مین مجز المطابع کے اندر

حافظ عبد اللہ کی اہتمام سی چھپا

بھی ہو گیا ہے اور جب میں اکبر آباد سے دلی میں پھر آیا اور جواب کا چھپنا جو ملتوی تھا
پھر مقرر ٹھیرا تو بعض احباب نے درخواست کی کہ ہمارے نزدیک یوں مناسب
ہے کہ تم ابطال التثلیث کو جو اس کے مقدمہ کے امر تیسرے میں مبین ہے
نکال کر اس کو رسالہ جداگانہ کر دو اور مواضع میں بقدر مناسب کے کچھ کچھ
بڑھا دو اور پھر از سر نو اوّل سے چھپواؤ۔ پس ان کی درخواست کے موافق میں نے
اس ابطال التثلیث کو اس سے نکال کر کچھ اسمیں اور بسط کر کے اس کو رسالہ
جداگانہ کر دیا اور نام اس کا احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث رکھا اور جواب
میں کہیں کہیں بقدر مناسب کے کچھ بڑھا کر از سر نو چھپوایا اور نام اس جواب کا
ازالۃ الشکوک ہے۔ اللہ اپنے فضل سے اس کو سب عام و خاص کی خاطر کا
مقبول کیجو۔"

عیسائیوں نے جو انتیس سوال قائم کئے تھے اور ان کا اس کتاب میں جواب
دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) معجزات محمدیؐ کس طور سے ثابت ہوں گے آیا قرآن شریف سے یا اور کتب سے۔

(۲) ثبوت ان کا قرآن ہی سے ضروری ہے کیونکہ معجزات اور انبیا کے ان کتابوں
سے ثابت ہیں۔

(۳) وہ معجزات جو قرآن میں مذکور ہیں آیا وہ معجزات ہیں بالطریق اظہار عظمت الٰہی
کے مرقوم ہیں اگر بطریق اخیر لکھے ہیں تو ان کو پیغمبر صاحب سے کیا تعلق ہے۔

(۴) کوئی کتاب پیغمبر کے اصحاب کی تصانیف میں سے ایسے موجود ہے جس میں
درباب معجزات کے کچھ لکھا ہو اگر ہے تو نام اسکا اور مصنف کا، اور یہ
امر کہ فلانی جگہ وہ کتاب موجود ہے اور کتنے اشخاص نے اسبات میں تحریر
کی ہے بتاؤ۔

(۵) اگر اور راویوں نے اصحاب کے اقوال میں سے کچھ لکھا ہے تو یہ سنکر لکھا ہے یا ان کے کتب میں سے، اگر نفس الامر میں ایسا ہی ہے تو ان کا لکھا کہاں ہے اور زمانہ راوی اور اقوال مذکورہ میں کیا تفاوت ہے۔

(۶) اگر شق القمر کو معجزا اقرار نہ دو تو کوئی اور معجزا جو چند اشخاص کے روبرو واقع ہوا ہو قرآن یا حدیث سے ثابت کر دو مگر اس میں یہ بات بھی ہو کہ راوی اس کا فلانے زمانے کا ہے یا یہ امر منقول ہے اور شہادتیں اس کی فلانے امور ہیں۔

(۷) قرآن میں لکھا ہے کہ پیغمبر کو معجزات کے اظہار کے لئے نہیں بھیجا بلکہ محض وعظ کے لئے اس صورت میں باوجود بے اختیاری کے ان سے اظہار معجزات کا کیونکر ہوا۔

(۸) یہ جو لکھا ہے کہ روز ولادت پیمبر کے آتشکدہ منطفی ہو گیا بت سب واژگوں ہو گئے یہ تحریر آیا کسی مخالف کی ہے یا موافق کی۔

(۹) شق القمر کس نے دیکھا اور جنھوں نے دیکھا آیا انہوں نے اپنی شہادت کو آپ قلمبند کیا یا وے ناقل محض تھے اور اوروں نے ان سے روایت کی ہے۔

(۱۰) اس کا کیا باعث ہے کہ انہوں نے خود نہ لکھا آیا وہ بے علم تھے۔

(۱۱) راوی اس کے کس عصر میں بعد پیغمبر کے تھے اس کے جواب میں زمانہ اس کا تحقیق کر کے لکھ دو۔

(۱۲) ان کی روایت کس طرح کی ہے کیا محض سنی ہوئی بات کو لکھا ہے۔

(۱۳) جامع قرآن فقط حضرت عثمانؓ ہیں یا ان سے سابق حضرت ابو بکرؓ بھی جامع ہوئے۔

(۱۴) قرآن میں منسوخ آیتیں کیوں ہیں۔

(۱۵) نسخ کا وعدہ کون سی آیت میں پایا جاتا ہے۔

(۱۶) قرآن اگلی کتب سماوی کے مخالف کیوں ہے۔

(۱۷) توریت اور انجیل کی تحریف کی دلیل کیا ہے۔

(۱۸) یہ تبدل کب ظہور میں آیا۔

(۱۹) قرآن سے ثابت ہے کہ پیغمبر کے وقت تک کلام مجید سابق میں کچھ تحریف نہوئی تھی بعد ان کے اگر ہوئی ہو تو ثابت کرو۔

(۲۰) کسی نے بچشم خود دیکھا کہ جبرئیل پیغمبر کے پاس وحی لاتا تھا۔

(۲۱) کتب تاریخ کی جنکا تواتر قرآن کی طرح ثابت ہو اصلیت کو مانوگے یا نہیں۔

(۲۲) کتب مذکورہ کی اصلیت میں شبہ کرنے سے کیا تم پر لازم نہ آویگا کہ قرآن کی اصلیت پر شبہ کرو۔

(۲۳) کتب مذکورہ اور قرآن کے اختلاف کی صورت میں کسے غلط کہوگے۔

(۲۴) جب قرآن اور تواریخ دونوں تواتر ثابت ہیں تو اب بتلائیے کہ دونوں میں شک کیجیگا یا تواریخ میں یا اقرار کیجئے گا کہ قرآن کے مصنف حالات قدیمہ سے آگاہی نہ تھے۔

(۲۵) اگر کوئی قرآن کو کلام اللہ تو مانے لیکن قرآن مروج کو جعلی اور محرف بتلاوے کیونکہ اسمیں نامعقول باتیں پائی جاتی ہیں تو اس کا جواب کیا دیجیگا۔

(۲۶) جو شخص نبوت کا دعوی کرے اور ایک کتاب بناکر کلام اللہ قرار دے اور کتب سابقہ متواترہ کو محرف کہے تو صدہا سال کے بعد اس کے معتقد کس وجہ سے تحقیق کرینگے کہ ان کی نبی والی کتاب اصلی ہے یا جعلی۔

(۲۷) اس نبی کے قول سے معتبر تاریخوں کا اعتبار جاتا رہیگا یا قائم رہیگا۔ یا دہریت پھیلے گی یا خدا پرستی۔

(۲۸) انبیا اور کلام الٰہی کا انکار اس پر مبنی ہے کہ کتب سابقہ متواتر جعلی ہیں یا اس پر کہ ایسی کتابیں اصل اور درست ہیں۔

(۲۹) ایک شخص بہت سی کرامات دکھلاتا ہے اور کہتا ہے کہ دو سو برس سے ہندوؤں میں ذاتوں کا رواج پڑا ہے اس صورت میں تاریخ اور تواتر کو باطل کہو گے یا اس شخص کو کاذب۔

مولانا صاحب نے پہلے سوال کے جواب میں قرآن مجید سے بیس تفصیلی اور دس اجمالی معجزوں کا ثبوت ان پر عیسائیو کے اعتراضات اور ان کے جوابات بڑی تفصیل و شرح و بسط کے ساتھ تین سو صفحات میں دئے ہیں۔

معجزہ معراج اور شق القمر کا ذکر ازالۃ الاوہام کے ضمن میں آچکا ہے۔ جن کے جواب مولانا صاحب نے معقول و مدلل دئے ہیں۔ یہاں ان معجزوں کا دوبارہ ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔ البتہ دو تفصیلی اور تین اجمالی معجزوں کا اقتباس ازالۃ الشکوک جلد اوّل سے نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) "آیتہ سترھویں سورہ انفال میں جو نویں سپارے کے سولھویں رکوع میں ہے یوں واقع ہوا۔ وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی۔ یعنی۔ اور تو نے نہیں .... پھینکی مٹھی خاک جس وقت پھینکی تھی لیکن اللہ نے پھینکی۔ اور حال اس کا یہ ہے کہ بدر کی لڑائی میں جب کفار نظر پڑے حضرتؐ نے دعا کی اس پر جبریل نے آکے کہا کہ ایک مٹھی خاک کی لیکے کفار کے لشکر کی طرف پھینکدو جب دونوں لشکر بھڑے اور لڑائی گرم ہوئی حضرتؐ نے ایک مٹھی خاک کی لیکر کفار کے لشکر کی طرف پھینکی اور فرمایا شَاهَتِ الْوُجُوْہُ۔ اللہ کی قدرت سے ہر کافر کی آنکھ میں وہ خاک پہنچی اور ان کی آنکھیں بھر گئیں اور اس سے خوف کھا کے بھاگے مسلمانوں نے پیچھا کر کے بہت کو قتل کیا اور بہت کو قید، اور جو ایک مٹھی خاک سے سب لشکر

کفار کی آنکھوں کا بھر جانا محال عادی اور قدرت بشری سے خارج ہے پس یہ ایک معجزہ ہوا اور حقیقت میں تین معجزوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو یہ اس مٹھی کی خاک سب کی آنکھوں میں پہنچی۔ دوسرا یہ کہ اس تھوڑی سی خاک سے سینکڑوں کفار کی آنکھیں بھر گئیں۔ تیسرا یہ کہ خوف کھا کر سب بھاگ اٹھے"

صاحب میزان الحق لکھتے ہیں۔ ان کلمات میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ محمدؐ نے فلاں فلاں معجزہ کیا بلکہ بے تعین اور بے تفصیل صرف اتنا ہی کہا ہے کہ تو نے نہیں ڈالا جس وقت ڈالا لیکن خدا نے ڈالا سو دانشمندوں کے نزدیک ایسے غیر معین لفظوں سے معجزہ ثابت نہ ہوگا ہاں مگر احادیث کے مضمون کے بموجب مفسرین یوں لکھتے ہیں کہ غزوہ بدر یا غزوہ حنین میں محمدؐ نے ایک مٹھی ریت کفار کے لشکر کی طرف ڈالی تھی۔ الخ

کہتا ہوں میں اس آیت سے بدلیل تار خطاب کی اتنا صراحۃً اور نصاً معلوم ہوے کہ ایک امر خارق العادت حضرتؐ کے ہاتھ سے بطریق رمی کے صادر ہوا۔ اور تعین اس کے احادیث صحیحہ اور تفاسیر ماثورہ معتبر سے یقینی ہے پس اعتراض مذکور صرف توہم ہے اور بس اور احادیث کا سند اور قابل دلیل کے ہونا دوسرے سوال کے جواب میں بیان کرینگے۔ پھر لکھتے ہیں اگر بالفرض ہم قبول کریں کہ وہ حدیث صحیح اور فی الحقیقت محمدؐ نے دشمنوں کے لشکر کی طرف ریت ڈالی تب بھی اس سے معجزہ ثابت نہ ہوگا الخ۔ کہتا ہوں میں یہ بات بہت ہی تعجب کی ہے کیونکہ جب پادری صاحب نے اس حدیث کو جو مفسرین نقل کرتے ہیں صحیح مان لیا۔ اس حدیث میں صاف مرقوم ہے کہ جبرئیلؑ کے کہنے کے موافق حضرتؐ نے وہ مٹھی پھینکی تھی اور اللہ کی قدرت سے ہر کافر کے آنکھ میں جو مخالف لشکر میں تھا اس ریت میں سے کچھ کچھ پہنچا تھا تو کون عقلمند ہے کہ نہ کہیگا کہ یہ امر موافق

دھی کے تھا اور ہر کافر کی آنکھ میں اس سے کچھ کچھ پہنچا اور پیغمبرؐ کا معجزہ ٹھہرا اور وہ حدیث جو مفسروں نے نقل کی ہے وہ بیضاوی کی ہے ؎ ترجمہ اس کا یوں ہے۔

مروی ہے کہ جب نکل آئے قریش ریت کے تودہ سے۔ فرمایا حضرت نے یہ قریش ہیں جو آئے ہیں غرور اور فخر کیساتھ، جھٹلاتے ہیں رسول تیرے کو، اے خدا میں تجھ سے مانگتا ہوں وہ چیز جس کا تو نے وعدہ کیا تھا پس آئے جبرئیل حضرتؐ کے پاس اور کہا ان کو لے تو ایک مٹھی خاک کی پس پھینک ان کی طرف پس جب ملے دونوں لشکر، لی حضرت نے ایک مٹھی کنکریوں اور خاک کی پس پھینکا اس کو ان کے موہنوں کی طرف اور فرمایا بگڑ جاویو یہ موہنہ پس نہ رہا کوئی مشرک کہ نہ پہنچی ہو اس کی آنکھ میں، پس بھاگ اٹھے اور مسلمانوں نے انکا پیچھا کر کے ان کو قتل اور گرفتار کیا پھر جب پھرے مسلمان فخر کرنے لگے پس کہتا تھا ہر ایک کہ میں نے مارا اور گرفتار کر لیا۔ اور اس پچھلی بات سے اللہ صاحب نے مسلمانوں کو روکا جیسا اُسی آیت میں مذکور ہے فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم یعنی سو تم نے انکو نہیں مارا لیکن اللہ نے ان کو مارا۔ صلہ

(۲) جب قریش کا قافلہ شام کے ملک سے ہٹا اور اس کے ساتھ تجارت کا مال بہت تھا اور چالیس سوار تھے جبرئیلؑ نے اس کے پھرنے کی خبر دی اس پر حضرتؐ نے ارادہ کیا۔ اور جب اس ارادہ کی خبر مکہ والوں کو پہنچی ابو جہل لوگوں کو جمع کر کے لڑائی کے ارادے سے نکلا اور جبرئیلؑ نے حضرت کو آکر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دو جماعتوں سے ایک جماعت کا وعدہ کیا ہے چاہو قافلے والوں کا مال لو اور چاہو اس کافروں کے لشکر پر جو قافلے کی مدد کو آتا ہے فتحیاب ہو حضرتؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا انہوں نے اپنی قلت اور بے سامانی پر نظر کر کے قافلے پر عزم کی صلاح دی

؎ تفسیر بیضاوی کی عربی کی عبارت کتاب سے نقل نہیں کی گئی۔ ترجمہ پر اکتفا کیا ہے۔

حضرتؐ کو یہ صلاح پسند نہ آئی اس پر بڑے بڑے صحابیوں نے مہاجرین اور انصار سے عرض کیا کہ حضرتؐ کی رائے بہتر ہے اور ہم دشمنوں کے مقابلے پر راضی ہیں۔ حضرتؐ نے کوچ کیا اور جب بدر میں پہنچے حضرت نے ستر کافروں کے مارے جانے کی جگہ جدی جدی ہاتھ رکھ کر معین کر دی اس طرح پر کہ اس جا ابوجہل مارا جائے گا اور اس جا فلانا اور اس جا فلانا و علیٰ ہذا القیاس۔ انسؓ کہتے ہیں کہ جس جگہ پر پیغمبرؐ نے ہاتھ رکھ کر اس کو مقتل کافر کا فرمایا اسی جگہ پر وہ کافر مارا گیا۔ چنانچہ اسکی تفصیل حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں مسطور ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس اپنے وعدہ کو جو جبرئیلؑ کی معرفت فرمایا تھا اور صحابہ کے حال کو سورہ انفال کی ساتویں آیت میں یوں ارشاد کیا ہے۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ٥	یاد کرو اسکو جس وقت وعدہ دیا تھا تمکو اللہ نے دو جماعت میں سے (یعنی قافلہ اور کافروں کے لشکر سے) کہ ایک تمکو ہاتھ لگے اور تم چاہتے تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ سچا کرے سچ کو اپنے کاموں سے اور کاٹے پیچھا کافروں کا۔

سو اللہ تعالےٰ نے جیسا وعدہ فرمایا تھا ویسا ہی کیا جیسا اوپر گذرا (ص ۹۵)

معجزات اجمالی کے تین ثبوت۔

(۱) سپارے تیئیسویں کے رکوع پانچویں میں سورہ صافات کی تیرھویں اور چودھویں آیت یوں ہے۔

وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً	جب دیکھیں (یعنی مکے کے مشرک) کوئی

يَسْتَسْخِرُوْنَ ٥ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ٥	معجزہ جو تیری نبوت پر دلالت کرتا ہے ہنسی میں ڈالدیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں اور کچھ نہیں یہ (یعنے جس کو ہم نے دیکھا) مگر جادو ہے کھلا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکے کے مشرک جب کوئی معجزہ دیکھتے تھے شقاوت ازلی سے ہنسی میں ڈالدیتے تھے اور کھلا جادو بتلاتے تھے اور ان کی یہ ہنسی رسول اللہؐ کے معجزات کی نسبت ایسی تھی جیسے فرعون اور اس کے تابعین کی ہنسی معجزات موسویہ کی نسبت۔ چنانچہ اللہ صاحب نے سپارے پچیسویں رکوع گیارہ میں سورہ زخرف کی سینتالیسویں آیتہ میں اسکو یوں نقل کیا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ٥	پھر جب لایا موسیٰ ان کے پاس ہماری نشانیاں (یعنے معجزات مثل عصا وغیرہ کے) تو لگے ان پر ہنسنے۔

اور ان مشرکوں کا یہ قول ان ھذا الا سحر مبین رسول اللہؐ کے معجزات کی نسبت ایسا تھا جیسا کفار بنی اسرائیل کا قول حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کی نسبت جس کو اللہ صاحب نے سپارے ساتویں رکوع پانچویں میں سورہ مائدہ کے ایک سو نیرھویں آیتہ کے اندر نقل کیا ہے۔

فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ٥	تو کہنے لگے جو کافر تھے ان میں یعنی بنی اسرائیل میں اور کچھ نہیں یہ جادو ہے صریح۔

اور یہ بات کہ کافر لوگ سچی بات کو اور سچے امر کو ہنسی میں ڈالدیتے ہیں انجیل سے بھی ثابت ہے دیکھو جب حواریوں پر مسیحؑ کے عروج کے بعد روح القدس اترا اور وے مختلف بولیاں بولنے لگے اس پر بعضے ہنسی اور مسخراپن سے کہتے تھے کہ شراب کے نشے میں ہیں

اعمال کے دوسرے باب کی تیرھویں درس میں ہے فارسیہ ۱۸۱۶ء ۱۸۲۸ء ۱۸۴۱ء ۱۸۴۲ء بعضے استہزا کناں می گفتند کہ ایشاں از شراب تازہ مملو شدہ اند ۲۰۴۔

(۲) سپارے ستائیسویں کے رکوع آٹھویں میں سورہ قمر کی دوسری آیت یوں ہے۔

وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ○	اور اگر دیکھیں کوئی نشانی ٹال دیں اور کہیں یہ جادو ہے چلا آتا۔

یعنی ٹانکے کہنے لگتے ہیں کہ یہ بھی ایک ایسا جادو ہے جیسے اور جادو اس نے ہم کو آگے دکھلائے ہیں اس آیتہ کے موافق بھی معلوم ہوتا ہے کہ کافروں نے رسول اللہ کے کئی معجزے تو دیکھے ہیں جس کے سبب پچھلے معجزے کو کہتے ہیں کہ اور اگلے جادوؤں کی طرح یہ بھی ایک جادو ہے۔

(۳) سپارے ستائیسویں کے رکوع دوسرے میں سورہ ذاریات کی آیت باونویں یوں ہے۔

کَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۔	اسی طرح (یعنی جیسے تجھکو تیری قوم جادوگر اور دیوانہ کہتی تھی اسی طرح) ان سے پہلوں کے پاس جو آیا رسول یہی کہا کہ جادوگر ہے (جب اس کا کوئی معجزہ دیکھا) یا دیوانہ

اس آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے معجزے تو دیکھے لیکن ان کو جادوگر بتلایا جیسے اگلے انبیا کے معجزات کو ایسا ہی بتلایا ہے اور اسی سورہ کے ۳۸۔ ۳۹ آیات میں حضرت موسیٰؑ کا حال یوں مرقوم ہے۔

وَفِیْ مُوْسٰى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ	اور نشانیاں ہیں موسیٰ کے حال میں

اِلٰی فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِیْنٍ ۝ فَتَوَلّٰی بِرُکْنِہٖ وَقَالَ سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝	(ڈرنے والوں کے لئے) جب بھیجا ہم نے اس کو فرعون کے پاس دیکر سند (یعنے عصا وغیرہ) پھر اس نے مونھ موڑا اپنے زور پر اور بولا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ۔

اور موضع دوسرے میں گذرا کہ یہود حضرت مسیحؑ کو دغاباز بتلاتے تھے اور اس انجیل میں مصرح ہے کہ ان کو دیوانہ بھی بتلاتے تھے مثلاً یوحنا کے دسویں باب کے بیسویں درس میں ہے ہندیہ ۱۸۱۴ء ۱۸۴۶ء اور بہتیرے انمیں (یعنی یہودیوں میں) سے بولے اس کی (یعنی عیسٰیؑ کے) ساتھ دیو ہے وہ دیوانہ ہے تم اس کی کیوں سنتے ہو۔ اور حق یہ ہے کہ جب آدمی کا دل کفر یا غرور یا شہوات نفسانیہ سے بھرا ہوتا ہے گو وہ عاقل ہی تو اس کو وے سب باتیں جو اس کے عقیدے اور مرضی کے مخالف ہوتی ہیں بیہودگی اور دیوانگی نظر آتی ہیں گو نفس الامر میں کیسے ہی اچھی اور حق ہوں۔ چنانچہ یہی بات قرنتھیوں کے نامہ اوّل باب کے تیئیسویں درس اور باب دوم کے چودھویں درس اور اعمال کے چھبیسویں باب کے چوبیسویں درس سے سمجھی جاتی ہے ؁۱۸۷۰ عیسائی مشنریوں کا دن رات یہی کام تھا کہ قرآن مجید اور احادیث نبوی کا مطالعہ کریں اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے قرآن مجید اور احادیث نبوی کو غلط طریقوں سے پیش کریں۔ چنانچہ ساتواں سوال بھی اسی قسم کا تھا۔ جس سے ذہن گمراہ کیا جا سکتا تھا جو یہ تھا۔

"قرآن میں لکھا ہے کہ پیغمبرؐ کو معجزات کے اظہار کے لئے نہیں بھیجا بلکہ محض وعظ کے لئے اس صورت میں باوجود بے اختیاری کے ان سے اظہار

معجزات کا کیوں کر ہوا؟

چونکہ مولانا رحمت اللہ صاحب عیسائیوں کی کتابوں اور ان کی تحریروں سے پوری طرح آگاہ تھے اور ہر مسئلہ سے پوری طرح واقف تھے اس لئے ان کو انہی کی مقدس والہامی کتابوں کے حوالے دیکر قائل کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ مولانائے محترم نے اس سوال کا جواب اسی انداز سے دیا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

پہلے سوال کے جواب میں مشروحاً بیان ہو چکا کہ قرآن حضرتؐ کے معجزے تفصیل اور اجمال کی راہ سے ثابت ہیں اور دونوں طریقوں سے ان کے ثبوت میں شک نہیں اور قرآن کی کسی آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ رسول اللہؐ سے کوئی معجزہ صادر نہیں ہوا یا ہوگا۔ ہاں بعضی آیتوں میں بعضے ان خاص معجزات جن کو کافر لوگ محض عناد سے ہٹکر کے طلب کرتے تھے انکار مذکور ہے کہ انہیں کو پادری لوگ جاہلوں کو مغالطے دینے کو پیش کیا کرتے ہیں شاید سائل نے بھی انہیں بعضی آیات میں کسی آیت سے ٹھوکر کھائی ہوگی جو اپنے زعم میں معجزات کی نسبت ذاتِ رسالتؐ کو ایسا سمجھا اور عنقریب واضح ہو جائیگا کہ ان آیتوں سے تمسک پکڑنا اور ان کو معجزے کی نفی کی دلیل سمجھنا غلط ہے اور یہ امر ایسا ہے کوئی آدمی انجیل کے بعضے درسوں سے تمسک پکڑے کہ جناب مسیح سے بالکل معجزا صادر نہیں ہوا اور اسی طرح حواریوں کی کرامات کے ظہور کا بیان ہوا ہے نظر سے ڈالے اور ناظر کی تنبیہ کے لئے ایسے آٹھ موضع انجیل کے نقل کرتا ہوں۔ ص ۵۸۶۔)

پہلا موضع: مرقس کے انجیل کے آٹھویں باب میں ہے نسخہ ۱۸۳۹ء سنہ ۱۸۴۰ء ۱۸۴۲ء ۱۸۴۶ء تب فردوسی نکلے اور اس سے حجت کر کے اس کے امتحان کے لئے کوئی آسمانی نشانی طلب کیا۔ اس نے دل سے آہ مار کے کہا

اس زمانے کے لوگ کیوں نشان طلب کرتے ہیں میں تم سے سچ
کہتا ہوں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان دکھایا نہ جائیگا
اور وہ اس سے جدا ہو کے پھر کشتی پر چڑھ کے پار گیا اور
یہ جملہ میں تم سے سچ کہتا ہوں اور ترجموں میں یوں ہے فارسیہ
۱۸۱۶ء ۱۸۲۸ء ۱۸۴۱ء ۱۸۴۲ء بدرستیکہ بہ شما میگویم کہ ہیچ آیت
باین طبقہ دادہ نخواہد شد...... دیکھو جناب مسیحؑ نے فروسیوں کو حجت اور امتحان
کے طور پر کوئی آسمانی معجزہ مانگتے تھے نہ کوئی معجزہ دکھلایا اور نہ کسی اپنے اگلے معجزے
کا حوالہ دیا بلکہ الٹا ایسا قول فرمایا کہ جس سے ظاہر میں یوں سمجھا جاتا ہے کہ
اس فرمانے کے بعد جناب مسیحؑ سے کوئی معجزہ کسی کے سامنے صادر
نہوا ہو اس لئے یہ الفاظ اس زمانے کے لوگوں کو جناب مسیحؑ کے سب
ہم عہدوں کو کیا یہودی کیا غیر یہودی شامل ہیں اور اسی طرح یہ الفاظ
کوئی نشان یا ہیچ آیت ہر معجزے کو جو کسی طرح کا ہو شامل ہیں اور اس قول کے
ظاہر کے موافق لازم آتا ہے کہ بعض معجزات کا صدور جو مرقس نے اس کے بعد
نقل کیا ہے صحیح نہیں وگرنہ یہ قول میں تم سے سچ کہتا ہوں الخ سچ نہوگا پس
اس سے معلوم ہوا کہ کبھی پیغمبر لوگ ایسے منکروں کو جن کی حجت اور امتحان
ہو معجزہ نہیں دکھلاتے اور نہ ان کے جواب میں کسی اپنے معجزے پہلے دکھلائے
ہوئے کا حوالہ دیتے ہیں۔ بلکہ الٹا ایسا انکار کرتے ہیں کہ ظاہر میں اوس سے
دوام کے لئے سمجھا جائے (ص ۷۷۵)

دوسرا موضع: لوقا کے انجیل کے تیسویں باب میں ہے نسخہ ۱۸۳۹ء ۱۸۴۰ء
۱۸۴۴ء ۱۸۴۶ء ہیرود یسوع کو دیکھ کے بہت خوش ہوا کیونکہ وہ بہت دن
سے اسے دیکھنا چاہتا تھا کہ اس نے اس کی بہت سی باتیں سنی تھیں اور اس

امید میں تھا کہ اس کے کسی معجزے کو دیکھے اس نے اس سے بہتیرے سوال کئے
پر یسوع نے اس کو کچھ جواب نہ دیا اور سردار اماموں اور کاتبوں نے کھڑے ہو کے
اس پر بہت سی نالشیں کیں۔ تب ہیرود اور اس کے لشکر نے اسے حقیر کر کے
ٹھٹھا کیا اور یہ جملہ اور اس امید میں تھا کہ اس کے معجزے کو دیکھے اور یہ جملہ
پر یسوع نے اسکو اخ اور ترجموں میں یوں ہے فارسیہ ۱۸۱۶ء ۱۸۲۸ء ۱۸۴۱ء
۱۸۴۲ء امیدوار بود کہ از و معجزہ دیدہ باشد داد مطلقاً جوابش نداد ......
دیکھو اس عبارت کے موافق جناب مسیح نے ہیرود کو باوجودیکہ ان کے
دیکھنے سے بہت خوش ہوا تھا اور امیدوار اور مشتاق تھا کہ معجزہ دیکھے۔
کوئی معجزہ نہ دکھلایا بلکہ اس کے کسی سوال کا جواب بھی نہ دیا کہ اس پر اس
مردود نے اور اس کے لشکر نے جناب مسیح کو حقیر سمجھا اور ٹھٹھا کیا اور اغلب
یہ تھا کہ اگر کوئی معجزہ دیکھتا تو وہ اور اس کا لشکر اس بے ادبی سے باز رہتا
اور نالشوں کو الزام دیتا پس اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ کبھی انبیا علیہم السلام
باوجود اشتیاق اور امید منکروں کے ان کو معجزہ نہیں دکھلاتے گو اس پر ان کی
بے عزتی بھی ہو جاوے۔ اور کافر استہزا سے پیش آویں۔

تیسرا موضع۔ متی کے انجیل کے چوتھے باب میں ہے نسخہ ۱۸۳۹ء
۱۸۴۰ء ۱۸۴۴ء ۱۸۴۶ء تب امتحان کرنے والے نے آس پاس آ کر
کہا اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو کہہ کہ یہ پتھر روٹی بن جاویں اس پر اس نے اس کے جواب
میں کہا کہ لکھا ہے آدمی خالی روٹی سے نہیں بلکہ ہر حکم سے جو خدا کے منہ سے
نکلتا ہے جیتا ہے اس وقت شیطان اسے شہر مقدس میں لے گیا اور بڑی
عبادت گاہ کے کنگرے پر کھڑا کر کے اس سے کہا اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو آپ کو
نیچے گرا دے کہ یوں لکھا ہے وہ اپنے فرشتوں کو تیرے لئے حکم کریگا اور وے

تجھے ہاتھوں پر اٹھالینگے تا ایسا نہو کہ تیرا پاؤں پتھر پر لگے۔ تب یسوع نے اس سے کہا یہ بھی لکھا ہے کہ تو اللہ کو جو تیرا خدا ہے امتحان مت کر۔ دیکھو اس عبارت کے موافق جناب مسیح نے شیطان کے جواب میں دونوں امر خارق للعادت کے دکھلانے سے جس کا وہ طالب تھا۔ انکار کیا اور دوسرے میں عبودیت کے مقتضیٰ کے موافق یہ بھی فرمایا کہ بندے کو لایق نہیں کہ خدا کا امتحان کرے اور یہ حق ہے اور اس میں نبی اور غیر نبی برابر ہیں اور حضرت موسیٰ بھی کتاب تثنیٰ کے چھٹے باب کے سولہویں درس میں کہ جناب مسیح بھی غالباً اسی کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ فرما گئے ہیں۔ نسخہ سنہ ۱۸۲۲ء سنہ ۱۸۲۹ء تم یہواہ اپنے خدا کو مت آزمائیو الخ ص۵۰۸

ازالۃ الشکوک کی پہلی جلد میں بارہ سوالوں کے جواب دئے گئے تھے بقایا سترہ سوالوں کا جواب دوسری جلد میں مرقوم ہے۔ دوسری جلد میں اکبر آباد کے دو مناظروں کے واقعات و حالات بھی مولانا رحمت اللہ صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ اور بڑے مناظرے سے جو اثرات مرتب ہوئے تھے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور خاص طور پر اکبر آباد کے چھوٹے مناظرہ کا حال تو اس کتاب کے علاوہ کسی اور کتاب میں ملتا نہیں۔ جس کے ضروری اقتباس "آثار رحمت" میں نقل ہوئے ہیں۔

انیسواں سوال ہے:۔

"(کیا) قرآن کی رو سے ثابت ہے کہ پیغمبر کے وقت کے کلام مجید سابق (توریت انجیل) میں کچھ تحریف ہوئی تھی بعد ان کے اگر ہوئی تو ثابت کرو"

مولانا رحمت اللہ صاحب اس کا تفصیلی جواب مناظرہ اکبر آباد میں دے چکے ہیں۔ اس کتاب میں بھی اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"..... قرآن کی بعض بعض آیتوں میں تصریح ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے

پہلے بھی تحریف ہوئی سورہ بقر کی ۵، ۷ آیت میں ہے۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ٥

اب کیا تم مسلمان توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات، اور ایک لوگ تھے ان میں کہ سنتے تھے کلام اللہ کا، پھر اس کو بدل ڈالتے بوجھکر۔ اور ان کو معلوم ہے کہ جھوٹے افترا باندھتے ہیں۔

سو جب ان کے سلف کا یہ حال ہو تو ان سے تحریف کا ہونا کیا تعجب ہے اسمیں دیکھو کہ اس بات کی تصریح ہے کہ اہل کتاب کے سلف کا ایک طبقہ تحریف کیا کرتا تھا۔ اگر خلف بھی کریں تو کچھ تعجب نہیں۔ (۴۸۹)

ایک دلچسپ سوال عیسائیوں کی طرف سے یہ تھا۔ کہ جس کا بیسواں نمبر ہے۔

کسی نے بچشم خود دیکھا ہے کہ جبرئیل پیغمبرؐ کے پاس وحی لایا تھا۔ اور اگر کسی نے دیکھا ہے تو گواہی اس کی کہاں ہے۔

جواب: اوّل تو دیکھنا کسی اور شخص کا جبرئیل یا اور فرشتے حامل وحی کو ضرور نہیں، بلکہ اس امر میں اس نبی کا جس کی نبوت، سچی دلیلوں سے ثابت ہوتی ہو فقط فرما دینا کفایت کرتا ہے۔ حزقئیل کی کتاب کے پہلے باب میں اس وحی کے بیان میں جو پہلے نہر خابور کے کنارے حزقئیل پر اتری تھی یوں ہے نسخہ ۱۸۴۳ء اور میں نے نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اتر سے ایک طوفان آیا ایک بڑا بادل اور آتش پیچان، اس کے گرد روشنی چمکتی تھی اور اس کے بیچ میں سے یعنی اس آتش میں سے کہربائی دکھلائی دیا۔ اور اس کے بیچ سے

چار جانداروں کی ایک صورت نظر آئی اور یہ ان کی شکل انہیں انسان کی قامت تھی اور ان کے سروں پر آسمان کا سا فلک تھا جو مہیب بلور کی مانند دکھائی دیا وہ اوپر ان کے سروں کے پھیلا تھا اور ان کے سروں پر کے فلک کے اوپر سنگ نیلم کی مانند ایک تخت کی صورت دکھائی دی اور اس تخت کی صورت پر انسان کا سا قالب اوپر اس پر نظر آیا۔ اور جو قالب دیکھنے میں آیا سو کہربا جیسا بلکہ آگ سا بھیتر وار اور گرداگرد تھا اور اس قالب کی کمر سے اوپر تک اور اس قالب کی کمر سے نیچے تک سارا اندام آگ کا سا میرے دیکھنے میں آیا۔ اور جلال اس کے گرد چمکتا تھا۔ وہ خداوند کے کبریا کی صورت کی نمائش تھی اور دیکھتے ہی میں اوندھے منہ گرا اور بولنے والے کی آواز سنی اور اسی کتاب حزقیل کے تیسرے باب کے ۲۳ درس میں ہے نسخہ ۱۸۴۳ء تب میں اُٹھ کے وادی میں گیا اور کیا دیکھتا ہوں کہ خداوند کا کبریا اس کبریا کی مانند جو میں نے نہر خابور کے پاس دیکھا تھا کھڑا ہے اور میں منہ کے بل گرا۔ دیکھو یہ عجیب و غریب ماجرا حزقیل کے سوا اور کسی شخص نے نہیں دیکھا اور یوحنا کے مشاہدات میں اس قسم کی باتیں کثرت سے ملینگی اور وہاں بھی یوحنا کے سوا کسی اور نے نہیں دیکھا۔ بلکہ حضرت موسیٰؑ کے سوا اور انبیاء پر بلا کیا۔ پیغمبر تک اگر فرشتہ حامل وحی آیا ہے۔ اس کو ان انبیا کے سوا ابتلاؤ کس نے دیکھا ہے اور اسباب میں جیسا ارشاد ان انبیا کا تقریر یا تحریر کے ذریعہ سے کافی تھا۔ ایسا ہی ارشاد حضرت کا جبرئیل کے وحی لانے میں کافی ہے اور قرآن میں کئی جا مصرح ہے۔ پہلے سپارے کے بارھویں رکوع میں سورہ بقر کی ۹۷ آیت میں ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ   تو کہہ جو کوئی دشمن ہوگا جبرئیل کا سو وہ

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ	محض بے انصاف ہے کیونکہ اتارا اس نے تو اتارا ہے یہ کلام (یعنی قرآن مجید) تیرے دل پر اللہ کے حکم سے۔

اور سپارے چودھویں کے رکوع بیسویں میں ہے سورہ نحل کی ۱۰۲ آیت میں۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ	(قرآن) کو اتارا ہے پاک فرشتے (یعنی جبرئیل) نے تیرے رب کی طرف سے تحقیق

اور سپارے انیسویں کے رکوع پندرہویں میں سورہ شعراء کی ۱۹۳ آیت میں ہے

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ	لے اترا ہے اس کو (یعنی قرآن کو) فرشتہ معتبر (یعنی جبرئیل)

اور سورہ نجم کی پانچویں آیت میں ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى	اسکو سکھایا سخت قوتوں والے نے (یعنی جبرئیل نے)

اور سورہ تکویر کی ۱۹ آیت میں ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ	(قرآن) کہا ہے بھیجے ہوئے عزت والے کا (یعنی جبرئیل کا)

دوئم یہ ہے کہ بہت اصحابؓ سے مثل حضرت عمرو عبداللہ بن عباس وسعد بن وقاص اور عائشہ صدیقہ وام سلمہ کے جبرئیلؑ کو آنحضرتؐ کے پاس آتے دیکھا ہے اور ان کے دیکھنے کی روایات صحاح کی کتابوں میں اسناد صحیحہ سے مروی ہیں اور اس بات کی تحقیق حدیث صحیح سند اور اعتبار کے قابل ہے۔

پچیسواں سوال عیسائی بڑے شد و مد کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ جو یہ تھا۔

"اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ میں قرآن کو کلام اللہ جانتا ہوں لیکن جو قرآن کہ زمانہ حال میں پایا جاتا ہے کہ وہ اصلی نہیں ہے بلکہ جعلی اور محرف ہے کیونکہ اسمیں نامعقول باتیں پائی جاتی ہیں تو فرمائیے کہ اس شخص کو یہ جواب دو گے کہ اے برادر یہ سوال دیگر ہے کہ تیرے زعم میں چند مسائل قرآن کے عقل کے خلاف ہیں۔ مگر یہ تحقیق ہے کہ تو علم تاریخ اور طریق تواتر سے بالکل ناواقف ہے اور تیرا یہ قول ہیں قرآن کو کلام اللہ جانتا ہوں محض غلط ہے۔ تو اپنے توہمات کے تابع ہے اور اپنے وہم میں تو نے ایک اور قرآن فرضی قرار دے لیا ہے یا یہ جواب دیجئے گا کہ سچ وہ قرآن جس کا زمانِ محمدی سے آج تک رواج ہے۔ بلاشبہ جعلی ہے۔ اور بیشک کوئی اور قرآن ہوگا گو اس کا اشارہ زمانِ سلف سے آجتک کسی نے نہیں کیا"

اس غیر معقول سوال کا دندان شکن جواب حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے یہ تحریر فرمایا۔

"قرآن کے سارے مجموعہ میں اوّل سے آخر تک کوئی ایسی بات نہیں کہ الوہیت کے مناقص یا خدا کی صفاتِ کمالیہ کے مخالف یا انبیا کی نبوت کے منصب کے منافی ہو یا برہان عقلی قطعی یا نقلی قطعی کے برخلاف ہو سو اولاً اس شخص سے ان باتوں کو جنہیں وہ نامعقول سمجھتا ہے اور تحریف کی دلیل بناتا ہے دریافت کرکے برہان سے ثابت کیا جائیگا کہ وے نامعقول باتیں نہیں اور اے بھائی بالکل تیرا زعم غلط ہے اور جب دلیل اس کی اٹھ گئی تو پھر ثانیاً ثابت کیا جائیگا کہ یہ قرآن لفظاً لفظاً رسول اللہ کے عہد سے آجتک تو اتر قطعی سے ثابت ہے اور اس کی عبارت اعجاز اور بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر ہے

اسمیں کلام بشری ممکن نہیں کہ ملکر کھپ جاوے۔ سو جتنا یہ کلام ہے وہ سب کا
منزل من السمار ہے اور اس کے حق میں خود خدا کا وعدہ یوں مرقوم ہے۔
کہ تحقیق ہم آپ اس کے البتہ نگہبان ہیں یعنے ہر وقت میں زیادتی اور نقصان اور
تبدیل سے جیسا ان سب امروں کا بیان پہلے سوال کے جواب میں گذرا ہو۔
یہی قرآن ہے جو محمد پہ نازل ہوا تھا اور آج تک ویسا ہی بلا زیادت اور
نقصان اور تحریف کے پایا جاتا ہے جیسا محمد کے عہد میں تھا۔ اور قرآن کا
حال ایسا نہیں جیسا عہد عتیق اور جدید کی کتابوں کا ہے کہ ان میں بعض باتیں
تثلیثی مفسروں کی تفسیر کے موافق الوہیت اور صفارت کمالیہ کے منافی
ہیں اور بہت باتیں نبوت کی منصب کے مخالف ہیں جیسا بعضے پیغمبروں کا
شراب کے نشوں میں متوالے بنکر دو رات برابر اپنی بیٹیوں سے زنا کرنا اور
بعضے پیغمبروں کا گوسالے پرستی کرنا اور کروانا اور بعضے پیغمبروں کا نبوت کے
بعد بت مرتد بنکر بت پرستی کرنا اور بت خانے بنوانا، اور بعضے پیغمبروں کا خود
احکام تبلیغہ اور وحی میں جھوٹ بولنا اور مانند ان کے اور ان کی سند متصل نہیں
اور تواتر کما ینبغی سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ ان میں سے بعض کتاب تو ایسی ہے
کہ خود اہل کتاب کے بڑے بڑے عالم اس کو جھوٹی کہانی بتلاتے ہیں اور بعضے ایسے
ہیں کہ اس کو ان کے عالم ایک ناپاک راگ اور راگ اور باشانہ واجب خراج
کہتے ہیں اور بعض ایسی ہے کہ چار سو برس تخمیناً تک مردود رہی اور بعضے بعضے
بڑے بڑے عالموں نے اسے ایک ملحد کی تصنیف بتلائی اور ان میں ہر قسم کی
تحریف لفظی ہوئی جس کا اقرار اہل کتاب کے علمار سلفاً خلفاً کرتے چلے
آتے ہیں اور مخالف دوسری صدی سے چلاتے ہیں کہ عیسائیوں نے تین
بار یا چار بار بلکہ اس سے بھی زائد اپنی انجیلوں کو بدلا ہے اور ان میں یقیناً اختلافات

معنوی اور غلطیاں بھی ہیں اور خود ان کے علماء محققین کے اقرار کے موافق ہر معاملہ اور ہر گذارش ان کی الہامی بھی نہیں جیسا مشروحاً ان سب امور کا بیان سترھویں سوال کے جواب میں گذرا ہے صـــ ۴۹۲

چھبیسواں سوال بھی عیسائیوں نے اپنے زعم میں ایسا کیا تھا کہ اس کا جواب مسلمان ہرگز نہ دے سکیں گے۔ جو حسبِ ذیل تھا۔

”جو شخص دعوئ نبوت کرے اور کتاب بناوے یا کہے اور اس کو کلام اللہ قرار دے اور کتب سابقہ کو جو قرار واقعی تواتر سے ثابت ہوں محرف یا جعلی بتاوے تو فرمائیے کہ صدہا سال کے بعد اس کے تابعین کس وجہ سے اس بات کو تحقیق کریںگے کہ ان کے نبی کے نام سے جو کتاب مشہور ہے وہ اصل ہے یا جعلی“

لیکن حضرت مولانا مغفور نے بہت مختصر الفاظوں میں اس کا مسکت جواب دیا۔

”اس قول سے کتب سابقہ کو جو قرار واقعی تواتر سے ثابت ہوں سائل کی مراد اگر یہ ہے کہ ان کتابوں کی سند متصل ہے اور مصنف کے عہد سے آج تک تواتر کی راہ ہے ہر ہر فقرہ اور ہر ہر لفظ ان کا منقول ہے اور برہان سے ثابت ہے کہ کسی طرح کی تحریف انمیں نہیں ہوئی تو ممکن نہیں، کہ سچا نبی ایسی کتابوں کو جعلی اور محرف بتلاوے سو اس صورت میں ایسا فرض تو ایک لغو فرض ہے التفات کے قابل نہیں اور اگر مراد یہ ہے کہ فقط کسی شخص کی طرف نسبت اس کی مشہور ہوگئی ہو۔ گو نفس الامر میں اس کی تصنیف ہو یا نہو اور گو ہر ہر فقرہ اور ہر ہر لفظ اس کا تواتر کی راہ سے نہ منقول ہو بلکہ تحریف بھی اسمیں ہر قسم کی یقیناً ہوئی ہو تو ممکن ہے کہ سچا نبی ایسی کتابوں کو محرف یا جعلی بتلادے اس معنے کر کے بعض کتاب تو حقیقت میں اس مصنف کی تصنیف نہیں، جس کی طرف نسبت ہے اور بعض کتاب گو اس کی تصنیف ہے مگر پیچھے سے اس میں تحریف ہوئی ہے اور جب خارج

سے یہ بات معلوم ہوا اور اس نبی کی نبوت بھی معجزات اور دلائل حقہ سے ثابت ہو تو پھر یہ بات یقینی اور واجب الاعتقاد ہو جائے گی۔ رہی اس نبی کی کتاب اگر اس کا یہ حال ہو کہ اس نبی کے عہد سے آجتک ہر ہر فقرہ اور ہر ہر لفظ اس کا تواتر کی راہ سے منقول ہو۔ اور اس کے علاوہ یہ بات بھی ثابت ہو کہ غیر کا کلام اس میں نہیں مل سکتا اور خدا کا وعدہ اس کی حفاظت کا بھی ہے تو صدہا سال کے بعد کا کیا ذکر، ہزارہا سال کے بعد بھی نہایت آسانی سے ثابت کر سکیں گے۔ اور اگر اس کتاب میں بھی تواتر دوسری قسم کا ہو۔ تو حقیقت میں وہ بھی اس کی اصلیت کا اثبات نکر سکیں گے ص ۴۹۳"

اعجاز عیسوی یہ کتاب ۱۲۷۰ھ میں مولانا رحمت اللہ صاحب نے تالیف فرمائی اور ۱۰ ار صفر ۱۲۷۱ھ میں مطبع منعمیہ چھیلی اینٹ آگرہ میں باہتمام محمد امیر خاں طبع ہوئی اس کے پہلے صفحہ پر ایک قطعہ تاریخی تین شعروں کا چھپا ہوا ہے ؎

نسخہ ا عجاز چوں وحی فلک آمده — کز کلماتش خرد عیسوی اعجاز دید
عہد عتیق و جدید نقص ز عنوانش یافت — حجہ تحریف از و گوئی باخر رسید
سال شروعش بگفت حضرت روح القدس — مقصلہ تحریف در عہد عتیق و جدید ۱۸۵۳ء

کتاب کا نام المسمی باعجاز عیسوی ایک لائن میں اور دوسری لائن میں الملقب بمصقلہ تحریف درج ہے۔ ان دونوں ناموں کے اردگرد یہ دو تاریخی شعر درج ہیں ؎

نظم دری نیز ہاں خوش شدہ تاریخ لیک — آیت تاج ہدی یہدی بہ من یشا ۱۲۷۱ ۱۲۷۱ ۱۲۷۱
مد ظفر ای او ۔ لوح تاریخ دے ۱۲۷۱ ۱۲۷۱ — بود رہ روز انزل ھ رسم کلام خدا ۱۲۷۱

اعجاز عیسوی ۶۰۲ صفحات پر مشتمل ہے جس کے اختتام پر جناب منشی ابو الحسن

صاحب مدرس اوّل فارسی مدرسہ سرکاری آگرہ کے دو تاریخی قطعے درج ہیں ؎

این نسخۂ دین پناہ اعجاز طراز — کز نصر من اللہ است عنوانش بکام

تفسیر بحر فون بہ زین بنود — کز ہر حرفش باید الزام

چوں حلیۂ اختتام در بر پوشد — میخواستمش دہم بتاریخ نظام

دل سال تمام او ز ہاتف نرسید — گفتا کہ بود دلیل تحریف تمام

(۱۲۷۱)

دیدک اعجاز عیسوی کہ دلیل — بہر تحریف از و نیازی خوش

دل اعجاز را بدست آورد — فیض روح قدس بتاریخش

(۱۲۷۱)

مولانا رحمت اللہ صاحب نے اعجاز عیسوی کن وجوہات اور کن اسباب کی کی بنا پر تالیف فرمائی تھی اس کا ذکر آپ نے اس کتاب کی ابتدا میں کیا ہے۔ اگر پادری صاحب فرقہ پروٹسٹنٹ کے صرف بانٹنے ترجموں اپنی کتب مقدسہ کے اور سنانے ان کے پر اکتفا کرتے تو مسلمانوں کو انسے کچھ تعرض نہوتا لیکن وے اصول ملت اسلامیہ پر اپنی تحریر اور تقریر میں طعن کرتے ہیں اور انکی زبان اور قلم پر واہی تباہی اعتراض بہ نسبت حضرت خاتم النبیین کے گذارتے ہیں۔ اور اپنی تحریر و تقریر میں کبھی کبھی ایسا بھی دعوا کرتے ہیں کہ اگر کوئی ہم کو جواب دیگا تو رنج نہوگا اور ان کے چند مسائل جن پر ان کا بڑا شور و غل ہے بڑا مسئلہ تحریف کا ہے اور حق بھی یہ ہے کہ باقی ان کے سب مسئلے اس کی فروع ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس باب میں ایک رسالہ مشغلہ لکھا جاوے اور اسمیں حال کتب عہد عتیق اور جدید کا کچھ بسط کے ساتھ بیان ہو کہ اس سے حقیقت دعوی اہل اسلام کی بخوبی ظاہر ہو جاوے۔ اب کئی امر واجب الاظہار ہیں۔ اوّل یہ کہ تحریف کہتے ہیں بات کے بدل ڈالنے کو، اور یہ بدل ڈالنا خواہ باعتبار معنی کے ہو اور اس کو تحریف معنوی کہتے ہیں خواہ باعتبار

---------- لفظوں کے اور اس کو تحریف لفظی
کہتے ہیں پھر تحریف لفظی خواہ اس طرح پر ہو کہ ایک لفظ کو دوسرے لفظ
کے موضع میں رکھدیں خواہ اسطور پر کہ کسی لفظ کو اپنی طرف سے بڑھادیں
یا گھٹادیں اور جب معنی تحریف کے معلوم ہو گئے تو جاننا چاہیئے کہ ہم دعوٰی
کرتے ہیں کہ بلا شبہ کتابوں عہد عتیق اور جدید میں تحریف معنوی اور لفظی
دونوں ظہور میں آئی ہیں لیکن جو تحریف معنوی ہیں مابین عیسائیوں اور اہل اسلام
کے نزاع نہیں تو اُس رسالہ میں اثبات اس کا نہ کیا جائے گا اور تحریف لفظی جو
متنازع فیہ ہے اثبات اس کا تین مقصدوں اس رسالہ میں ہوگا اور بالاصالہ
اسی سے گفتگو آویگی گو بالتبع اور امر کا بھی ذکر آجاوے اور انشاء اللہ علماء
محققین عیسائی مذہب کے اقرار سے بخوبی ثابت ہو جائے گا کہ کتب ان کی میں
بعض جا میں بعض لفظ سے بدلا گیا اور بعض جا لفظ یا جملہ بڑھایا گیا اور بعض
جا سے لفظ یا جملہ اڑایا گیا ہے اور اس کو ہم تحریف ان کتب کی کہتے ہیں خواہ
اس کو عیسائی لوگ کہیں کہ شرارت بے دیانتوں سے قصداً ظہور میں آئی خواہ بسبب
مفقود ہونے تواتر لفظی کے غلطی کاتبوں یا وہم اصلاح دینے والوں کی طرف
نسبت کریں کیونکہ ہمارے دعوی میں سب قسموں تحریف لفظی میں مراد عام ہے کہ
قصداً واقع ہو یا بغیر قصد کے، دویم کہ جو کچھ اس رسالہ میں منقول ہوگا وہ
کتابوں معتبر فرقہ پرٹسٹنٹ اور رومن کاتلک سے مثل تاریخ یوسی بیس اور تفسیر
ہارن جو ۱۸۲۲ء میں لندن میں چھپی اور تفسیر ہنری اور اسکاٹ جو لندن میں چھپی
ہے اور تفسیر لا نر جو ۱۸۲۷ء میں لندن میں چھپی ہے اور دس جلدوں میں ہے اور
تفسیر جارج ڈوالی اور رچرڈ مینٹ جو ۱۸۴۸ء میں لندن میں چھپی ہے وغیرہا
کے منقول ہوگا۔ لیکن بسبب فرق محاورہ زبان اُردو اور انگریزی کے نقل بطور

حاصل مضمون کے عمل میں آویگی۔ نہ بطور ترجمہ لفظی کے۔ سوئم یہ کہ ترجمہ درسول کتب مقدسہ کا ان ترجموں سے نقل کرینگے جنکو پادریوں فرقہ پروٹسٹنٹ نے کیا ہے اور وہ نقل بقدر حاجت کے کبھی فقط اُردو ترجمہ سے اور کبھی اُردو اور فارسی اور کبھی اردو اور فارسی اور عربی سے عمل میں آویگی اور بعض جا بنظر زیادتی ضرورت کے حوالہ ترجمہ انگریزی کا بھی دیا جائے گا ص ۴"

اعجاز عیسوی میں تحریف کتب عہد عتیق وجدید پر ہر پہلو اور ہر زاویہ سے معقول مدلل اور لاجواب بحث مولانا رحمت اللہ صاحب نے فرمائی ہے اور تمام ثبوت عیسائیوں کی مقدس اور تاریخی کتابوں سے دئے ہیں۔ اور تحریف کے سلسلہ میں جو مواد اس کتاب میں دیا گیا ہے وہ بڑی عرق ریزی اور بے پناہ کاوش و جستجو کا مرہون منت ہے۔ جس سے عیسائیوں کی دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا تھا۔ مولانا نے جن مسائل پر اس کتاب میں بحث کی ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) پروٹسٹنٹ لوگوں نے کئی کتابیں جو کئی برس تک واجب التسلیم رہیں اور جنہیں کونسل کارتھیج نے قانونی قرار دیا تھا نکال ڈالیں

(۲) ان خرابیوں کے بیان میں جنکی سبب سے کتب مقدسہ میں تحریف ہونا آسان تھا۔

(۳) پانچ کتابیں حضرت موسیٰ کی تصنیف نہیں ہیں۔

(۴) وہ الہامی کتابیں جنکو اہل کتاب گم کر چکے ہیں۔

(۵) عیسائیوں کی وہ الہامی کتابیں ان مصنفوں کی نہیں ہیں جنکی طرف وہ منسوب کی گئی ہیں۔

(۶) جوانا سوتھکوٹ جو اپنے تئیں حضرت مسیح سے حاملہ تبلاتی تھی۔

(۷) ان کتابوں کا ذکر جو سلف میں اناجیل و اعمال وغیرہ مشہور تھیں اب

ان کو عیسائی جھوٹی بتلاتے ہیں۔

(۸) عیسائیوں کے نزدیک حواری اور پیغمبر کبائر سے معصوم نہ تھے حتیٰ کہ تبلیغ میں جھوٹ بول دیا کرتے تھے۔

(۹) عیسائیوں کے نزدیک سب تحریریں پیغمبروں کی الہامی نہیں ہوتیں۔

(۱۰) اس الزام کا جواب جو شیعہ حضرات حضرت عثمان پر کرتے ہیں کہ انہوں نے قرآن مجید میں سے آیتیں نکالی ہیں۔

(۱۱) عہد جدید میں صرف تین سو پچیس نسخے ملانے سے ڈیڑھ لاکھ اختلاف عبارت نکلے اور کافی نسخے باقی ہیں جو ملائے نہیں گئے۔

(۱۲) عیسائیوں کی کتب مقدسہ کے ان اختلافات عبارت کا ذکر جن سے مسائل میں نقصان آیا۔

(۱۳) عہد عتیق میں حضرت عیسیٰ کی نسبت کوئی پیشنگوئی صریح واضح نہیں ہے۔

(۱۴) جن پیشنگوئیوں کا پادری لوگ حضرت مسیح کے متعلق ذکر کرتے ہیں انمیں کئی محرف ہوگئی ہیں۔

(۱۵) ان اعتراضوں کا جواب جو پادری فنڈر نے صاحب استفسار پر کئے ہیں۔

(۱۶) دین عیسوی کی بہبودی کے لئے جھوٹ بولنا دوسری صدی میں پسندیدہ ہوگیا تھا۔

(۱۷) دین عیسوی کی اصلاح کا ذکر شیطان کے مشورہ سے۔

(۱۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کا اسپان ہمیس معترف تھا۔

(۱۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت حضرت عیسیٰ کی پیشنگوئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف پانچ کتابیں منسوب تھیں جنکو سلف تسلیم کرتے تھے اور سند مانتے تھے لیکن اب اکثر ان کو غیر معتبر مانتے ہیں۔ بلکہ انہیں سے

مفقود بھی ہیں۔ وہ کتابیں کونسی ہیں ان کے نام مولانا رحمت اللہ صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔

"اوّل گیارہ زبور ۹ سے ۱۰۰ تک، دوسری کتاب ایوب۔ اور بعض متقدمین کا یہ مذہب تھا کہ حضرت موسیٰ نے اس کتاب کو عبری میں تصنیف کیا ہے اور ارجن اس کتاب کی شرح میں لکھتا ہے اصل میں یہ کتاب سریانی میں تھی موسیٰ علیہ السلام نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا ہے اور ہارن صاحب کہتے ہیں کہ یہ رائے یہود اور عیسائیوں کے نزدیک مردود ہے تیسری کتاب مشاہدات چوتھی چھوٹی کتاب پیدائش کی اور اصل اس کی عربی میں چوتھی صدی تک پائی جاتی تھی اور جیروم اپنی کتاب میں اس کا حوالہ بھی دیتا ہے اور سیڈرینس اپنی تاریخ میں اکثر جا اس سے نقل کرتا ہے اور ارجن کہتا ہے کہ درس ۶ باب ۵ اور درس ۱۵ باب ۱۶ نامہ گلاتیوں کو پولوس نے اس کتاب سے نقل کیا ہے اور ترجمہ اس کا سولھویں صدی تک موجود تھا مگر اس صدی میں کونسل ٹرنٹ نے اس کو جھوٹا ٹھہرایا اور وہ کتاب جھوٹی پڑ گئی۔ دیکھو قدما ر نے اس کتاب کو صحیح جانا تھا یہانتک کہ پولوس مقدس نے بھی اس سے سند پکڑی ہے مگر سولھویں صدی میں تصدیق کونسل ٹرنٹ کے جھوٹی اور غیر واجب التسلیم ٹھہر گئی۔ پانچویں کتاب معراج۔ ارجن کہتا ہے کہ درس نامہ یہودا کا اسی سے منقول ہے اور لارڈنر اپنی تفسیر کی جلد دوسری کے صفحہ ۵۱۲ میں اس قول ارجن کو نقل کرتا ہے۔ چھٹی کتاب الاسرار۔ ساتویں ٹسٹمنٹ آٹھویں کتاب الاقرار۔ اور اب مسیحی ان کتابوں کو جو مشاہدات سے آخر تک ہیں جھوٹی بتلاتے ہیں۔ ہارن صاحب کہتے ہیں کہ مظنون یوں ہے کہ یہ جعلی کتابیں شروع ملت مسیحی میں ایجاد ہوئی ہوں انتہیٰ کہتا ہوں میں اس ظن کے موافق معلوم ہوا کہ طبقہ

اولی ملت مسیحی میں بڑے جعل بنانے والے تھے اور موافق اقرار جن کے پولوس اور یہوداانے انہیں جھوٹی کتابوں سے اپنے خطوں میں نقل کیا ہے اور اب عیسائی انہیں جملوں کو جو انہیں جھوٹی کتابوں سے منقول ہیں کلام روح القدس مانتے ہیں سبحان اللہ پولوس اور یہوداکو جو ان کے زعم میں صاحب الہام تھے پھر نہ ہوا اور سولہویں صدی والوں کو سولہ سو برس کے بعد اطلاع ہو جائے،" ص۵۱

کوئی بھی کتاب ہو اس کا کسی زبان میں بھی ترجمہ کیا جائے تو اسمیں نمایاں تبدیلی آئے گی تو یہ سمجھا جائیگا کہ ترجمہ کرنے والا یا تو انتہائی نالائق ہے جس نے اتنا غلط ترجمہ کیا ہے یا یہ باور کیا جائے گا کہ اس نے اس کتاب کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ اپنی من گھڑت باتیں لکھدی ہیں جو قابل اعتبار نہیں ہو سکتیں۔

چنانچہ اسی نظریہ و اصول کے ماتحت حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اعجاز عیسوی میں کتب عہد عتیق و جدیدہ کے عبری، سامری اور یونانی زبانوں کے نسخے دیکھے تو ان کے ترجموں میں بے پناہ فرق پایا جس کی بنا پر یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ ان کتابوں میں تحریف ہوئی ہے اور اس بات کو ثابت کرنے کے لئے آپنے حسب ذیل دلائل و ثبوت تحریر فرمائے۔

"اول یہ کہ بیان زمانہ کا ولادت آدم علیہ السّلام سے طوفان تک ایسا مختلف ہے کہ کوئی تاویل سوائے تسلیم تحریف کے نہیں ہو سکتی اس لئے کہ موافق عبری کے وہ زمانہ ایک ہزار چھ سو چھپن (۱۶۵۶) ہے اور موافق اکثر نسخوں یونانی کے دو ہزار دو سو باسٹھ (۲۲۶۲) اور موافق ایک نسخہ کے دو ہزار دو سو بیالیس (۲۲۴۲) اور موافق سامری کے ایک ہزار تین سو سات (۱۳۰۷) تو دیکھو تینوں میں سینکڑوں برس کا فرق ہے نہ ایک دو برس کا اور موافق توریت سامری کے ایک اور تماشا ہے کہ جو طوفان کے وقت عمر نوح علیہ السّلام کی

چھ سو برس کی تھی اور عمر آدم کی نو سو تیس برس کی (۹۳۰) ہوئی ہے تو لازم آتا ہے
کہ وقت وفات آدمؑ کی عمر حضرت نوح کی دو سو تئیس (۲۲۳) برس کو پہنچی ہو
حالانکہ یہ تو باتفاق مورخین کے غلط ہے اور نسخے عبری اور یونانی کے معاً
اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ کیونکہ موافق عبری کے ایکسو چھبیس (۱۲۶) برس
بعد وفات آدمؑ کی ولادت نوحؑ کی ہوئی ہے اور موافق اکثر نسخوں یونانی کے
سات سو بتیس (۷۳۲) برس یوسیفس یہودی نے جو مسیحی اس کو بڑا مورخ گنتے
ہیں بسبب اس اختلاف فاحش کے تینوں کو غیر معتبر سمجھ کر زمانہ دو ہزار دو سو
چھپن (۲۲۵۶) برس کا لکھا ہے اور موافق تفسیر ہنری اور سکاٹ کے تفصیل
اختلاف تین نسخوں کی جدول میں لکھی جاتی ہے۔

نام بزرگوں کا جنکی عمر میں وقت پیدا ہونے اولاد کے اختلاف ہے	بیان عمر بزرگوں کا موافق تین نسخوں کے		
	عبری	سامری	یونانی
آدم علیہ السلام	۱۳۰	۱۳۰	۲۳۰
شیث علیہ السلام	۱۰۵	۱۰۵	۲۰۵
انوش علیہ السلام	۹۰	۹۰	۱۹۰
قینان ؍؍ ؍؍	۷۰	۷۰	۱۷۰
مہلائیل	۶۵	۶۵	۱۶۵
یارد	۱۶۲	۶۲	۱۶۲
حنوک علیہ لسلام	۶۵	۶۵	۱۶۵
متوسالح	۱۸۷	۶۷	۱۸۷
لامک	۱۸۲	۵۳	۱۸۸

دوسرا یہ کہ موافق عبری کے زمانہ طوفان سے ولادت ابراہیم علیہ السلام تک
دوسو بانوے (۲۹۲) برس اور موافق اکثر نسخوں یونانی کے ایک ہزار بہتر (۱۰۷۲)
موافقِ ایک نسخہ یونانی کے گیارہ سو بہتر (۱۱۷۲) اور موافق سامری کے نوسو بیالیس
(۹۴۲) برس ہے اور عبری کے موافق یہ طرفہ تماشا اور ہے کہ بعد طوفان کے نوح
علیہ السلام تین سو پچاس (۳۵۰) برس جیئے جیسا درس ۲۸ باب ۹ کتاب
پیدائش میں مصرح ہے اور ولادت ابراہیم علیہ السلام کی دوسو بانوے (۲۹۲) برس
بعد طوفان کے ہوئے تو لازم آتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اٹھاون برس کی عمر تک
دیکھا ہو اور یہ تو باتفاق تواریخ کے غلط ہے اور موافق اکثر نسخوں یونانی کے سات سو
بائیس (۷۲۲) برس اور موافق ایک نسخہ یونانی کے آٹھ سو بائیس (۸۲۲) برس
بعد وفات نوح علیہ السلام کے ولادت ابراہیم علیہ السلام کے ہوئی ہے اور موافق
سامری کے پانسو بانویں (۵۹۲) برس بعد، پس دیکھنے کا کیا امکان اور نسخوں
یونانی میں۔ اور ایک خبط ہے کہ ارفخشد اور شالح کے بیچ میں مینان کو اپنی طرف
سے بڑھا دیا ہے کہ عبری اور سامری میں اسکا پتہ نہیں اور یوسیفس نے بھی
اس کو غلط جان کر نہیں لکھا اور مورخوں انگریزی نے بیان مدت مذکور میں
تینوں نسخوں کو غیر معتبر سمجھا اور اس کو تین سو باون (۳۵۲) برس لکھا۔
اور اس کو تفسیر ڈوالی اور رچرڈ منٹ میں موافق قول بشپ کڈر کے مختار کے
یوں لکھا ہے کہ کل زمانہ طوفان سے ولادت ابراہیم تک تین سو باون (۳۵۲)
برس ہے اور تعجب ہے کہ اس تفسیر والوں نے سالون کو جو نسخہ عبری میں
مصرح ہیں کیوں نہیں جمع کر لیا تاکہ غلطی گڈر کی ان پر ظاہر ہو جاتی اور یوسیفس
سب کے مخالف اس مدت کو نوسو ترانوے برس لکھتا ہے اور تفصیل اختلاف
تینوں نسخوں کی موافق ہنری اور اسکاٹ کے یہ ہے۔

نام بزرگوں کا جنکی عمر میں وقت پیدا ہونے اولاد کے اختلاف ہے	بیان بزرگوں کا موافق تینوں نسخوں کے		
	عبری	سامری	یونانی
سام سے ارفخشد کی ولادت	۲ برس بعد طوفان کے	۲	۲
ارفخشد	۳۵	۱۳۵	۱۳۵
قینان	بالکل ندارد	بالکل ندارد	۱۳۰
شالح	۳۰	۱۳۰	۱۳۰
عابر	۳۴	۱۳۴	۱۳۴
فالغ	۳۰	۱۳۰	۱۳۰
رعو	۳۲	۱۳۲	۱۳۲
سروغ	۳۰	۱۳۰	۱۳۰
ناحور	۲۹	۷۹	۷۹

"تیسرا یہ کہ دفتر دوسرے لب التواریخ کی شروع جدول میں صفحہ ۱۴۳ میں تشریح سنوں قبل ولادت مسیح میں لکھا ہے کہ نسخہ منطبعہ سنہ ۱۸۲۹ء دار الحکومت کلکتہ کا جہان کا خلق عبری کتاب مقدس کے مطابق ۴۰۰۴ بہ نقل سپٹوا جنٹ کی (یعنی ترجمہ یونانی کی) ۵۸۷۲ نقل سمارٹن کے مطابق ۴۷۰۰ انتہی بلفظہ دیکھو اس کے موافق زمانہ مابین ولادت آدم اور عیسیٰ علیہما السلام میں کیسا اختلاف ہے اور ان اختلاف میں قدما مسیحی یہودیوں کو الزام تحریف کا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ قریب سنہ ایکسو تیس (۱۳۰) عیسوی کے یہودیوں نے یہ تحریف کی ہے اور آگسٹائن بھی جو بہت بڑا عالم عیسائی گذرا ہے عبری کو محرف بتلاتا ہے ...... اور وجہ الزام کی یہ کہتا تھا کہ انہوں (یہودیوں) نے واسطے غیر معتبر کرنے ترجمہ یونانی اور دشمنی دین مسیحی کے یہ امر کیا تھا۔ ۶۷۵"

وہ قوم جو اپنی الہامی کتابوں کو ضائع کر دے اور پھر یہ دعویٰ کرے کہ ہماری الہامی کتابوں میں ردوبدل نہیں ہوا یہ بات کون تسلیم کریگا۔ چنانچہ یہ الزام بھی مولانا رحمت اللہ صاحب نے دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"اس امر کے بیان میں کہ سوائے ان کتابوں کے اور کتابیں بھی الہامی اور سچی تھیں جنکو اہل کتب نے کھو دیا اور اسی طرح بہت اور کتابیں بھی منسوب انہیں انبیا کے تھیں کہ وے گم ہیں اور جمہور مسیحی ان کو واجب التسلیم اور الہامی نہیں کہتے اور وے مسیحی کتابیں الہامی یہ ہیں۔

(۱) جنگ نامہ جس کا حوالہ درس ۱۴ باب ۲۱ شمار میں ہے تفسیر ہنری اور اسکاٹ میں ذیل اس درس۔ کے ہے کہ غالباً یہ کتاب وہ تھی جو موسیٰ نے تعلیم یوشع کے لئے لکھی تھی۔ اور اس میں بیان سرحدوں وزمین مواب کا تھا۔

(۲) کتاب الیسیر جس کا حوالا درس ۱۳ باب ۱۰ کتاب یوشع اور درس ۱۸ باب ۱ کتاب ۲ سموئیل میں ہے۔

(۳) کتاب یاہو پیغمبر بن حنانی کی جس کا حوالہ درس ۳۴ باب ۲۰ اخبار الایام میں ہے۔

(۴) کتاب سمعیا (۵) کتاب عیدو غیب بین کی اور ان دونوں کا حوالہ درس ۱۵ باب ۱۲ کتاب ۲ اخبار الایام میں ہے۔

(۶) کتاب ناتھن نبی (۷) کتاب اخیاہ نبی (۸) مشاہدات عیدو غیب بین اور ان تینوں کا حوالہ درس ۲۹ باب ۹ کتاب ۲ اخبار الایام میں ہے۔

(۹) اعمال سلیمان علیہ السلام جس کا حوالہ درس ۴۱ باب ۱۱ کتاب ۱ سلاطین میں ہے۔

(۱۰) اشعیا جس میں حال عزیاہ بادشاہ یہودا کا اوّل سے آخر تک لکھا تھا

اور حوالہ اس کا درس ۲۲ باب ۶ کتاب اخبار الایام میں ہے۔

(۱۱) کتاب مشاہدات اشعیا جس میں خرقیا بادشاہ کا حال مفصل مرقوم تھا۔ اور حوالہ اس کا درس ۳۲ باب ۲ کتاب ۲ اخبار الایام میں ہے۔

(۱۲) کتاب تاریخ تصنیف سموئیل علیہ السلام کی جس کا حوالہ درس ۲۹ باب ۵ کتاب ۱ اخبار الایام میں ہے۔

(۱۳) ایک ہزار پانچ گیت تصنیف سلیمان علیہ السلام (۱۴) کتاب بیان خواص نباتات اور حیوانات میں تصنیف سلیمان علیہ السلام کی۔

(۱۵) تین ہزار امثال سلیمان جن میں کی کچھ اب بھی باقی ہیں اور حوالہ ان تینوں کا باب ۴ کتاب ۱ سلاطین کی درس ۳۲، ۳۳ میں ہے۔

(۱۶) مرثیہ یرمیا کہ سوائے اس نوحہ یرمیا کے تھا اور حوالہ اس کا درس ۲۵ باب ۳۵ کتاب الاخبار میں ہے تفسیر ڈوالی اور رچرڈ مینٹ میں ہے کہ یہ مرثیہ اب گم ہے اور یہ یقیناً وہ نہیں بن سکتا جو اب نوحہ یرمیا کر کے مشہور ہے اس لئے یہ نوحہ غارت ہونے اور شلم اور ہلاک ہونے صدقیا پہ ہے۔ اور وہ مرثیہ موت یوشیا پر تھا۔

(۱۷) بہت اور کتابیں کہ موافق اقرار علمار رومن کاتلک کے یہود نے پھاڑ ڈالیں۔ اور جلادی تھیں اور موافق اقرار کریزاسٹم کے بعضے ایسی ہی کتابوں کی طرف درس ۲۳ باب ۲ متی میں اشارہ ہے ہمفرڈا پنی کتاب سوالات اکسوال میں جو ۱۸۴۳ء میں لندن میں چھپی ہے ذیل سوال دوم کے لکھتا ہے۔ یہ کتابیں جن میں یہ ذکر تھا (یعنی جس کو متی نے درس ۲۳ باب ۲ میں لکھا ہے) نیست و نابود ہو گئی ہیں اس لئے جو کتابیں نبیوں کی اب موجود ہیں کسی میں عیسیٰ ناصری نہیں کہلاتے کریزاسٹم اپنی ہوملی یعنی تفسیر نویں متی میں لکھتے ہیں بہت سے پیغمبروں کی کتابیں نیست

ونابود ہوگئیں اس لئے کہ یہود نے غفلت بلکہ بے دینی سے بعض کتابوں کو کھو دیا ہے اور انہوں نے بعض کتابیں پھاڑ ڈالیں اور بعض جلادیں۔ کیونکہ انہوں نے یہ دیکھکر کہ حواری مسلوں دین عیسوی کے لئے ان کتابوں سے سند پکڑنے لگے یہ فعل کیا ہوگا۔" ص ۹۶

یہ عیسائی قوم ہے جو ایک مرتبہ کتابوں کو الہامی مانتی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ان کو غیر الہامی قرار دیتی ہے۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اسی بات کا ذکر اعجاز عیسوی میں کیا ہے۔

"ان کتابوں کے بیان میں جو سلف میں اناجیل اور اعمال اور نامجات مسیح اور اور نامجات حواریین اور مشاہدات کر کے مشہور تھیں اب عیسائی ان کو غیر معتبر اور جھوٹی بتلاتے ہیں۔ جاننا چاہئیے کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد عروج جناب مسیح کے حواریوں کی زندگی ہی میں عیسائیوں میں غیر معتبر اور جھوٹی کتابیں اور جھوٹے نامے بنانے اور جھوٹے وعظ کرنے کا چرچا ہوگیا بحدیکہ حواری اور انجیل نویس اور پولوس مقدس بھی اپنی تحریروں میں اپنے پیروں کو اطلاع اس امر کی کرنے لگے اور بعد زمانے حواریوں کے اتنی کتابیں انجیلیں اور اعمال اور نامجات اور مشاہدات کر کے مشہور ہوئیں کہ ضبط ان کا مشکل ہے اور نویں صدی تک برابر وہ جعل سازی جاری رہی اور دسویں صدی میں اس فعل شنیع کا دریا بڑی طغیانی سے موجزن ہوا اور اب ان اناجیل وغیرہا سے کچھ جاتی رہیں اور کچھ باقی ہیں ..... مورخ موشیم جلد اول میں اپنی تاریخ کے جو ۱۸۳۲ء میں بالسیٔ مور کے اندر چھپی ہے ذیل بیان حال فرقہ ناصریوں اور ابیونی کی لکھتا ہے کہ ان دونوں فرقوں کے پاس ایک انجیل تھی جو ہماری انجیل سے مختلف ہے اور اس انجیل کے حق میں ہمارے علماء میں اختلاف ہے انتہی اور میکلین اس جا

بطور حاشیہ کے لکھتا ہے کہ انجیل ناصریوں والی یا عبرانی وہی ہے جو فرقہ ابیونی کے
پاس تھی اور انجیل بارہ حواریوں کی کر کے مشہور ہے اور غالباً یہ وہی ہے جس کی
طرف پولوس درس ۲ باب ۱ نامہ گلیتوں میں اشارہ کرتا ہے پھر درس دوسرے
باب دوسرے نامہ دوسرے تھسلنیکیوں میں لکھتے ہیں کہ تم اس خیال سے کہ
مسیح کا دن پہنچا ہے جلد اپنے دل کی ڈھارس مت کھوؤ اور نہ گھبراؤ نہ کسی روح،
نہ کسی کلام نہ کسی خط سے یہ سوچ کر کہ وہ ہماری طرف سے ہے انتہی تفسیر ہنری
اور اسکاٹ میں ہے کہ بعض نے خیال کیا ہے کہ اس درس میں اشارہ ہے کہ
کہ تھسلنیکیوں کو اور بھی نامے جعلی پولوس کی طرف سے دیکھائے گئے تھے انتہی
کہتا ہوں میں کہ ظاہر یہی ہے اور شاید احتیاطاً ملاحظہ شیوع جعلسازی کا کرکے
بطور پیش بندی کے لکھا ہو پھر باب ۱۱ نامہ دوم گرنتھیوں میں لکھتے ہیں ہندیہ سنہ ۱۸۴۲ء
پر میں جو کرتا ہوں سو ہی کرتا رہوں گا میں ان کو جو قابو ڈھونڈتے ہیں قابو پانے
ندونگا تاکہ جس بات میں وے فخر کرتے ہیں ایسے جیسے ہم میں پائے جاویں کیونکہ
ایسے جھوٹے رسول دغابازہ کارندہ ہیں جو اپنی صورتوں کو مسیح کے رسولوں سے
بدل ڈالتے ہیں انتہی دیکھو پولوس مقدس شور کرتے ہیں کہ ان کے وقت میں
ایسے لوگ تھے جو اپنی صورتوں کو حواریوں کی صورتوں سے بدلتے تھے اور دعویٰ
اور عائی رسالت عیسوی کا کرتے تھے۔ اور قابو ڈھونڈتے رہتے تھے تفسیر
ڈوالی میں ذیل میں درس ۱۲ کے مرقوم ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹے رسول
گرنتھیوں میں حواریوں کی مثل وضع بنا کر دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اپنے وعظ
پر کچھ نہیں لیتے اور اپنی استغنائی پر فخر کرتے تھے۔ لیکن باوجود اس کے
اور بھائیوں سے خفیہ اپنے مریدوں سے تحفے لیتے تھے بلکہ ان سے چھین
لیتے تھے اس پر حواری نے اس لحاظ سے کہ وے شرمندہ ہوں اور رسولوں

مسیح کی چال پکڑ بن یہ لکھا کہ میں گر نشتیوں سے کبھی کوئی چیز نہ لی ہے اور نہ لوں گا نہ خفیہ اور نہ ظاہرا انتہی اس میں صاف اقرار جھوٹے حواریوں کا ہے کہ اسیوقت میں تھے اور یوحنا حواری درس ۱ باب ۴ نامہ اول میں لکھتے ہیں ہندیہ ۱۸۴۱ء اے جیبو ہر ایک روح کی تصدیق نکرو بلکہ روحوں کو آزماؤ کہ وے خدا کی طرف سے ہیں کہ نہیں کیونکہ بہت سے جھوٹے پیغمبروں نے دنیا میں خروج کیا ہے انتہی اسمیں یوحنا حواری بھی مثل پولوس کے شور مچاتے ہیں اور پطرس حواری درس ا باب ۲ نامہ ۲ میں لکھتے ہیں ہندیہ ۱۸۴۲ء جیسے جھوٹے نبی اس قوم میں تھے ایسے جھوٹے معلم تم میں بھی ہوں گے جو ہلاک کرنیوالی بدعتیں پردے میں نکالیں گے۔ اور اس خداوند کا جس نے انہیں مول لیا انکار کرینگے اور آپ کو جلد ہلاک کرینگے انتہی ..... لوقا باب اول میں اور پولوس باب اول نامہ گلاتیوں میں درس ۶ سے ۹ تک اور درس ۲ باب ۲ نامہ ۲ تسلونیقیون میں تصریح کرتے ہیں اور بعد زمانے حواریوں کے یہ جھوٹی کتابیں جو منسوب طرف عیسٰی علیہ السلام اور حواریں اور اس کے ہمراہیوں کے تھیں اور ان کو اول چار صدی والوں نے انجیلوں اور ناموں اور اعمال اور مشاہدات وغیرہا کا خطاب دیکر ذکر کیا ہے بہت سی بڑھ گیئں اور بہت ان میں کی نیست ہو چکی ہیں اور بعض ابتک موجود ہیں پھر لکھتے ہیں جھوٹی کتابیں جواب موجود ہیں یہ ہیں۔

(۱) نامہ عیسٰی علیہ السلام کا انگرس کو

(۲) نامہ عیسٰی علیہ السلام کا جو یروشلم میں بنام لیوپاس پادری شہر اریس کے آسمان سے گرا تھا۔

(۳) انجیل طفولیت (۴) انجیل ولادت مریم (۵) انجیل یعقوب۔

(۶) انجیل نیقودیما (۷) شہادت تہکلا یا اعمال پولوس (۸) تاریخ بارہ

حواریوں کی (۸) تصنیف ایدیاس کی وغیرہ وغیرہ صد ۲۵۱"

احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث دلائل عقلیہ و نقلیہ سے تثلیث کو باطل کیا ہے۔ ۱۲۷۱ھ میں تصنیف ہوئی اور مطبع رضوی دہلی میں ۱۲۹۲ھ میں چھپی۔

البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف ۱۲۷۰ھ میں لکھی گئی۔ تحریف انجیل پر اسمیں بھی محققانہ بحث ہے۔ ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ فخر المطابع دہلی میں طبع ہوئی۔

اظہار الحق یہ کتاب خلیفۃ المسلمین سلطان عبد العزیز خاں اور خیر الدین پاشا صدر اعظم کی تحریک پر ۱۶ رجب ۱۲۸۰ھ کو مولانا رحمت اللہ صاحب نے قسطنطنیہ میں ترتیب دینی شروع کی جس کی تکمیل آخر ذالحجہ ۱۲۸۰ھ میں ہوئی ۱۲۸۱ھ میں سب سے پہلے قسطنطنیہ میں چھپی "تائید الحق برحمۃ اللہ" اس کا تاریخی نام ہے۔ یہ ایک مقدمہ اور چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کے عنوان یہ ہیں۔

(۱) باب اوّل: بیان و تفصیل۔ کتب عہد قدیم و جدید۔

(۲) باب دوم بیان و تفصیل اثبات تحریف انجیل۔

(۳) باب سوم۔ بیان و تفصیل اثبات نسخ انجیل

(۴) باب چہارم بیان و تفصیل ابطال تثلیث۔

(۵) باب پنجم۔ قرآن کا کلام اللہ ہونا۔

(۶) باب ششم اثبات نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور پادریوں کے اعتراضات کی تردید۔

حاشیہ پر مناظرہ اکبر آباد کا حال مولانا رحمت اللہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

اظہار الحق کا صدر اعظم کے حکم سے ایک ترکی عالم نے عربی سے ترکی میں
ترجمہ کیا۔ جو ابراز الحق کے نام سے شائع ہوا نیز یورپ کی متعدد زبانوں میں حکومت
عثمانیہ کی طرف سے اس کے ترجمے شائع کئے گئے۔ جنکو پادریوں نے خاص اہتمام
اور کوشش سے تلف کیا۔ مصر میں کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ مولوی سلیم الدین مرحوم
نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا تھا جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ مولوی غلام محمد صاحب
بھانجارا ندیری نے بڑی محنت و جانکاہی سے گجراتی میں ترجمہ کیا جو شائع ہو چکا ہے
اظہار الحق کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کے بعد "ٹائمز آف لندن" نے اس پر تبصرہ
کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "لوگ اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہب
عیسوی کی ترقی بند ہو جائیگی۔ رد نصاریٰ میں صرف یہی ایک کتاب ایسی ہے
جس کا معقول جواب آجتک مسیحی دنیا نکر سکی۔

اظہار الحق کے جواب اور رو مین پروٹسٹنٹ پادریوں کی ایک جماعت
نے ۶ ضخیم جلدوں میں ایک کتاب "الھدایہ" کے نام سے عربی میں لکھی جو خفیہ
طور پر مصر میں چھپی اس پر مطبع یا مقام اشاعت درج نہیں تھا۔ ایران کے ایک
عالم نے اس ضخیم کتاب کا نہایت محکم رد دو جلدوں میں "الھدیٰ الی دین
المصطفیٰ" کے نام سے لکھا جو لبنان میں طبع ہوا۔ جس کا جواب پادریوں کی ایک
متحدہ جماعت نے قلمی رسالہ کی صورت میں نجی طور پر ایران کے مصنف
کو بھیجا۔ لیکن ان ایرانی عالم نے اس کے جواب میں بظاہر خاموشی اختیار کر لی
لیکن نہایت اہتمام اور تدبیر کے ساتھ ایک مختصر کتاب "یا جامع رسالۃ التوحید
والتثلیث" کے نام سے شائع کیا جو لبنان میں طبع ہوا۔ پادری اس رسالہ کی
تاب نہ لا سکے اور ان ایرانی عالم کے دشمن ہو گئے۔

اسی دوران میں پادریوں کی ایک جماعت نے ایک کتاب نہایت شان کے

ساتھ "میزان الحق فی الدیانۃ المسیحیہ" کے نام سے شائع کی جس کا مدلل رد ایک عربی عالم نے "لسان الصدق علی میزان الحق" کے نام سے کیا۔ اس خاموش اور تصنیفی جنگ کے دوران بیروت کے ایک عالم علامہ شیخ محمد نے ایک سخت کتاب الوثینۃ فی الدیانۃ النصرانیہ (نصرانیت میں بت پرستی) کے نام سے لکھی جس کی عیسائی تاب نہ لا سکے اور چراغپا ہو کر انہوں نے لبنان کے کتب خانوں اور مکتبوں پر کھلم کھلا چھاپے مارے اور جہاں کہیں ان کو اس کتاب کی موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اس کو نہیں چھوڑا۔ حتیٰ کہ جس پریس میں چھپی تھی اس کو جلا دیا۔

مذکورہ بالا کتابوں میں جو ردِ نصاریٰ میں چھپی تھیں جگہ جگہ اظہار الحق کے حوالے ملتے ہیں۔ گویا ردِ عیسائیت میں اظہار الحق ایک بنیادی کتاب کا حکم رکھتی ہے یہ سب کتابیں لبنان اور شام کے پرانے گھروں میں اب بھی مل جاتی ہیں۔

مذکورہ واقعات سنہ ۱۲۸۱ھ سے سنہ ۱۳۰۴ھ تک رونما ہوئے۔

بروق لامعہ اس میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا مدلل اثبات اور خاتم المرسلین پر ختم رسالت کو ثابت کیا ہے (غیر مطبوعہ)

معدل اعوج المیزان یہ کتاب "میزان الحق" مولفہ پادری فنڈر کا جواب ہے رسالہ نور افشاں نمبر ۳۰ جلد ۱۲، ۲۴ رجولائی سنہ ۱۸۸۴ء میں پادری صفدر علی صاحب کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کتاب کا نسخہ ان کے پاس ہے۔

تقلیب المطاعن یہ کتاب "تحقیق دین حق" مولفہ پادری لاسمنڈ کا رد اور جواب ہے۔ (غیر مطبوعہ)

معیار التحقیق یہ کتاب تحقیق الایمان مولفہ پادری صفدر علی کا دنداں شکن جواب ہے۔

آداب المریدین حضرت ضیاء الدین سہروردی کی تصنیف "آداب المریدین علم تصوف پر لکھی گئی ہے عربی زبان میں ہے۔ اس کا ترجمہ حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے اصرار اور خواہش پر کیا جس کی تکمیل ۲۰ رمضان المبارک ۱۲۹۵ھ میں مکہ معظمہ میں مسجد الحرام کے اندر ہوئی۔ انہیں کے دیباچہ میں آپ نے یہ تحریر کیا ہے۔

"تصوف میں کتاب آداب المریدین ایسی اچھی کتاب ہے کہ ہر زمانے کے خاص و عام اسے پسند کرتے ہیں اور ظاہر باطن علماء اس کی تعریف کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو خدا کے پاک کلام اور اس کے رسول مقبول کی احادیث اور اجماعی مسئلوں کا خلاصہ ہے اسی لحاظ سے مقبول بارگاہ یزدانی پسندیدہ درگاہ رحمانی ہے جو اس قولِ شاعر کے مصداق ہیں ؎

بزرگ نیک خصلت پارسا ہیں   شریعت اور طریقت آشنا ہیں
کہوں کیا انکے میں کسب کمالات   مثل ہے یہ کہ چھوٹا منہ بڑی بات

اعنی عارف باللہ حضرت شاہ امداد اللہ جی نے اللہ تعالیٰ ان کو دیر تک ہدایت اور ارشاد کا مسند نشین رکھیو مناسب سمجھا کہ اس کا ترجمہ سلیس اُردو عبارت میں ہو جا کہ ہندیوں کو عموماً اور ان کے ان ہندی مریدوں کو جو عربی زبان سے اچھے واقف نہیں خصوصاً فائدہ ہوا۔ اور اس نامہ سیاہ کو اس کے ترجمہ کے لئے ارشاد کیا۔ میں گو اس میدان کا مرد نہ تھا۔ پر ان کے ارشاد کے موافق میں نے اس میں قدم رکھا اللہ تعالیٰ ان کی دعا سے اتمام کو پہنچا دے اور تمام ہوئے کہ بعد اس کو خاص و عام کا مقبول کرا دے۔ اب دیکھنے والوں سے تین چیزوں کی عرض ہے۔ پہلی یہ کہ دعا سے مجھے یاد کیجو۔ چوک کی جگہ اصلاح دیجو۔ کہ ہوتی ہے خطا ہر بشر سے، خصوصاً مجھ سے نادان بے ہنر سے۔ دوسری یہ کہ میں نے

ترجمہ لفظی نہیں کیا ہر زبان کا محاورہ الگ الگ ہے ترجمہ لفظی سے غالباً مطلب صاف نہیں کھلتا۔ تیسری یہ کہ بعضے بعضے جگہ اس نیت سے کہ مطلب خوب ہی کھلجا کچھ کچھ لفظ زیادہ کر دیئے ہیں پر اس زیادتی سے کہیں ایسا نہیں ہوا کہ ظاہر میں حضرت شیخ کا قول پلٹ گیا ہو اور جس جا حضرت شیخ کی عبارت ...... کئی چیز کا احتمال رکھتی تھی اس کو اسی طرح ترجمہ کر کے حاشیہ میں اسکو واضح کر دیا ہے"

التبہمات فی اثبات الاحتیاج الی البعث والحشیر۔

رسالہ فی الحشر

رسالہ فی ترک رفع الیدین فی الصلاۃ۔

التحفۃ الاثنا عشریہ فی الرد علی الروافض مولفہ مولانا شاہ عبد العزیز (فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا) [۱]

---

[۱] دروس من معاضی التعلیم وحاضرہ بالمسجد الحرام ص۱۰۰

بمن عون معین مطلق فضل توفیق خدای حق نسخه
آداب المریدین

تلامذہ

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے سامنے ہندوستان اور مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں جن حضرات نے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ ان کے نام پچھلے صفحات میں آچکے ہیں۔ اور جن اشخاص نے مدرسہ صولتیہ میں تعلیم پائی ہے ان ابنائے قدیم کی یہ مختصر فہرست ہے۔

(۱) شیخ احمد بن عبد اللہ القاری مرحوم، مدرس صولتیہ و قاضی مکہ و مدرس مسجد حرم و ممبر مجلس شوریٰ مملکت سعودیہ۔

(۲) عبد الحمید حدیدی۔ حال قاضی مکہ و ممبر مجلس اوقاف اعلیٰ۔

(۳) حسین عبد الغنی مرحوم مدرس مدرسہ صولتیہ و ممبر ہائیکورٹ و مدرس مسجد حرم۔

(۴) یحییٰ امان، سابق مدرس مدرسہ فلاح و مسجد حرم و قاضی مکہ و ممبر ہائیکورٹ و حال قاضی طائف۔

(۵) محمد نور کتبی۔ حال قاضی مدینہ منورہ و مدرس مسجد حرم۔

(۶) سالم شفی۔ سابق مدرس مدرسہ صولتیہ۔ و مدرسہ الفلاح و نائب قاضی مکہ معظمہ۔

(۷) احمد ناصرین مرحوم۔ مدرس مدرسہ صولتیہ۔ و مدرسہ فلاح و نائب قاضی مکہ معظمہ۔

(۸) حامد فاری۔ سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و قاضی طائف و حال قاضی ینبع

(۹) حسن سعید یمانی۔ سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و ممبر ہائیکورٹ و حال قاضی القضاۃ ریاست سماٹرا۔

(۱۰) احمد ہرسانی۔ حال قاضی محکمۂ تعزیرات درجہ دویم مکہ معظمہ۔

(۱۱) سلیمان مراد مرحوم۔ مدرس مدرسہ صولتیہ و قاضی طائف۔

(۱۲) حسن محمد مشاط۔ مدرس مدرسہ صولتیہ و حال نائب قاضی مکہ معظمہ

(۱۳) عبداللہ جبارزی۔ مدرس مدرسہ صولتیہ و سابق قاضی طائف۔

(۱۴) سراج محمد نور شعشہ۔ سابق قاضی تبوک و سب رجسٹرار طائف و حال صدر شعبہ اوقاف نہر زبیدہ و مدرس مدرسہ صولتیہ۔

(۱۵) سید محمد مرزوقی مرحوم سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و باش کاتب محکمۂ شرعیہ و مفتش محاکم شرعیہ مملکت سعودیہ۔

(۱۶) شیخ عیسیٰ رواس مرحوم سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و مسجد حرم و مدرسہ فلاح۔

(۱۷) سید احسن اہدل۔ سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و حال قاضی محکمہ تعزیرات۔

(۱۸) شیخ عباس عبدالجبار۔ مدرس مسجد حرم و مفتش کتب علمیہ۔

(۱۹) شیخ عثمان احمد بشناق مرحوم سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و مسجد حرم۔

(۲۰) شیخ محی الدین کرنشی ماہر علم فلک مکہ معظمہ۔

(۲۱) شیخ احمد ابراہیم غزاوی۔ شاعر دربار جلالۃ الملک عبدالعزیز ابن سعود و ممبر مجلس شوریٰ مملکت سعودیہ و صدر ڈسٹرکٹ بورڈ مکہ معظمہ

(۲۲) شیخ محمد الصادق۔ مدیر محکمۂ مردم شماری مملکت سعودیہ۔

(۲۳) شیخ محمود قاری - مدیر کلیۃ شریعت مکہ معظمہ

(۲۴) شیخ محمود عارف - سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و مسجد حرم و حال مدیر مدرسہ عربیہ ریاست سلانگور -

(۲۵) شیخ احمد منصوری - سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و حال مدیر "دار العلوم جاویہ" مکہ معظمہ

(۲۶) سید ہاشم نائب الحرم - مدیر ادارۂ مسجد حرم محترم مکہ معظمہ -

(۲۷) شیخ محمد عیسٰی طاشکندی وکیل عدالت و ممبر میونسپل بورڈ - مکہ معظمہ -

(۲۸) شیخ جمال سنبل - سپرنٹنڈنٹ دفتر وزارت خارجہ مملکت سعودیہ -

(۲۹) سید محسن مساوی مرحوم - سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و بانی مدرسہ دار العلوم جاویہ مکہ معظمہ

(۳۰) شیخ حامد میر - سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و حال مدیر مدرسہ ثانویہ طائف -

(۳۱) شیخ محمد عبدالکریم سوڈانی - مدیر مدرسۂ ثانویہ - مدینہ منورہ

(۳۲) شیخ داؤد عبدالرحمٰن دہان مرحوم - مدرس مدرسہ صولتیہ و مسجد حرم

(۳۳) شیخ عبداللہ مغربی سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و بانی مدرسہ اسلامیہ فیرا جاواد مدیر مدرسہ فلاح جدہ و حال نائب قاضی مکہ معظمہ

(۳۴) مولانا محمد سلیم صاحب سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و حال ناظم مدرسہ صولتیہ و مشرف علم (نگران شرعی) "دار الفائزین" و صدر ادارۂ حجاج منزل جدہ

(۳۵) شیخ محمد علی الیاس، مدرس مدرسہ صولتیہ و حال مدیر شعبۂ ابتدائی مدرسہ صولتیہ

(۳۶) شیخ مختار مخدوم مرحوم مدرس مدرسہ صولتیہ و نگراں شعبۂ ثانوی " "

(۳۷) ابراہیم یوسف خاں - سابق نائب قاضی طائف

(۳۸) بکر کمال - سابق قاضی طائف

(۳۹) محمد مدنی مجاہدی - مدیر شعبۂ اُردو - ادارۂ حج مملکت سعودیہ -

(۴۰) شیخ زکریا بیلا۔ مدرس مدرسہ صولتیہ و مسجد حرم وحال نگراں شعبۂ ثانوی مدرسہ صولتیہ

(۴۱) شیخ علی بکر مدرس مدرسہ صولتیہ و بانی مدرسۂ صلاح۔

(۴۲) شیخ محمد صالح سلیم۔ وکیل عدالت شرعیہ مکہ معظمہ

(۴۳) شیخ محمد شاہ۔ مددگار ادارۂ بیت المال محکمہ شرعیہ

(۴۴) شیخ عبداللہ آشی۔ مدیر جمعیت اسعاف (فرسٹ ایڈ سوسائٹی) مملکت سعودیہ

(۴۵) شیخ اسعد مفتی مدیر دفتر شرکت عربیہ السیارات (اربین موٹر کمپنی مملکت سعودیہ)

مدینہ منورہ۔

(۴۶) سید ابراہیم فلانی۔ مصنف

(۴۷) سید سعید محمد اُبی یمانی۔

(۴۸) سید محمد حزام یمانی۔ مدرس شہر صنعاء (یمن)

(۴۹) شیخ النعم ناصر یمانی۔ مدرس مدرسہ فلاح مکہ معظمہ

(۵۰) شیخ محمد ابو بکر ملا۔ مدرس مدرسہ احساء (نجد)

(۵۱) شیخ عبدالرحمٰن ملا ″ ″ ″

(۵۲) شیخ عبداللہ الکوہجی۔ سابق مدرس مدرسہ صولتیہ و حال واعظ وخطیب بحرین۔

(۵۳) شیخ عبداللہ فدا مرحوم ″ ″ ″ ″ ″ و مہتمم کتب خانہ مسجد حرام مکہ معظمہ

(۵۴) شیخ محمد علی یمانی۔ مدرس مسجد حرم وحال معلم واتالیق بعض شاہزادگان۔

(۵۵) شیخ عبدالرحمٰن مظہر۔ شیخ المعلمین (پاکستان و ہند) مکہ معظمہ

(۵۶) مولانا عبدالوہاب صاحب دہلوی۔ مالک فرم حاجی عبدالستار عبدالجبار صاحبان۔ (شاخ کوٹھی حاجی علی جان صاحب مرحوم دہلی) وممبر مجلس کتب خانہ حرم۔

(۵۷) حافظ عبدالباری صاحب دہلوی۔ مینجر فرم حاجی عبدالستار عبدالجبار صاحبان تاجران مکہ معظمہ۔

(۵۸) محمد انعام صاحب دہلوی ۔ تاجر مکہ معظمہ۔

(۵۹) شیخ محمد رفیع صاحب دہلوی تاجر مکہ معظمہ و وکیل ریاست حیدر آباد دکن۔

(۶۰) شیخ عمر اکبر ۔ نائب شیخ المعلمین ہند و پاکستان مکہ معظمہ۔

(۶۱) سید ہاشم علی نحاس ۔ نائب مدیر و ایڈیٹر رسالہ "منہل" مکہ معظمہ و شعبہ تحریرات وزارت مالیہ مکہ معظمہ

(۶۲) شیخ عبد الخالق رفہ ۔ حال تاجر جدہ۔

(۶۳) حافظ ضیاء الدین احمد صاحب مرحوم سابق معتمد عمومی صدر دفتر دار العلوم حرم صولتیہ کراچی۔

(۶۴) شیخ عمران رشادی سابق چارج ڈی الیفر انڈونیشیا لگیشن جدہ

(۶۵) سید بکر زواوی ۔ سابق سکریٹری مجلس میونسپل بورڈ مکہ معظمہ و حال مدیر شعبہ صنعت

(۶۶) شیخ عبد القادر الیاس ۔ مدرس مدرسہ صولتیہ و حال مدرس مدرسۂ عزیزیہ مکہ معظمہ

(۶۷) " عبد الفتاح راوہ ۔ مدرس مدرسہ فیصلیہ مکہ معظمہ

(۶۸) " عبد القادر کرامۃ اللہ ۔ مدرس مدرسہ صولتیہ و حال مدیر مدرسۂ رابغ

(۶۹) " حسن صدیق سندھی ۔ مدرس مدرسہ صولتیہ و حال مدرس مدرسہ سعودیہ۔

(۷۰) " محمد محمود ندیم ۔ انسپکٹر روڈس آرگنائزیشن ڈیپارٹمنٹ مملکت سعودیہ

(۷۱) " شمس الدین انڈونیشی ۔ سابق مدرس مدرسۂ صولتیہ و حال مدرس مدرسۂ امرا طائف۔

(۷۲) " محمود زھدی ۔ مدرس مدرسۂ صولتیہ و حال قاضی القضاۃ ریاست سلانگور

(۷۳) " علی عبد اللہ بلو ۔ مدارس محکمہ تعلیم ۔ مکہ معظمہ

(۷۴) " احمد حسن مشاط ۔ تاجر مکہ معظمہ

(۷۵) مولوی محبوب الرحمٰن صاحب کیرانوی ۔ سابق استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و حال استاذ ادب مدرسہ عالیہ کلکتہ۔

(۷۶) شیخ خلیل عبدالرحمٰن۔ مدرس مدرسہ صولتیہ وحال مدرس گورنمنٹ سکول ریاض نجد۔

(۷۷) " محمد علی بلاوی۔ مدرس مدرسہ صولتیہ وحال ادارہ کعکی موٹر ورکشاپ مکہ معظمہ

(۷۸) " محمد سعید ابوالخیر مرحوم۔ سابق مدیر اوقاف مملکت سعودیہ

(۷۹) " محمد علی بن ترکی۔ سابق ممبر مجلس شرعی وحال مدرس مسجد نبوی مدینہ منورہ۔

(۸۰) " عبدالصمد فدا۔ تاجر کتب، مکہ معظمہ۔

(۸۱) حکیم محمد نعیم صاحب۔ طبیب صولتیہ دارالشفاء ومنتظم شعبہ اردو ریڈیو اسٹیشن مملکت سعودیہ

(۸۲) شیخ زبیر احمد۔ مدرس مدرسہ صولتیہ ومہتمم مدرسہ دارالعلوم جاوبہ وحال مہتمم مدرسہ عربیہ فلفلان انڈونیشیا

(۸۳) " تاج الدین سبکی۔ مدرس مدرسہ اسلامیہ سماٹرا۔

(۸۴) " عبدالصمد صالح۔ مہتمم مدرسہ عربیہ پینانگ

(۸۵) " خلیل عبدالجبار۔ سابق چیف اکاؤنٹنٹ وزارت مالیہ مملکت سعودیہ۔

(۸۶) " عباس قطان مرحوم۔ سابق چیرمین مکہ معظمہ

(۸۷) " سلیمان جنیدی۔ مجلس علمی انڈونیشیا۔

ہندوستان اور مکہ معظمہ کے ابتدائی دور اور مدرسہ صولتیہ کے تلامذہ میں سے جن حضرات کے حالات ہم کو معلوم ہوسکے رہ قلمبند کر دئے۔ انہیں وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے مولانا سے رد نصاریٰ میں فیض حاصل کیا اور رد نصاریٰ کرنے کی اجازت حاصل کی۔

مولوی شرف الحق صاحب شرف الحق نام والد کا نام قاری حافظ جلال الدین جن کو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے باغیوں کا سرغنہ سمجھ کر گرفتار کر لیا تھا۔ لیکن آپ موقعہ پاکر بچ بچا کر نکل آئے اور اس وقت تک روپوش رہے جب تک وہ پر آشوب زمانہ ختم نہ ہوگیا۔ آپکے دادا مولوی عبدالغنی اور پر دادا شیخ عبدالکریم تھے اور ان کے والد شیخ بڈھن

سرہند شریف (پٹیالہ) میں رہتے تھے۔ دربار پٹیالہ میں خاص رسائی تھی۔ کچھ ناچاقی ہونے کی وجہ سے وہ معہ اپنے خاندان کے سرہند شریف کو خیرباد کہہ کر لاہور آ گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد ہی دہلی چلے آئے۔

مولانا شرف الحق صاحب نسلاً شیخ صدیقی ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابابکر صدیق رضؓ تک پہنچتا ہے۔ ؎

ولادت آپ کی ولادت ۱۸۶۷ء میں گلی جوتے والی محلہ چوڑی والاان میں ہوئی آپ کو دو برس کی عمر ہی سے صاحب دل اور بابرکت مقدس ہستی مولانا شاہ رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ سے روحانی فیض حاصل تھا۔ آپ حضرت شاہ ابوالخیر کی خانقاہ چتلی قبر میں سکونت رکھتے تھے جہاں اب آپ کا اسی خانقاہ میں مزار ہے۔ شاہ موصوف نے ہی آپ کی پرورش فرمائی۔

تحصیل علوم ظاہری آپ کی والدۂ ماجدہ مولینا رحیم بخش سے بیعت تھیں پیر روشن ضمیر کے ہاں حاضر ہوا کرتی تھیں ایک مرتبہ آپ کے لئے دعا کرائی۔ دم کرایا تو آپ نے فرمایا کہ بچے کی پرورش احتیاط سے کرنا اور صبح و شام میرے پاس بھیجدیا کرو۔ چنانچہ پانچ برس کی عمر تک آپ شاہ صاحب کے ہاں جاتے رہے۔ شاہ صاحب نے ہی ان کو قرآن مجید پڑھایا۔ اردو لکھنی پڑھنی سکھائی اور شاہ صاحب کے معتقد پنڈت درگا پرشاد نے ہندی و سنسکرت میں تکمیل کرائی۔ ۱۸۷۷ء میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں داخل ہوئے۔ مڈل پاس کیا اور انگریزی کے مضمون میں فرسٹ نمبر آئے۔

۱۸۸۱ء میں مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا حالی کو جب کسی شاگرد پر غصہ آیا کرتا تھا تو

؎ تاریخ جرم و سزا جلد اول ص۴۲

اس کو وہ "کودن" کہہ دیا کرتے تھے۔ انتہائی غصّہ کی حالت میں آپ کا یہ تکیہ کلام تھا ۱۸۸۳ء میں مدرسہ کے طالب علم کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان منشی فاضل میں بیٹھے اور تمام پنجاب میں اوّل رہے۔ منشی کے امتحان سے فارغ ہو کر عربی کی ابتدائی تعلیم صرف و نحو مدرسۂ اسلامیہ فتحپوری دہلی میں حاصل کی؎۱

اس زمانہ میں مذہبیت کا زور تھا۔ محلہ در محلہ، گلی در گلی پادری نصرانیت کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ محکوم ہندو اور مسلمان قوموں کو اپنے مذہب کی فکر تھی۔ وہ بھی پوتھیاں دبائے گلے میں حمائل ڈالے اپنے دھرم اور اپنے مذہب کی عظمت کا ڈنکا بجانے میں مستغرق نظر آتے تھے۔ کوئی دن ایسا نہ گذرتا ہوگا جس میں باہمی بدکلامی یا مناظرہ نہ ہوتا ہو۔ اور ایک دوسرے پر پھبتیاں نہ کسی جاتی ہوں۔ ہر روز لسانی اکھاڑے جمتے تھے۔ ہزاروں کا مجمع کسی مناظرے میں ہونا معمولی بات تھی۔

جس کی حکومت ہوتی ہے اسی کے مذہب کو عروج ہوتا ہے یہ بات عام ہے۔ حکومت اپنے ہم مذہب مبلغین کو سہولتیں پہنچاتی ہے۔ جو آسانیاں ان کو حاصل ہوتی ہیں وہ حکومت کے غیر مذہب والوں کو حاصل نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ یہی شکل عیسائی پادریوں کی تھی۔ حکومت ان کا خاص خیال رکھتی تھی۔ محکوم قومیں ان مراعات سے بدکتی تھیں؎۲ اور اپنے مذہب کو بچانے کے لئے جتن کرتی تھیں۔

اس ماحول نے آپ پر بھی اثر کیا۔ مناظرہ کا شوق ہوا

پادری سے جھڑپ جس کا آغاز اس طرح سے ہوا۔ گھنٹہ گھر دہلی پر ایک پادری صاحب مذاحیہ اور تمسخرانہ لہجہ میں فرما رہے تھے کہ مسلمانوں کے پیغمبر حبیب اللہ کہلاتے ہیں۔ لیکن جب ان کے پیغمبر کے نواسوں کو مخالفین نے قتل

؎۱ تاریخ جرم و سزا جلد اوّل ص۶۰ ؎۲ سیرت حاجی امداد اللہ اور ان کے خلفاء ص۹۵

کیا تو اس وقت پیغمبر صاحب نے خدائے تعالیٰ سے فریاد نہ کی۔ حالانکہ حبیب کا محبوب زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ اگر پیغمبر صاحب فریاد کرتے تو خدائے تعالیٰ ان کی ضرور سنتا۔

آپ بھی اس مجمع میں پادری کی تقریر سُن رہے تھے۔ جب اس نے یہ بات کہی تو آپ کو برداشت نہ ہو سکا۔ تقریر سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ تو یہ سیدھے سادے الفاظ میں پادری سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ آپ غلط کہتے ہیں کہ پیغمبر صاحب نے خدائے تعالیٰ سے فریاد نہیں کی۔ فریاد کی اور ضرور کی۔ نواسوں پر ظلم ہوئے ان کو تمام وکمال بیان کیا۔ مگر جواب ملا بیشک تمہارے نواسوں کو مخالفین نے شہید کر دیا تھا اور اس پر نہایت ظلم ہوئے ہیں لیکن اس وقت مجھے اپنے اکلوتے بیٹے یسوع مسیح کا سلیب پر چڑھنا یاد آرہا ہے اور اس کا غم بے چین کئے ہوئے ہے۔ اس جواب سے پیغمبر صاحب خاموش ہو گئے کہ واقعی اکلوتے بیٹے سے بڑھ کر میرا نواسہ نہیں ہو سکتا۔ جب بیٹا نہ بچ سکا تو میرا نواسہ کس گنتی میں ہے [1]

اس جواب سے مجمع میں جان پڑ گئی اور خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہندو ہو خواہ مسلمان سب مسرور ہوئے۔

اس واقعہ کے بعد سے مناظرہ کا شغل بڑھتا گیا۔ وقت کافی خرچ ہونے لگا اور تعلیم میں فرق پڑنے لگا۔ تو مولانا الطاف حسین حالی نے آپ کو مشورہ دیا کہ پہلے تعلیم کی تکمیل کرو۔ اس کے بعد مناظروں میں اُلجھنا مناسب ہے۔ چنانچہ مولانا نے دہلی کو خیرباد کہا دیوبند پہنچے اور مدرسہ دارالعلوم میں داخل ہو گئے۔ وہاں عربی کی درمیانی کتابیں پڑھیں جب دورہ کا زمانہ آیا تو اس وقت مولانا رشید احمد

---

[1] فرنگیوں کا جال ص ۲۴۸

گنگوہی کی قابلیت اور علمیت کا چرچا تھا اور خاص طور پر کتب احادیث کے اسباق مولانا کے ہاں بڑے معرکہ کے ہوتے تھے۔ بڑا شہرہ تھا۔ دیوبند کے طلبا گنگوہ کھنچے چلے جا رہے تھے آپ کو بھی شوق ہوا اور گنگوہ تشریف لے گئے اور دورہ میں شرکت کی۔

سال بھر میں کتب صحاح ستہ۔ صحیح بخاری۔ صحیح مسلم نسائی۔ ابوداؤد۔ جامع ترمذی ابن ماجہ۔ موطا امام مالک۔ مولانا گنگوہی سے پڑھیں اور سند حاصل کی۔

مناظرہ کا شوق تھا پھر شروع ہوا۔ اس مرتبہ مولانا گنگوہی کا حکم تھا کہ ردِّ نصاریٰ سے تبلیغ اسلام کرو چنانچہ ردِّ نصاریٰ اور باطل مذاہب و عقائد کی بیخ کنی میں مصروف ہو گئے [۱]

عبرانی و یونانی کا حصول

پادریوں سے مناظرے ہونے لگے طبیعت نے محسوس کیا کہ ان سے مناظروں کے لئے عبرانی و یونانی جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ آپ نے عبرانی اور یونانی حکیم عبدالمجید خاں صاحب مرحوم کے زیرِ علاج ایک یہودی عالم سے پڑھی اس نے آپ کو تحریری سند دی۔ یہ تحریری سند عبرانی زبان میں ہے جس کے نیچے اس کا اردو ترجمہ حکیم اجمل خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اس کے نیچے بھی عبرانی میں اس یہودی عالم کے تصدیقی دستخط ہیں۔ پشتو آپ نے مولانا عبدالحکیم افغانی سے پڑھی اور ترکی مولانا ابوالخیر سے سیکھی۔

الغرض آپ ۳۰ سال کی عمر میں عربی، فارسی، انگریزی۔ سنسکرت، عبرانی یونانی، پشتو، ترکی وغیرہ آٹھ زبانوں کے ماہر ہو گئے تھے۔

ان تمام علوم کے باوجود آپ کو ایک کامل فن مناظرہ کی تلاش تھی۔ آپ کے

---

[۱]: سیرت حاجی امداد اللہ اور ان کے خلفاء ص ۹۷

علامہ مولانا اشرف الحق صاحب صدیقی

مکان مولانا رحمت اللہ مہاجر مکی .... بانی مدرسہ صولتیہ کا نام نامی سُن چکے تھے چنانچہ سنہ ۱۲۰۶ھ میں آپ عازم حج بیت اللہ ہوئے اور مکہ معظمہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کی زیارت بابرکت سے فیضیاب ہوئے اور تین ماہ شب و روز خدمت میں حاضر رہے اور مختلف مسائل کو سمجھا اور بہت سے شبہات دور کئے چنانچہ مولینا رحمت اللہ صاحب مرحوم نے آپ کی خداداد قابلیت کو دیکھ کر مناظرہ کرنے کی عام اجازت فرمائی۔ اور مکہ معظمہ میں قیام و طعام کا انتظام اپنے ہاں رکھا دوسری جگہ کھانے نہیں دیا۔ رخصت ہوتے وقت مولانا نے آپ کو ایک بناتی پاجامہ جو سلطان عبدالحمید خاں نے خلعت میں دیا تھا اور اپنی تصانیف اظہار عیسوی ازالۃ الشکوک اور اظہار حق زبان عربی و فرانسیسی تبرکاً عنایت فرمائیں۔ اور ردّ نصاریٰ کی اجازت فرمائی جو حسب ذیل ہے۔

”میرے پاس عالم و فاضل ماہر و کامل مولوی شرف الحق صاحب قاری جلال الدین صاحب دہلوی کے فرزند تشریف لائے۔ مجھ سے اجازت طلب کی۔ حالانکہ میں اس لائق نہیں ہوں اور اس سے بہت دُور ہوں۔ کیونکہ مجھ جیسا شخص اہل عرفان کی موجودگی میں اس قابل نہیں کہ اس سے اجازت کا سوال کیا جائے۔ نیز یہ کہ وہ علماء اور مشاہیر و فضلاء کی اجازت سے پہلے ہی آراستہ و پیراستہ ہیں اور ان کے علوم کے سائے میں پناہ گزیں اور ان کے لطائف کے پھولوں کو چُنتے ہوئے ہیں خاص کر دو صاحبان علم و فضل اور موجزن سمندر ہیں اور عالم ظاہر و باطن کے جامع ہیں۔ اور جن کی شہرت نیکنامی کے ساتھ ہر ملک میں ضرب المثل ہے یعنی حضرت فقیہ و محدث قاری و مولوی عبدالرحمٰن اور حضرت فقیہ و محدث مولوی رشید احمد مگر چونکہ ان کو میرے ساتھ حسن ظن ہے تو میں نے ان کی درخواست قبول کرلی اور ان کی خواہش کو پورا کیا اس

اُمید پر کہ ان علمار کے سلسلے میں میں بھی منسلک ہو جاؤں سو میں کہتا ہوں کہ رحمت اللہ ابن خلیل الرحمٰن کہ میں نے ہر اس چیز کی روایت کی اجازت دی جس روایت کی مجھ کو روایت حاصل ہے جو کچھ میں نے اپنے شیوخ سے (اللہ تعالیٰ ان کو اجر عطا فرمائے) روایتاً یا درایتاً حاصل کیا ان شروط پر جو علماء حدیث کے نزدیک معتبر ہے۔ نیز چونکہ مولوی صاحب مذکور کو دیکھا کہ وہ نصاریٰ کے فریب سے واقف و آگاہ ہیں اور اس کے اسرار سے آشنا ہیں اس لئے میں نے ان کو اجازت دی کہ وہ اس کے متعلق تہذیب و شائستگی کو مدنظر رکھتے ہوئے وعظ کرتے رہیں اور نصرانیت کی تردید فرماتے رہیں اور یہ کہ وہ مجھے اپنی نیک دعاؤں میں خواہ جلوت یا خلوت میں ہوں نہ بھولیں۔ اور اللہ سے التجا کرتے رہیں کہ میرا بھی اور ان کا بھی نیک اعمال پر خاتمہ ہو اور اُمیدوں میں کامیاب کرے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

رحمت اللہ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ[1]

علومِ باطنی کا حصول

آپ نے جہاں مکہ معظمہ میں علوم ظاہری کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا وہاں آپ نے علومِ باطنی کی بھی راہ طے کی اور حضرت شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے بیعت ہوئے جہاں حضرت حاجی صاحب نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور سلسلہ چشتیہ و صابریہ میں مرید کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ سلسلہ نقشبندیہ کی اجازت حضرت مولٰنا انوار اللہ ابن مولوی شجاع الدین نقشبندی اور حضرت مولانا محمد سلیم نے مرحمت فرمائی۔

طریقہ قادریہ و ہاشمیہ کی اجازت حضرت سید صالح محمد مرتضیٰ الجیلانی

---

[1] فرنگیوں کا جال ص ۲۴۹

سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے حاصل کی۔

طریقۂ مجددیہ کی اجازت حضرت فدا محمد صاحب نے مرحمت فرمائی۔

طریقۂ شاذلیہ وظافریہ کی اجازت حضرت شیخ علی ابوالحسن طاہر مکی نے عطا فرمائی[1]

شادی آپ کی پہلی شادی بیس برس کی عمر میں ہوئی۔ دوسری شادی ۳ اگست ۱۹۰۲ء مطابق ۲۸ جمادی الاول ۱۳۰۲ھ ہجری میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے مشہور مرید حاجی شجاعت علی صاحب رئیس جوالاپور کی صاحبزادی مسماۃ اللہ بندی سے ہوئی۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکی امت البصیر زوجہ بابو حبیب احمد مرحوم اور دوسری بیوی سے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا یہ راقم الحروف ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۴ء روز جمعہ بوقت علی الصبح تولد ہوا۔

تین حج آپ نے پہلا حج ۱۳۰۵ھ میں کیا اور دوسرے حج کے لئے آپ ۱۳۲۱ھ میں روانہ ہوئے۔ اور دوسرے حج کے بعد ڈیڑھ سال تک ممالک اسلامیہ قسطنطنیہ، قاہرہ، قونیہ، طرابلس، شام، حمص، بعلبک، بیروت، یافہ، بیت المقدس، مصر، بصرہ، کوفہ، نجف اشرف، کربلا، دمشق، بغداد اور فلسطین کی سیاحت کی۔

پہلے حج میں جب آپ تشریف لے گئے تو آپ کی مصروفیات فرائض حج کے علاوہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا رحمت اللہ مرحوم و مغفور کی خدمت و صحبت میں رہنے کے اور کوئی نہ تھیں۔

معرکۃ الآرا مناظرے یوں تو آپ نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں مناظرے ہندوستان کے چیدہ چیدہ پادری، بشپ فرنچ، پادری ٹپر دنیرہ، پادری ڈپودھن

---

[1] صدیقی برادری کی شخصیتیں ص

پادری ہومر، پادری ویکٹ، پادری ویون، پادری ولبرڈ، پادری ڈینٹر، پادری ڈیبٹ، پادری ہونکب، پادری رائٹ، پادری رمزی، پادری جانسن، پادری وٹرلی، پادری ولوئنگ، پادری ڈیوئن، پادری وکارلائن وغیرہ سے کیئے۔
لیکن دسمبر ۱۸۹۱ء میں پادری ایم، جی گولڈ اسمتھ سے حیدرآباد میں اور ۸ رفروری ۱۸۹۳ء کو پادری جے سمول سے پونہ میں اور ۸ رمارچ ۱۸۸۳ء پادری روفس اور پادری اے بٹرک سے غازی پور میں جو مناظرے ہوئے وہ آپ کی قابلیت کا بین ثبوت ہیں۔ اور خاص طور پہ دہلی اور غازی پور کے لائق یادگار اور تاریخی مناظروں نے آپ کی علمیت کا سکہ تمام ہندوستان میں بٹھا دیا تھا۔[1]

جس موضوع تحریف انجیل پر یکم اپریل ۱۸۵۴ء میں آپ کے اُستاد مولانا رحمت اللہ نے پادری فنڈر کو مناظرہ میں لاجواب کیا تھا اسی موضوع پر آپ نے ۱۸۹۱ء میں دہلی کی مسجد فتحپوری کے اندر لارڈ بشب جے، اے لیفرائے سے مناظرہ کیا۔

دہلی اور دہلی کے اطراف کے اضلاع میں اس مناظرے نے ایک ہل چل مچادی تھی۔ جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ پادری صاحب اور مولانا صاحب میں یہ طے ہوا کہ جو شخص مناظرے میں ہار جائے گا وہ عام مجمع میں اپنی شکست کا اعتراف کرے گا۔ اور شکست نامہ لکھ کر دے گا۔ نیز ہارنے والا مقابل کے مذہب کو اختیار کرے گا۔

اس مناظرے میں آگرہ علی گڑھ، میرٹھ اور سہارنپور کے معززین اور مشاہیر و علماء مسیح الملک اجمل خان صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگ حکیم احمد سعید خاں صاحب، حکیم غلام محمود خاں صاحب، مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلوی مصنف تفسیر حقانی، ڈپٹی سید ہادی حسین خانصاحب اکسٹرا اسسٹنٹ

---

[1] تاریخ وحرم سرا جلد اوّل صلا

کمشنر سید سلطان مرزا مجسٹریٹ آنریری، حافظ عزیز الدین ایڈووکیٹ وغیرہ نے شرکت کی۔ عیسائی حضرات بھی ان اضلاع سے آئے۔ مناظرہ دو دن ہوا مناظرہ کے ان ایام میں مجمع ۲۰ و ۲۵ ہزار سے کسی طرح کم نہ تھا پہلے روز بحث چھ و سات گھنٹے جاری رہی، لیکن نا تمام دوسرے دن پھر ہوئی پہلے روز کی عالمانہ و فاضلانہ بحث نے شہر میں آگ لگا دی تھی۔ دوسرے روز مناظرہ میں قریب قریب تمام شہر اُمنڈ آیا۔ مناظرہ شروع ہوا اور ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ فیصلہ ہوگیا۔ اور مولانا رحمت اللہ کے شاگرد رشید نے اپنے مقابل کیفرائے کو شکست فاش دی۔ اس جمّ غفیر میں اس نے اپنے مذہب کو تو نہ بدلا لیکن تسلیم کیا کہ واقعی انجیل شریف میں تحریف ہوئی ہے اور حسب ذیل تحریر لکھ کر مجمع عام میں مولانا کو دیدی۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ لوقا کی انجیل شریف کے ترجمے اور علاوہ اس کے اصلی نسخوں میں جو اس وقت موجود ہیں چند آئتیں غلط ہیں اور بھول سے داخل کیگئی ہیں۔ یہ بات سب سے قدیم نسخوں و ٹریکٹوں کے ملانے سے معلوم و ظاہر ہوئی۔ وہ آئتیں ان میں نہیں۔ لہٰذا میں وہی اصلی انجیل کی باتیں سچّی مانتا ہوں چند مستشرقین شعراء کے قول انجیل شریف میں ملے ہوئے ہیں۔

دستخط جی، اے، لفرائے [۱]

غازی پور مشن سکول میں ۸ رمارچ ۱۸۸۵ء یکشنبہ کو دن کے تین بجے پادری روفسں سے مباحثہ ہوا۔ پادری صاحب نے تین گھنٹے کی بحث کے بعد لاجواب ہو کر آخر میں تین ہزار کے مجمع میں اعتراف شکست ان الفاظ میں کیا کہ "ہم میں اتنا علم اور لیاقت نہیں ہے کہ مولٰنا صاحب سے مقابلہ کر سکیں۔ مولٰنا صاحب نے ہمارے مذہب میں ایسی تحقیق اور وسیع معلومات حاصل کی ہیں کہ اس پر مولٰنا صاحب کو صد آفرین ہے۔

---

[۱] فرنگیوں کا جال ص ۲۵۲

مناظرہ کا ڈھنگ

آپ کا مقابل کو شکست دینے کا طریقہ یہ تھا کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں مقابل کی کتابوں کے حوالے پیش کرتے تھے اور اُسی کی ڈھال کو اُسی کے لئے خطرناک بنادیتے تھے جس سے اس کا عاجز ہونا لازمی تھا۔

آپ کے لیکچر اور مناظرے عامیانہ رنگ سے بالکل پاک صاف ہوتے تھے اور ایک محققانہ اور عالمانہ شان رکھتے تھے۔ آپ کی قابلیت ولیاقت کی تعریف وتوصیف میں غیر مذاہب کے ذمہ دار اور سنجیدہ اور متین حضرات نے بھی حصّہ لیا ہے اور جنہوں نے آپ کے لیکچر سُنے ہیں انھوں نے بھی آپ کی ذہانت کا سکّہ مانا[1]

تبلیغ اسلام

آپ مناظروں کے ساتھ مسلمانوں کی اخلاقی حالت کو بھی درست کرتے اور ان کو مشرع بنانے کی کوشش کرتے تھے آپ نے پنجاب، سندھ، بہار، بنگال، یوپی کا کوئی ضلع نہیں چھوڑا جہاں آپ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی تعلیم نہ دی ہو۔ اور احیاء شریعت نہ کی ہو سینکڑوں ایسے دیہات تھے جن میں خدا کا نام لیوا تک نہ تھا اور بہت سے ایسے گاؤں تھے جو خدا کے گھروں سے خالی تھے ان میں مسجدیں تعمیر کرائیں اور پنجگانہ نمازی بنائے نیز نصرانیت کے پھندے سے بچایا۔ اور پھنسے ہوؤں کو نکالا۔

نصرانیت کے پھندے سے ایک دوشیزہ کو چھٹکارا دلانا

بڑے بازار ہزاری باغ میں ایک دو منزلہ مکان پر پہلی منزل میں عبدالغنی بنگالی رہتے تھے۔ دوسری منزل پر پادریوں کے مشن کا دفتر تھا۔ قریب کی وجہ سے عبدالغنی کی لڑکی قمرالنسا جس کی عمر اس وقت بارہ سال تھی پادریوں سے تعلیم پانے لگی۔ پادریوں نے اپنا رنگ چڑھایا

---

[1] سیرت حاجی امداد اللہ اور ان کے خلفاء صـ۱۰۷

اور پانچ چھ برس تک اس کے ذہن پر نصرانیت کی فوقیت جمائی۔ نو عمر لڑکی تھی پھندے میں پھنس گئی۔ جب پادریوں نے دیکھا کہ شکار جال میں آگیا ہے تو انھوں نے اس کو اس کے گھر سے نکال کر گرجا میں پہنچا دیا۔

عبدالغنی کو جب اس شرارت کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے ہمسائے اور جگری دوست پوسٹ ماسٹر عباس بہاری سے ذکر کیا انھوں نے پولیس میں اطلاع کرائی۔ اس وقت مسٹر گائی (کرسٹان) سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا جو پادریوں کے مشنری کاموں سے دلچسپی اور ہمدردی رکھتا تھا۔ اس نے اس رپورٹ پر کوئی عملی کارروائی نہیں کی۔

عبدالغنی کو کسی نے بتایا کہ اٹک میں مولانا اشرف الحق صاحب آئے ہوئے ہیں جن کے نام سے پادریوں اور عیسائی مشنریوں کی روح قبض ہوتی ہے۔ ان کو بلاؤ۔ لڑکی وہی پادریوں کے قبضے سے نکال سکتے ہیں۔

عبدالغنی اٹک گئے۔ ان کی درخواست مولانا نے منظور کر لی۔ مولانا ہزاری باغ آئے۔ سیدھے گرجا میں پہنچے۔ وہاں ڈاکٹر ہیبرل، مس میری اور مس جیلڈ، جو مشنری کام کی انچارج تھیں۔ ان سے ملے اور ان کو ان کی زیادتی پر تنبیہہ کی۔ اور اس بات پر آمادہ کیا کہ اگر تم سچے ہو تو ہم کو بھی اپنے مذہب میں شامل کرو۔ ورنہ مذہب اسلام میں داخل ہو۔ اس فیصلے کے لئے مناظرہ ہوا۔ طے پایا کہ لڑکی بھی مناظرہ سُنے گی۔

مناظرہ ہوا۔ ہزاری باغ کے ہزاروں عیسائی اور مسلمان جلسے میں آئے۔ آخر دلائل سے مجبور ہو کر پادریوں کو لاجواب ہونا پڑا۔ اور ماننا پڑا کہ ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اس فضا سے لڑکی کو بھی کچھ جرأت ہوئی اس نے اپنے خیال کے مطابق سوالات کیے جوابات اطمینان بخش سننے کے بعد وہ اسی جلسے میں

مسلمان ہو گئی۔

مسلمان ہونے کے بعد شادی کا مسئلہ سامنے آیا۔ اس وقت وہ ۱۸، ۱۹ برس کی تھی۔ قرعہ اندازی ہوئی جس میں ایک شخص کریم الدین احمد لائن کانسٹیبل ہزاری باغ کا نام دوستوں نے مذاقاً دیا تھا۔ قدرتی بات اسی کا نام قرعہ میں آگیا۔ اور شادی ہو گئی۔

جب یہ عقد ہوا۔ اس وقت کریم الدین احمد کے والد مولوی ملا بخش تھانہ مانڈو ضلع ہزاری باغ میں جمعدار تھے۔ مسٹر گائی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ صبح کو تھانہ مانڈو کے ملاحظہ کیلئے آیا اور ان کے والد صاحب کے ساتھ سختی سے پیش آیا۔ کچھ بس نہ چلا تو ملاحظہ میں ان کے خلاف ریمارکس کر گیا۔ یہ بھی نہیں چوکے انھوں نے کلکتہ پولیس ہیڈ آفس کو تمام واقعہ سے آگاہ کیا۔ جس کے نتیجے میں دونوں کا دور دراز مقامات پر تبادلہ ہو گیا۔

اللہ رب العزت کو کریم الدین احمد کا یہ رشتہ اتنا پسند آیا کہ گھر پر رحمت واکرام کی بارش ہونے لگی۔ کانسٹیبل سے تھوڑے ہی عرصے میں ہیڈ کانسٹیبل، اسسٹنٹ سب انسپکٹر، سب انسپکٹر سے انسپکٹر بنا دئے گئے۔ اس وقت کریم الدین احمد اور قمر النسا کا انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن ان کی اولاد میں دو لڑکے معین الدین، امین الدین اور لڑکی سارہ خاتون حیات ہیں۔ معین الدین رانچی میں کاروبار کرتا ہے اور امیر الدین بہ لیا میں۔ یہ واقعہ سنہ ۱۹۰۰ء کا ہے۔

پیری مریدی آپ کے مریدوں کی ہندوستان میں تقریباً بیس پچیس ہزار کی تعداد تھی۔ جن میں کثرت سے، اوجین، اندور۔ رانچی، حیدر آباد سندھ، بلسکرا، ہزاری باغ، اٹکی ضلع رانچی، کشن گنج، اجمیر، ناگپور۔ ڈیرہ دون، سہارنپور، رڑکی وغیرہ کے باشندے تھے اور ہیں آپ کے ممالک اسلامیہ میں بھی

کثرت سے مرید تھے۔

علی الخصوص ان مریدوں میں کثرت سے علماء کا طبقہ تھا۔ مثلاً مولینا مولوی محمد سعید، تکیہ مولویہ، مولینا شیخ ابوالخیر نائب مدرس مکتب اسلامیہ، مولینا سعید .... محمد نظر الدین آفندی گیلانی صاحب سجادہ حماہ شریف۔ مولینا الحاج محمود ہاشمی الحلبی، مولینا آفندی گیلانی، مولینا شیخ محمد امین آفندی دمشقی وغیرہ وغیرہ۔

آپ اپنے ارادے کے مضبوط اور حق بات کہنے میں بیباک تھے ظالم کے سامنے اس کے ظلم کو رکھنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ کٹھن سے کٹھن بات کو بلا پریشانی کے طے کر لیتے تھے۔ آپ نے ۱۸۸۸ء میں ہر کی پیڑی ہردوار پر جہاں اب کسی مسلمان کا پر مارنا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ وہاں اپنا لکچر دھڑلے سے دیا۔

آخر عمر میں آپ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ بڑھاپے نے عاجز کر دیا تھا۔ پاؤں لنگ کرنے لگا تھا۔ بینائی میں بھی معمولی سا فرق آ گیا تھا۔ لکھنے پڑھنے میں دقت ہوتی تھی مگر حافظہ اس قدر تیز تھا کہ ڈھائی تین ہزار کے کتب خانہ میں سے کوئی کتاب آپ کے سامنے رکھدیجائی تو یہ تک بتا دیتے تھے کہ فلاں صفحے پر میں نے اس مضمون کا حاشیہ لکھا ہے۔

انتقال سے ڈیڑھ سال پہلے فالج کا حملہ ہوا۔ جسم کا نصف حصہ اس کی زد میں آیا۔ علاج معالجہ ہونے پر افاقہ ہوا۔ اور تندرستی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ لیکن وہ سب وقتی تھے۔ حکیم نابینا صاحب، حکیم محمد احمد صاحب حکیم ظفر احمد صاحب اور حکیم عبدالغنی صاحب کلکتہ والے سے خاص تعلقات تھے۔ وہ ادویات دیتے رہتے تھے۔ مگر وہ بے سود تھیں۔ پھر فالج کا حملہ ہوا۔ جو تمام جسم پر چھا گیا۔ اعضاء نے جواب دیدیا۔ اور آخر ستر برس کی عمر میں

۲۸ر جنوری ۱۹۳۶ء مطابق ۳ر ذیقعدہ ۱۳۵۴ھ بروز منگل بوقت ۸ بجے شب گلی بدلیان محلہ چوڑیوالان میں جبکہ شاہ جارج پنجم کی وفات پر تمام ہندوستان میں ہڑتال تھی آپ نے جہان فانی سے رحلت فرمائی۔

رسم تدفین میں مفتی کفایت اللہ، ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ ملیہ، حکیم محمد احمد خاں صاحب، حکیم ظفر احمد خانصاحب، مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری جناب مولنا عبدالرحمٰن صاحب پروفیسر مشن کالج دہلی۔ نواب سراج الدین احمد خانصاحب سائل وحیدالدین صاحب بیخود دہلوی۔ مولنا احمد سعید صاحب پیرجی عبدالصمد صاحب و دیگر معززین شہر اور علماء مشائخین و اہالیان دہلی نے حصّہ لیا۔

تصانیف و کتب خانہ

انتقال کے وقت ڈیڑھ لاکھ روپے کی جائداد عبرانی، یونانی، پشتو، ترکی، انگریزی، عربی، فارسی ہندی، اردو کی ڈھائی تین ہزار قلمی و مطبوعہ کتابیں اور حسب ذیل تصنیفات چھوڑیں۔

(۱) دافع البہتان بہ تنزیہ الرحمٰن دو حصہ۔

(۲) استیصال دین عیسوی بمقابلہ دین محمدی۔

(۳) مناظرہ غازی پور۔

(۴) مناظرہ کالکا۔

(۵) مناظرہ حیدرآباد دکن)

(۶) مناظرہ پونا۔

(۷) دینی مناظرہ سنمکنڈہ

(۸) مناظرہ دہلی (۹) لکچر امریکہ

سفر نامہ حج اس میں کئی مناظرے انگریزی زبان میں طبع ہو چکے ہیں۔ پہلے حج کا سفرنامہ بھی باالتفصیل قلمی لکھا ہوا موجود ہے۔ اب تک طبع نہ ہو سکا۔ طبع کرانے کی کوششیں جاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کامیاب کرے آمین[1]

حضرت شاہ ابوالخیر آپ فاروقی النسب تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے جو حسب ذیل ہے۔

شاہ ابوالخیر بن شاہ حافظ محمد عمر رامپوری بن شاہ احمد سعید بن شاہ ابو سعید بن شاہ شیخ محمد صفی القدر بن شیخ محمد عزیز القدر بن شیخ محمد عیلٰی بن خواجہ محمد سیف الدین خواجہ محمد معصوم بن حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی۔

شاہ ابوالخیر صاحب کے پرداد حضرت شاہ ابو سعید تھے جو ۱۱۹۶ھ کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ گیارھویں سال میں آپ نے قرآن مجید حفظ کیا۔ فن تجوید قاری نسیم اللہ صاحب سے حاصل کیا۔ علوم عقلی و نقلی مفتی شرف الدین رامپوری اور مولانا رفیع الدین دہلوی سے پڑھے اور شاہ عبدالعزیز دہلوی سے سند حدیث حاصل کی۔

طالب علمی کے زمانہ میں علم باطنی کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اپنے والد ماجد سے طریقہ نقشبندیہ میں بیعت کی۔ اور والد صاحب کے حکم سے اپنے خاندان کے درویشوں سے تکمیل باطن کی۔ حضرت شاہ درگاہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خاندان قادریہ میں بیعت ہوئے۔ اور خلافت پائی۔ ہزاروں آدمی مرید ہوئے۔ اور یہ کمال حاصل کیا۔ کہ جس پر توجہ ڈالتے ساتھ ہو جاتا۔ ۱۲۲۵ھ کو رامپور سے دہلی میں حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں

---

[1] مناظروں کی پوری روئداد "فرنگیوں کے جال" کتاب میں ملاحظہ کیجئے۔

پہنچے۔ شاہ صاحب نے ان کو اپنی مسند پر بٹھایا اور خلافت عطا کی ۱۲۳۹ھ کو حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد ریاست ٹونک پہنچے۔ اور بیمار ہو گئے۔ اور عید الفطر کے دن آپ نے ہدایت فرمائی کہ "اہل دنیا سے پرہیز کرنا۔ اگر دنیا داروں کے پاس جاؤ گے تو ذلیل ہو گے۔" آپ کا ٹونک میں ہی ۱۲۴۵ء کو انتقال ہوا۔ نعش تابوت میں رکھ کر دہلی میں لائی گئی چالیس روز کے بعد تابوت سے نکالی گئی اور حضرت شاہ غلام علی کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔

آپ کے دوسرے صاحبزادے شاہ احمد سعید صاحب تھے جو ربیع الاول ۱۲۱۷ھ کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ قرآن حفظ کرنے کے بعد اپنے والد کے ہمراہ دہلی گئے۔ نو دس برس کی عمر میں حضرت شاہ غلام علی صاحب سے بیعت کی شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے "بہت سے لوگوں سے میں نے لڑکے مانگے لیکن کسی نے نہیں دیا۔ البتہ ابو سعید نے اپنا لڑکا مجھے دیدیا ہے میں نے اس کو اپنا بیٹا بنایا ہے"

ابتدائی تعلیم آپ نے شاہ غلام علی صاحب سے حاصل کی۔ باقی کتب معقول و منقول مولوی فضل امام، مولوی رشید الدین خاں، مولانا شاہ عبد العزیز، مولوی رفیع الدین اور شاہ عبد القادر سے پڑھیں۔ بیس برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ درس دینا شروع کیا۔ پچیس سال خانقاہ شاہ غلام علی میں زندگی بتائی۔ ستاون برس کی عمر میں ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا بگل بجا۔ آپ نے دہلی سے ہجرت فرمائی پنجاب سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچے وہاں سے بمبئی روانہ ہوئے۔ بمبئی پہنچکر عازم حج بیت اللہ ہوئے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہاں بھی مریدوں کا وسیع حلقہ ہو گیا۔ اہل شہر کی کوششوں سے

ترکی حکومت کی طرف سے آپ کا وظیفہ مقرر ہوگیا تھا۔

۲ ربیع الاوّل ۱۲۷۷ھ میں آپ کا مدینہ منورہ میں انتقال ہوا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قریب دفن ہوئے۔ آپ کے تین صاحبزادے مولوی شاہ عبدالرشید، شاہ محمد عمر، اور محمد مظہر تھے[1]

شاہ محمد عمر شوال ۱۲۴۴ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد ابتدائی تعلیم مولوی حبیب اللہ صاحب سے پائی۔ حدیث اپنے چچا شاہ عبدالغنی سے پڑھی اور اکثر علوم دینیہ اور کتبِ تصوف اپنے والد ماجد سے تحصیل کی۔ بیعت بھی اپنے والد سے کی۔ جنھوں نے ان کو اپنا خلیفہ بنایا۔

اپنے والد صاحب کے ہمراہ کعبتہ اللہ گئے۔ مدینہ منورہ میں مقیم تھے کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ نواب کلب علیخاں والئے رامپور وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ اس خاندان میں سے کوئی صاحب رامپور تشریف لائیں۔ اتفاق سے شاہ محمد عمر صاحب اپنے صاحبزادہ کی شادی کرنے کیلئے رامپور تشریف لائے۔ نواب صاحب نے قلعہ کے اندر سرکاری مکان قیام کرنے کیلئے دیا اور رامپور میں رہنے کے لئے اصرار کیا۔ چنانچہ آپنے یہیں سکونت اختیار کر لی۔ اور رامپور میں محرم ۱۲۹۸ھ میں فوت ہوئے۔ اور حضرت حافظ جمال اللہ صاحب کے گنبد کے متصل جانب غرب دفن ہوئے۔

شاہ محمد عمر صاحب کے صاحبزادے شاہ ابوالخیر صاحب تھے جو ۲۷ ربیع الاوّل ۱۲۷۲ھ کو خانقاہ شریف مجددی دہلی میں پیدا ہوئے چھوٹی عمر میں مدینہ منورہ چلے گئے تھے۔ جہاں آپ کے والد نے چار سال کی عمر میں حضرت شاہ احمد سعید صاحب سے بیعت کرایا۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔

---

[1] تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۹۰

تحصیل علم مکہ معظمہ جاکر حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب، جناب مولانا مولوی سید حبیب الرحمٰن مہاجر، جناب مولانا مولوی شیخ احمد وہاں سے کی اور ۱۴ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اور مدت تک مدرسہ صولتیہ کے مدرس رہے۔ شیخ القراء شیخ عبداللہ آپ کے خاص تلامذہ میں سے تھے آپ نے برسوں حضرت کی خدمت کی اور آپ کی وساطت سے حضرت کا فیض قاری عبدالرحمٰن صاحب الہ آبادی کو پہنچایا[1]

عین عالم جوانی میں مکہ معظمہ سے رامپور پہنچے وہاں سے دہلی چلے آئے اور خانقاہ شاہ غلام علی میں سکونت اختیار کی۔ ہر سال ۱۲ ربیع الاول کی شب کو گیارہ بارہ بجے کے درمیان محفل میلاد شریف منعقد کرتے تھے خود مولود شریف پڑھتے انوار و برکات کی یہ کثرت ہوتی کہ برابر آنکھوں سے اشک رواں ہوتے بیان کی تاثیر دلوں پر چھریاں چلاتی آہ و فغاں کی صدائیں بلند ہونے لگتیں۔ اس محفل میں لوگ کثرت کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔ خانقاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی اور سڑک کی بھی آمد و رفت بند ہو جاتی تھی۔

شاہ ابوالخیر صاحب نماز بڑی خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتے تھے نماز میں جب کسی آیت کے فہم معنی کی وجہ سے حلاوت پیدا ہوئی تو رقت طاری ہوتی اور تمام نمازی بھی بیچین ہو جاتے اور زار و قطار رونے لگتے تھے۔

آپ کو کتابوں کے مطالعہ کا بھی شوق تھا۔ آپ کے کتب خانہ میں ہزار ہا عمدہ و نایاب و بیش بہا قلمی اور مطبوعہ عربی فارسی اور اردو کی ہر قسم و فن کی کتابیں تھیں۔ قلمی کتابوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ معقول قیمتیں دیکر خرید تے اور اہم کتابوں کی نقل بھی کرا لیتے تھے۔ چنانچہ مجمع الزوائد کی آپ نے نقل کرائی۔

---

[1] حیات شاہ ابوالخیر ص۲۱

آپ کا ۶۹ سال کی عمر میں جمعہ کی شب ۲۹ جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ کو انتقال ہوا۔ اور خانقاہ شاہ غلام علی میں دفن ہوئے۔

آپ کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ عمرؔ تخلص کرتے تھے۔ جب آپ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے تو آپ نے حسب ذیل نعتیہ نظم فرمائی ؎

یہ کیا آج ہے شان لبیک لبیک ہے بخشش کا سامان لبیک لبیک
فدا ہوں دل و جان لبیک لبیک الٰہی میں قربان لبیک لبیک
میں لایا ہوں ایمان لبیک لبیک

محبت نے دیوانہ مجھکو بنایا ترے عشق کا سر میں سودا سمایا
مرا زور وحشت عجب رنگ لایا کیے سر برہنہ ترے در پہ آیا
ہوا منہ پریشان لبیک لبیک

کروں نعمتوں کا تری کیا بیاں میں ترے شکر لاؤں کہاں سے زباں میں
خدائے جہاں تو ہے ننگ جہاں میں کہاں یہ وقوف و طواف اور کہاں میں
ترے سب ہیں احسان لبیک لبیک

کٹیں درد کی راتیں دن خستگی کے دکھائے خدا نے مجھے دن خوشی کے
نکل جائیں ارمان سب میرے جی کے الٰہی تصدق سے اپنے نبیؐ کے
کرار کان سب آسان لبیک لبیک

گناہوں میں ہر چند میں مبتلا ہوں مگر دل میں شرمندہ حد سے سوا ہوں
تو مالک ہے میرا، میں بندہ ترا ہوں ترے آستانہ پہ حاضر ہوا ہوں
مری جان ہو قربان لبیک لبیک

ترے در پہ حاضر ہیں بندے ہیں ہم سب یہاں بھی اگر ہاتھ خالی رہا اب
بر آئیگا مقصد میرے دل کا پھر کب ترے دست قدرت میں ہے خیر یارب
میرا بھر دے داماں لبیک لبیک

الٰہی بہت نادم و منفعل ہوں
غم و رنج و اندوہ سے خستہ دل ہوں
اسیر ہوا و ہوس پا بگل ہوں
عمل کے بگڑنے سے یارب خجل ہوں
بہت ہوں پشیمان لبیک لبیک

میں پہنچا ہوں درگاہِ شاہِ شہاں میں
حرم میں ہوں اسکے، اسی کے اماں میں
مرا بھی تو حصّہ ہے لطفِ نہاں میں
چھپا میرے عیبوں کو دونوں جہاں میں
مرے بخش عصیان لبیک لبیک

نہ مقصود دل پوچھو وارفتہ خو سے
نہ مطلب سے مطلب نہ کچھ آرزو سے
غرض ہے فقط اتنی ہر جستجو سے
جیوں اور مروں عزت و آبرو سے
اٹھوں مرکے شادان لبیک لبیک

عبث رات بھر ہے یہ اختر شماری
نہیں کام آتی ہے کچھ آہ و زاری
کرے ہاں مگر بخت یا در جو یاری
دم واپسیں تک زباں پر ہو جاری
ترا نام ہر آن، لبیک لبیک

نہیں ہے رہ کعبۂ دل سے آگاہ
نہیں جانتا منزل عشق کی راہ
رسائی ہو کس طرح مقصود تک آہ
سعید جہاں رہبری کیجئے للہ
عمر ہے گا نادان، لبیک لبیک

الشیخ احمد القاری

پیدائش ـــــ ۱۳۰۰ھ
وفات ـــــ ۱۳۵۹ھ

آپ اپنے دور کے ایک جید عالم تھے۔ اور حنفی المسلک تھے۔ آپنے حنفی مذہب میں ایک کتاب مجلۃ الاحکام تالیف کی سلطان شریف اور سلطان سعود دونوں کے عہد حکومت میں عہدۂ قضاء پر مامور رہے۔

شیخ احمد القاری نوجوانی میں ہی مدرسہ صولتیہ سے فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ فارغ ہونے کے بعد آپ نے اسی مدرسہ میں اور پھر مسجد حرام میں ان تمام علوم کا جو کہ آپ نے حاصل کئے تھے اور خاص طور پر علم فقہ کا درس دیا۔ علم فقہ میں موصوف مہارت تامہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ اس علم میں حجت تھے اور لوگ اپنے مسائل اور مشکلات میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ آپ تمام لوگوں کو نہایت مسرت، نرمی اور تواضع کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ اور آپ کے حکم اور ارشاد پر مطمئن ہو کر واپس جاتے تھے۔

صاحب "دروس من ماضی التعلیم وحاضرہ بالمسجد الحرام" تحریر کرتے ہیں۔

"میں نے مغرب کی نماز مقام ابراہیم میں ادا کی نماز کے بعد میرے سامنے کچھ ہی فاصلہ پر ایک بڑا سا حلقہ بن گیا۔ اور اس کی طرف بہت سے طلبہ جانے لگے اور سب جمع ہو گئے میں نے قریب جاکر دیکھا تو شیخ احمد القاری اس حلقہ کے بیچوں بیچ تشریف فرما ہیں۔ اس وقت آپ اپنے شاگردوں سے عمر کے لحاظ سے چھوٹے تھے لیکن زبان کی روانی جادو بیانی اور حسن تدریس نے ان کی طرف دلوں کو متوجہ کر رکھا ہے۔ قضا اور تدریس کے باب میں آپ کو شہرت جاودانی حاصل ہو گئی ہے۔

"میں آپ کے حلقہ درس کے قریب ہوا۔ آپکے درس کا موضوع حیض کے مسائل تھے میں نے سنا آپ کہہ رہے تھے "متحیرہ وہ ہے جو اپنے خون کے بہنے کے اسباب کے سلسلے میں حیران ہو۔ اور محیرہ وہ ہے کہ جس نے اس خون کے بارے میں دوسروں کو پریشان کر دیا ہو۔ ان دونوں صورتوں میں ہر ایک کی حالت کے بارے میں علماء کے کئی اقوال ہیں۔

"پھر شیخ موصوف رحمتہ اللہ علیہ نے طلبہ کو مجرہ کے حالات بتانے شروع کر دیئے۔ میں آپ کے درس سے کچھ حاصل نہ کر سکا کیونکہ میں اس وقت بچہ تھا اور بالغ نہیں ہوا تھا۔ اور اس قسم کی بحث کیلئے میری عقل میں گنجائش نہ تھی۔"

شیخ مرحوم کا یہ درس اپنے عہدۂ فقار پر مامور ہونے سے قبل تھا۔ جب آپ اس منصب پر فائز ہوئے تو آپ کے پاس بیع کے ہر قسم کے مقدمات سامنے آئے۔ اگر آپ کو اس منصب پر کام کرنے کے بعد تدریس کا موقعہ ملتا تو آپ کے درس میں کہیں زیادہ معلومات ہوتیں، اور تاجروں اور صنعت کاروں کے لئے نصیحتیں اور عبرتیں ہوتیں۔

الشیخ احمد ناضرین

پیدائش: ۱۳۰۰ھ۔ مدرسہ صولتیہ سے فارغ ہوئے۔ مسجد حرام اور مدرسہ صولتیہ میں درس دیا۔ مدرسۃ الفلاح میں مدرس بنا کر بھیجے گئے۔ پھر مکۃ المکرمہ کی بڑی شرعی عدالت میں جج مقرر ہوئے۔ آپ نے ۱۳۷۰ھ میں وفات پائی اور آخری عمر تک اسی منصب پر مامور رہے۔

آپ میانہ قد تھے۔ داڑھی گھنی تھی۔ جادو بیان مقرر و خطیب اور شرع کے سخت پابند تھے۔

آپ نے علم فقہ اور علم نحو میں مہارت تامہ حاصل کی۔ آپ نہایت چست، قوی الایمان تھے اور اپنے ساتھیوں میں تواضع حسن سلوک اور حسن اخلاق کی وجہ سے مشہور تھے۔

آپ علم پھیلانے اور لوگوں کو علم حاصل کرانے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ اپنے درس کا حلقہ عدالت کے دروازہ کے سامنے کھلی جگہ میں قائم کیا تھا۔ اس حلقہ کے قریب ہی شیخ سالم شغی کا حلقہ ہوتا تھا جو کہ تعلیم کے دوران آپ کے ساتھی تھے۔

آپ اپنے تلامذہ کے قلوب پر اور عقلوں پر چھا جاتے تھے۔ ان کو نور علم سے غذا بہم پہنچاتے اور نیکی کے راستے پر چلنے کی ہدایت کرتے۔ آپ ہر موقعہ پر اپنے طالب علموں سے کہتے کہ علم حاصل کرنے کا مقصد محض یہ نہیں ہے کہ تم نے صرف علم حاصل کر لیا اور بس۔ بلکہ دراصل مقصد یہ ہے کہ جو کچھ تم نے سیکھا ہے اس پر عمل کرو اور بھلائی میں اپنے اور غیر کیلئے راہ نما بنو۔ علم اس لئے حاصل نہ کرو کہ تم علم حاصل کر کے اس کو چھپا لو یا تم اس پر فخر کرنے لگو۔ بلکہ علم اس لئے حاصل کرو کہ اس سے خود بھی نفع حاصل کرو اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاؤ۔

موصوف قدرے متشدد تھے۔ دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتے تھے آپ نے فرمایا کہ سخت ہو جاؤ اس لئے کہ نعمتیں جو تم کو آج ملی ہوئی ہیں ہمیشہ نہیں رہیں گی۔ آپ دوران درس زیادہ سوالات کئے جانے سے بالکل بھی پریشان نہیں ہوتے تھے بلکہ ہر پوچھنے والے کو مکمل اور تشفی بخش جواب دیتے تھے...... ہر مسلمان کے بارے میں حسن ظن رکھتے تھے۔ اور ہر ایک کو نیکی کی ہدایت کرتے تھے۔

بہت متواضع تھے۔ اور جہالت کا جواب نرمی، حکمت اور نصیحت سے دیتے تھے۔ آپ مدرسۃ الفلاح میں مدرس ہوئے تو طلبہ کیلئے ذریعۂ ہدایت بن گئے۔ آپ کے طلبہ میں کچھ قاضی بنے۔ کچھ زبردست عالم ہوئے، بہترین مدرس ہوئے اور بہت سے حکومت کے لائق ملازم ہوئے۔

الشیخ اسعد الدھان

پیدائش ——— ۱۲۸۰ھ
وفات ——— ۱۳۳۸ھ

مدرسہ صولتیہ سے فارغ ہوئے۔ شیخ رحمت اللہ ربانی مدرسہ صولتیہ، شیخ عبدالحمید داغستانی الشروانی، شیخ عبدالرحمٰن سراج (مفتی احناف مکہ مکرمہ) یہ جلیل القدر علماء آپ کے اساتذہ تھے۔

شیخ اسعد الدھان کا شمار مشہور علماء میں ہوتا ہے۔ پستہ قدن۔ بھرا بدن گھنی ڈاڑھی تھی جس میں ایک عالم کا وقار اور ہیبت نمایاں تھی۔ آپ اپنے بھائی عبدالرحمان الدھان کے مرتبہ کے بزرگ تھے۔ آپ کا یہ نظریہ تھا کہ علم کی غایت صرف پڑھانا، عبادت میں لگ جانا اور گوشہ تنہائی اختیار کر کے بیٹھ جانا نہیں ہے بلکہ عالم کیلئے ضروری ہے کہ وہ عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھے اور امت کی بھلائی کے تمام امور کو انجام دینے کی کوشش کرے۔ چنانچہ آپ اپنی اس حیثیت کے ہوتے ہوئے کہ حکومت نے آپ کے ذمہ بہت سی ذمہ داریاں سونپیں آپ علم کو پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ آپ شریف حسین کے زمانے میں قائم مقام مکہ کے معاون کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ آپ مجلس التعزیرات کے ممبر اور ملازمین کے معاملات میں غور و خوض کی کمیٹی کے صدر چنے گئے۔ پھر ۱۳۳۷ھ میں قاضی (جج) مقرر ہوئے۔ آپ اپنے ان تمام مناصب میں جو آپ کے سپرد کئے گئے تھے ایک نمونہ تھے پاک بازی، اخلاص اور صحیح الرائی ہونے کا۔ ہر باریک سے باریک مسئلہ کو نہایت مہارت اور عقلمندی سے اور جانبین کو خوش کرتے ہوئے حل کر دیتے تھے اور آپ کی عدالت سے ہر شخص مطمئن ہو کر جاتا تھا۔

موصوف حدیث کا درس نہایت عالمانہ اور محققانہ طریقے پر دیتے تھے۔ اور احادیث کی تشریح اس انداز سے کرتے تھے جو زمانۂ موجودہ کے مطابق ہوتی تھی۔ آپ کی تقریر تمام مسائل پر حاوی ہوتی تھی اور کتب احادیث و تفاسیر پر آپ کو پورا عبور حاصل تھا۔

الشیخ حسین عبدالغنی

پیدائش مکہ مکرمہ ——— ۱۳۰۸ھ
وفات ——— ۱۳۶۶ھ

مدرسہ صولتیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ وہیں درس بھی دیا۔ لیکن اپنی تعلیم مسجد حرام میں جاری رکھی اور فقہ و اصول فقہ حنفی شیخ محمد ابو حسین المرزوقی سے پڑھا۔ تفسیر سید عبداللہ زواوی سے علوم لغۃ عربیہ شیخ محمد علی المالکی اور شیخ محمد علی ابوالخیور سے اور علم فلک شیخ خلیفۃ النبہانی سے پڑھا۔ "معلاۃ" میں ایک مدرسہ "المدرسۃ الہاشمیہ" میں مدرس ہوئے۔ آپ نے مسجد حرام میں بھی درس دیا۔ آپ سے پڑھ کر بہت زیادہ طلبا فارغ ہوئے۔ عہد سعودی میں مجلس المعارف (محکمہ تعلیم) کے ممبر اور پھر محکمہ تعلیم کے نائب صدر مقرر ہوئے۔ مطبوعات کی نگراں کمیٹی کے ممبر ہوئے۔ "المستعجلۃ الاوّلیٰ" میں قاضی منصب پر فائز ہوئے اور اس منصب پر تقریباً بیس سال تک رہے۔ پھر قاضیوں کی انجمن کے رکن ہوئے۔

آپ کی تالیفات:- ۱۔ فتح الوہاب شرح تحفۃ الطلاب ۲۔ ارشاد الساری الی مناسک ملا علی قاری تھیں۔ صاحب دروس من ماضی التعلیم وحاضرہ بالمسجد الحرام لکھتے ہیں۔

"شیخ حسین عبدالغنی میانہ قد اور بھرے جسم کے تھے۔ میں نے ان کو شیخ محمد مرزوقی کے حلقہ درس میں ایک طالب علم کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ آپ اپنے ساتھیوں، شیخ یحییٰ امان اور شیخ احمد ہرسانی کے درمیان بیٹھتے تھے۔ میں نے آپ کو مدرسہ ہاشمیہ میں پڑھاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ آپ جوانی کے زمانے سے ہی نیکی اور تقویٰ میں مشہور تھے"۔

جوں جوں عہد سعودی کا سورج بلند ہو رہا تھا آپ کے ذہن میں توحید بلا شرک کا عقیدہ پختہ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ آپ تعلیم پر پوری طرح متوجہ ہوئے اور سلف کی کتب تفسیر و حدیث اور شیخ محمد عبدالوہاب کی تالیفات کو اچھی طرح پڑھا۔ چنانچہ آپ کی استعداد بہت ٹھوس ہوگئی۔ آپ پر حکومت کو

کافی بھروسہ ہوگیا تھا اسی لئے آپ کو بڑے بڑے دینی مناصب عطا کئے گئے۔

آپ خاص طور پر مستعجلہ اولیٰ میں مجرمین پر شدت کرنے کی وجہ سے بہت مشہور رہو ئے۔ آپ ان کو پوری سزا دیتے آپ کو نہ تو ملامت کرنے والوں کی ملامت اور نہ کسی سفارش کرنے والے کی سفارش صحیح فیصلہ کرنے سے روک سکتی تھی۔ خواہ اس شخص کا مرتبہ ان کے نزدیک کچھ ہی ہو۔ اس سلسلہ میں لوگ آپ کے بارے میں مختلف قصّے بیان کرتے تھے۔ مثلاً سفارش کرنے والوں کے خط پھاڑ کر پھینک دینا۔ سفارش لے کر آنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔ شرعی فیصلہ کو جاری کرنے پر اصرار کرنا۔ آپ مجرم کو بھانپ لینے میں نہایت گہری نظر رکھتے تھے۔ خواہ مجرم کسی بھی طرح بچ نکلنے کی اور دھوکہ بازی و مکر و فریب کے جال پھیلانے کی کوشش کرتا۔

الشیخ سالم شفی

پورا نام :۔ الشیخ سالم عبدالحمید شفی۔

پیدائش : مکہ مکرمہ ۱۳۰۶ھ ۔ مدرسہ صولتیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ پھر مسجد حرام، مدرسہ صولتیہ، المدرسۃ الراقیۃ اور مدرسۃ الفلاح میں درس دیا۔ شریف حسین کے عہد میں مستعجلہ کی عدالت کے (چیف جسٹس) مقرر ہوئے۔ سعودی عہد میں بڑی شرعی عدالت کے جج ہوئے۔ پھر اسی عدالت کے نائب چیف جسٹس ہو گئے۔ ۱۳۷۳ھ میں ۶۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ صاحب "دروس من ماضی التعلیم و حاضرہ بالمسجد الحرام" لکھتے ہیں۔

"میں شیخ سالم شفی کو جب سے جانتا ہوں جب کہ میں مدرسہ صولتیہ سے فارغ ہوا۔ اس وقت آپ نوجوانی کے عالم میں تھے۔ کالی گھنی ڈاڑھی گٹھا ہوا بدن متوسط قد اور ہنستا ہوا چہرہ۔ میں نے آپ سے مسجد حرام میں اور مدرسہ الراقیہ میں فقہ حنفی پڑھا ہے۔ میں آپ کی زندگی کے آخری سالوں سے بھی

واقف ہوں جبکہ آپ نے مسجد کو لازم پکڑ لیا تھا اور نماز میں اور طواف میں لگے رہتے تھے اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ تلاوت کلام پاک کرتے اور استغفار کیا کرتے تھے اور اپنے رب سے ملنے کی تیاری کرتے رہتے تھے۔"

شیخ مرحوم عدالت کے سامنے میدان میں پڑھاتے تھے آپ کے طلبہ میں اُس زمانے کے زیادہ تر جوان لوگ ہوتے تھے۔ اس وجہ سے کہ اُس وقت یہ دفتروں کی نوکریاں اور کاریں اور کھیلوں کے مختلف قسم کے مقابلے نہیں ہوتے تھے جو کہ جوانوں کو تحصیل علم سے اور اللہ کی عبادت کے لئے وقت ضائع کرنے سے روکتے۔
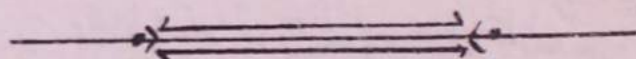
حرفِ آخر

"آثار رحمت" کی تالیف کے بعد ایک کمی محسوس کی گئی کہ اسمیں مولانا رحمت اللہ صاحب کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے مقدمہ کی کارروائی شامل نہیں تھی۔ اس مقدمہ کے فائل کے حصول کے لئے مجھکو مظفر نگر کی سکرٹیریٹ میں جانا پڑا۔ تو وہاں سے معلوم ہوا کہ یوپی کے تمام اضلاع کے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے فائل الہ آباد کی نیشنل آرکائیوز میں چلے گئے ہیں۔ وہاں میں چار پانچ مرتبہ گیا اور فائل کی تلاش کی۔ لیکن افسوس دستیاب نہ ہو سکا۔

اسی اثناء میں میں نے حضرت مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ اور نبیرہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو مدرسہ صولتیہ اور مسجد مدرسہ صولتیہ کے فوٹوؤں کے لئے تحریر کیا۔ انہوں نے توجہ کی جب تمام فوٹو انہوں نے بھیجدئے اور مجھ کو مل گئے تو میں نے جناب نور الاسلام صاحب صدیقی جنہوں نے سنی مجلس اوقاف کانفرنس کے خطبہ صدارت کیلئے دہلی کی منہدم شدہ مساجد و مقابر کے فوٹو اتارے تھے۔ ان کو کیرانہ کے تاریخی مقامات کے فوٹو اتارنے کے لئے آمادہ کیا تو ہمارے ہمراہ جانے کے لئے جناب

سعید خانصاحب مالک اکادمی پریس پہاڑی املی دہلی بھی ...... تیار ہوگئے۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق ۲۹ راکتوبر ۱۹۶۷ء کی صبح کو چھ بجے مذکورہ ہر دو حضرات میرے ہمراہ کاندھلہ بذریعہ بس روانہ ہوئے۔ نو بجے دن کے کاندھلہ پہنچے۔ اور محلہ دودھیان میں جناب قاضی نثار صاحب اور قاضی مسعود صاحب کے گھر پر گئے۔ ناشتہ کرنے کے بعد محلہ مولویان میں پہنچے۔ وہاں مولانا احتشام الحسن صاحب مولٰنا مصباح الحسن صاحب اور مولوی فرید الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے کے بعد آمد کا مقصد بتایا تو مولوی فرید الحسن صاحب ہم تینوں کے ہمراہ کیرانہ کی جامع مسجد پر بذریعہ رکھشا پہنچے وہاں جامع مسجد کے دروازہ اس کی سیڑھیوں اور اس کے سامنے کے اس میدان کا فوٹو لیا جہاں مجاہدین کو جمع کیا جاتا تھا اور سیڑھیوں پر نقارہ بجتا تھا کہ "ملک خدا کا، حکم مولوی رحمت اللہ کا" یہ میدان کیرانے کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، یہاں سے مجاہدین کی جماعتیں شاملی اور دہلی کے معرکوں میں جاتی تھیں جنکو حضرت مولانا خود رخصت کرتے تھے۔

اس کے بعد دربار دروازے پہنچے اس دروازہ کا فوٹو لیا۔ یہ دروازہ عہد جہانگیری میں نواب مقرب خانصاحب کا تعمیر کردہ ہے۔ جہاں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کا خاندان آباد تھا۔ نواب مقرب خانصاحب کی تفریح گاہ جس کے سامنے تالاب ہے اُسکا فوٹو لیا اور محلہ نواب دروازہ جہاں نواب مقرب خاں اور اُن کے بھائی کی عدالتیں اور کچہریاں تھیں اس کا فوٹو لینے کے بعد، حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے پیدائشی مکان، دربار کی مسجد جس میں مولانا رحمت اللہ صاحب نے ابتداء میں درس دیا تھا اور اسی مسجد کے حجرہ میں جنگ آزادی کے ایام میں پوشیدہ ہوئے تھے کے فوٹو لئے اور مولانا صاحب کے خاندانی قبرستان میں پہنچکر اس قبرستان کا فوٹو لیا جس میں مولانا محمد سعید صاحب کا بھی مزار ہے۔

کیرانہ سے فارغ ہونے کے بعد پنجیٹھ گاؤں پہنچے۔ وہاں مولانا کے رفیقِ جہاد چودھری عظیم گوجر کی قبر کا فوٹو لیا۔ اور چودھری صاحب کی تعمیر کردہ مسجد تھی اس کا اور چودھری صاحب کے خاندان کے ایک معمّر راجا صاحب کا بھی فوٹو اتارا۔

جب ہم لوگ کاندھلہ پہنچے تو خیال تھا کہ ان دونوں مقامات کے فوٹو ہم ایک روز میں کھینچ نہیں سکیں گے بلکہ دوسرا روز بھی لگیگا۔ لیکن حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کا روحانی فیض تھا کہ ہم دونوں مقامات سے شام کے پانچ بجے سے پہلے پانچ چھ گھنٹے میں فارغ ہو گئے ..... اور مغرب کی نماز ہم نے کیرانہ جاکر پڑھی۔ اور بعد نماز عشا ہم دہلی کیلئے روانہ ہوئے۔ اور تقریباً گیارہ بجے رات کو دہلی پہنچ گئے "آثار رحمت" کے طبع ہونے کے بعد اہم کام بلاک بنانے اور ان کے چھاپنے کا تھا۔ اس کی ذمہ داری جناب سعید خاں صاحب نے لی۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بڑے خلوص اور توجہ کے ساتھ یہ دونوں کام انجام دئے۔

میں نے ابتک اپنی جتنی کتابیں چھاپی ہیں میں نے ان کی تصحیح خود ہی کی ہے اور کسی دوسرے کو تصحیح کا کام نہیں سونپا لیکن "آثار رحمت" کی تصحیح کے لئے میں نے جناب تنویر علوی کیرانوی پروفیسر دہلی کالج سے درخواست کی جس کو انہوں نے بخوشی قبول کیا اور اپنے ضروری کام چھوڑ کر اور اپنا قیمتی وقت دیکر اس کی تصحیح کی جو کتاب کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ خدا کرے یہ کتاب کتابی غلطیوں سے مبرا ہو۔ اور اس میں کوئی کتابی غلطی نہ رہی ہو۔

میری کتابوں میں جان ڈالنے والے اور میرے پرانے کرم فرما جناب فیروز آرٹسٹ صاحب کا میں بیحد ممنون ہوں جنہوں نے "آثار رحمت" کے ٹائٹل کا بھی بامعنی اور موزوں ڈیزائن بنایا۔

یہ اخلاقی اور علمی کوتاہی نہیں بلکہ احسان فراموشی ہوگی کہ میں جناب

مولانا عثمان فارقلیط صاحب ایڈیٹر اخبار الجمعیۃ دہلی اور جناب مولانا افتخار الحسن صاحب کاندھلوی کی اعانت کا ذکر نہ کروں۔

جناب مولانا عثمان فارقلیط صاحب نے مجھ کو ایک کتاب "اختتام دینی مباحثہ" مصنفہ پادری فانڈر عنایت فرمائی جس سے میں نے "آثار رحمت" کیلئے استفادہ کیا۔ اور اسی طرح جناب مولانا افتخار الحسن صاحب سے میں نے ازالۃ الشکوک کی جلد اوّل حاصل کی جس سے مجھکو "آثار رحمت" مرتب کرنے میں کافی مدد ملی۔

"آثار رحمت" کی طباعت میں جو جاذبیت اور دلکشی پائی جاتی ہے اس کا سہرہ جناب ذکی احمد صاحب مالک یونین پریس دہلی کے سر ہے۔ انہوں نے بڑی توجہ کے ساتھ اس کتاب کی چھپائی کرائی۔

میں نے اپنی کسی تصنیف وتالیف کے بارےمیں کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔ کہ میری کتاب غلطیوں سے بالکل مبرا ہے اور اس میں کوئی غلطی نہیں ہو گی۔ انسان خطاؤں کا مرکب ہے۔ جس میں میں بھی شامل ہوں۔ اس لئے جن صاحب کو اس کتاب میں جو غلطی [illegible] وہ اس سے مجھکو مطلع فرماویں۔ میں ان کا بیحد ممنون ہوں گا۔ اور اگر اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ تو اسمیں اس غلطی کی تصحیح کر دیجاتے گی۔

کتاب مرتب کرنے میں جو کاوش اٹھانی پڑتی ہے وہ اپنی جگہ پر علیحدہ ہے۔ لیکن اس کی طباعت وغیرہ کا بار اٹھانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ چنانچہ "آثار رحمت" کی تالیف کے بعد یہ دوسرا مسئلہ سامنے آیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ حضرت مولانا عبدالباری صاحب سے جب اس بات کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے فرمایا حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے اب بھی ایسے معتقد ہیں

جواس کام میں مدد کریں گے اور چھپائی وغیرہ کا بار اٹھالیں گے۔ چنانچہ مولانا عبدالباری صاحب کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔ اور الحمدللہ علیٰ احسانہٗ "آثارِ رحمت" چھپ گئی۔

امداد صابری

محلہ چوڑیوالان۔ دہلی

۱۲ر نومبر ۱۹۶۷ء

"آثارِ رحمت" کی فہرست مضامین